آشرم سے اُس بازار تک
تفتیش اور سراغ رسانی کی پانچ حقیقی کہانیاں
احمد یار خان

فہرست

پیش لفظ

محترم احمد یار خان کی تفتیشی کہانیوں کا تئیسواں مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔
اس مجموعے میں قتل کی چار وارداتوں کی تفتیش اور سراغ رسانی اس وقت کی ہے جب محترم احمد یار خان دِلی میں سی آئی اے میں ہوتے تھے۔ انہوں نے سکاٹ لینڈ یارڈ کے تربیت یافتہ انگریز پولیس انسپکٹروں کے ساتھ سراغ رسانی کی ہے اور قتل کی ایسی وارداتوں کے ملزم پکڑے ہیں جنہیں BLIND MURDER کہا جاتا ہے یعنی ایسی وارداتیں جن کے ملزم کا سراغ لگانا بظاہر ناممکن ہوتا ہے۔
پانچویں کہانی — ”حویلی اور سوتیلی“ — زیورات کی چوری کی ایک واردات کی تفتیشی کہانی ہے۔ چوریاں ڈکیتیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں اور ان وارداتوں کا مقصد صرف لُوٹ مار ہوتا ہے لیکن یہ واردات انسانی فطرت اور نفسیات کا ایسا پہلو پیش کرتی ہے جو قاری کو حیرت میں ڈال دیتا ہے اور جذبات میں ایسی ہلچل بپا ہو جاتی ہے کہ دل میں اس واردات کے ملزم سے ہی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔
ایک تو اس واردات کی تفتیش ہی بڑی مشکل اور پیچیدہ تھی۔ یہ محترم احمد یار خان کا کمال تھا کہ انہوں نے چور پکڑ لیا لیکن انہوں نے ایک ایسا فیصلہ کیا جس کے لئے غیر معمولی جرأت کی ضرورت تھی۔ انگریزوں کے دَورِ حکومت میں جب قانون کو بالادستی حاصل تھی ایک ہندوستانی سب انسپکٹر ایسا جرأتمندانہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا لیکن اس تھانیدار نے اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے یہ فیصلہ کیا کہ سننے والے حیران رہ گئے۔

ایک خاص بات ذہن میں رکھیں۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں ہر تھانیدار احمد یار خان ہوا کرتا تھا۔ پولیس کو اس دائرے سے باہر نہیں آنے دیا جاتا تھا جو اس کے فرائض کا دائرہ تھا۔ انگریز اپنے بنائے ہوئے قانون کا پورا پورا احترام کرتا تھا اور پولیس

کا یہ فرض تھا کہ اس قانون کے خلاف کوئی حرکت کرنے والے کے خلاف قانون کو حرکت میں لائے اور یہ نہ دیکھے کہ قانون شکن کی سوشل پوزیشن کیا ہے۔

مُک مُکا کا تصور ہی نہیں تھا۔ نظام ایسا تھا کہ تھانیدار من مانی کر ہی نہیں سکتے تھے۔ مظلوم کو پورا انصاف اور ظالم کو سزا ملتی تھی۔ چونکہ تفتیش اور سراغ رسانی شب و روز کی محنت اور دیانتداری سے ہوتی تھی اس لئے یہ کہانیاں جنم لیتی تھیں۔

موصوف مصنف ہمیں صرف وہ کہانیاں سناتے ہیں جن میں کوئی معاشرتی بُرائی ہوتی ہے اور یہ کہ بعض اوقات کسی کی ذرا سی غلطی کس طرح ایک بہت المئے اور حادثے کا باعث بن جاتی ہے۔

یہ کہانیاں آپ کسی بھی پہلو سے پڑھیں' اپنے بچوں کو پڑھائیں' یہ آپ کو ہر لحاظ سے مطمئن کریں گی۔ ذہنی تفریح بھی مہیا کریں گی اور سوچ بچار کے لئے مواد فراہم کریں گی۔

ہم آپ کی رائے اور تنقید کے منتظر رہیں گے۔

عنایت اللہ
مدیر "حکایت" لاہور

عجیب لڑکی

جرم و سزا کا یہ کیس بھی اُنہی دنوں کا ہے جب میں دلّی میں سی آئی اے میں تھا۔ میری بد بختی یہ تھی کہ میں انگریزی بولتا اور سمجھتا تھا۔ دوسری بد بختی یہ کہ مجھے دل دھیان سے کام کرنے کا خبط تھا' اور مجھ میں ایک یہ دماغی خرابی بھی تھی کہ میں رشوت اور سفارش کو قبول نہیں کرتا تھا۔ اس میں خدا کا ڈر بھی شامل تھا انگریزوں کا ڈر بھی۔

انگریزوں کے دَورِ حکومت میں رشوت خوری کا امکان کم ہی ہوتا تھا' پھر بھی چھوٹے چھوٹے کیسوں میں رشوت خور ہاتھ مار لیتے تھے۔ ڈکیتی اور قتل جیسی وارداتوں میں کوئی تھانیدار من مانی نہیں کر سکتا تھا۔ جنگِ عظیم کے وسط میں آکر پولیس کے لئے رشوت کے کچھ دروازے کھل گئے تھے۔ جنگ نے ہندوستانی سوسائٹی میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ شہروں اور قصبوں سے پسماندگی رخصت ہوئی اور ماڈرن ازم آگئی تھی۔ ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں میں سیاسی بیداری جنگِ عظیم نے ہی پیدا کی تھی۔ اُس دَور میں جرائم میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ بڑے شہروں کی ماڈرن سوسائٹی میں بھی ترقی یافتہ ممالک جیسے جرائم شروع ہو گئے تھے۔ یہ تفتیشی کہانی جو سنانے لگا ہوں' ایسی ہی ایک واردات کی تفصیل ہے۔

یہ نئی دلّی کی واردات ہے۔ نئی دلی ہندوستان کا دارالحکومت تھا۔ وائسرائے وہیں رہتا تھا۔ مسلح افواج کے ہیڈ کوارٹر وہیں تھے۔ امریکی فوج کا عارضی ہیڈ کوارٹر بھی وہیں تھا۔ نئی دلّی کی رونق سو فیصد بڑھ گئی تھی۔ اُس دَور کی میں آپ کو کچھ کہانیاں سنا چکا ہوں۔ ان میں ایک "ڈینٹل' ڈیزی اور ڈسپنسر" بھی ہے۔ اب ایک اور کہانی پیش کرتا ہوں جو نئی دلّی کی ماڈرن ہندو سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہے۔

میں نے بتایا ہے کہ میں اُن دنوں سی آئی اے میں تھا۔ میرے ساتھ ایک انگریز انسپکٹر ٹینیسن تھا۔ ہم دونوں کو قتل کا ایک کیس دیا گیا۔ چودہ پندرہ دن پہلے ایک جواں سال ہندو ریوالور کی گولیوں سے قتل ہو گیا تھا۔ اس خاندان میں کالجوں کی تعلیم بھی تھی

اور ٹھیکیداری کی دولت بھی۔ یہ اس سطح کا خاندان تھا جس کے ہاں سول اور فوج کے افسروں کی ٹی پارٹیاں اور ڈنر وغیرہ ہوتے تھے اور اس خاندان کی جوان عورتیں انگریز افسروں کے ساتھ فری ہوتی تھیں اور فری ہونے والی عورتوں کو مدعو بھی کیا جاتا تھا۔

ہندو کا عام طور پر تصوّر یہ ہے کہ یہ تجارت پیشہ قوم ہے۔ پیسہ اس کا دیوتا اور دھرم ہے۔ ہندو تنگ نظر اور فریب کار ہے' فطری طور پر بنیا اور کنجوس ہے.... ہندو کا صحیح تصوّر یہی ہے لیکن جنگ عظیم میں مختلف ٹھیکیداریاں عام ہوگئیں تو روپے پیسے کی فراوانی ہوگئی۔ ہندوؤں کی ایک کلاس اُبھری جس نے فوجی ہیڈ کوارٹروں سے ٹھیکے لینے کے لئے مخصوص ہندو آنہ گھٹن اور تنگ نظری ترک کر دی اور اپنے آپ کو ماڈرن بنا لیا۔ یہ لوگ گوشت بھی کھاتے اور شراب بھی پیتے تھے۔

وہ ہندو جو قتل ہوگیا تھا وہ اسی ماڈرن ہندو کلاس کے ایک ٹھیکیدار کا بیٹا تھا۔ اس قتل کی تفتیش اسی وجہ سے سی آئی اے کو دی گئی تھی کہ مقتول کا میل جول بڑے افسروں سے تھا۔ اس نے کہا تھا کہ علاقہ تھانیدار دو ہفتے گزر جانے کے باوجود قتل کا سراغ نہیں لگا سکا۔

سی آئی اے کے اختیارات لامحدود ہوتے تھے اور اس برانچ میں انگریز افسر بھی تھے جن سے کوتاہی اور بددیانتی کی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی۔

میں اور انسپکٹر ٹینیسن متعلقہ تھانے میں گئے اور فائل دیکھی۔ قتل کی اور مقتول کی جو تفصیلات ملیں' وہ اس طرح تھیں کہ دو ہفتے پہلے رات گیارہ بجے کے لگ بھگ مقتول واپس گھر آیا۔ وہ ٹیکسی پر آیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور سکھ تھا جس کا بیان یہ تھا کہ مقتول ریلوے سٹیشن سے اس کی ٹیکسی میں بیٹھا۔ اپنی کوٹھی کے سامنے اس نے ٹیکسی رکوائی اور ٹیکسی سے اُتر کر اس نے پیسے دیئے' پھر کوٹھی کے گیٹ کی طرف گیا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی چلائی اور وہ ٹیکسی اُدھر ہی کو موڑنے لگا جدھر سے آیا تھا کہ پیچھے سے ایک موٹر سائیکل آیا۔ سکھ نے گاڑی روک لی کہ موٹر سائیکل گزر جائے لیکن موٹر سائیکل سامنے سے گزرنے کی بجائے گاڑی کے پیچھے سے گزرنے لگا۔ سکھ اُسے دیکھ رہا تھا۔ موٹر سائیکل آہستہ ہوگیا۔ مقتول ابھی گیٹ تک پہنچا ہی تھا کہ موٹر سائیکل والے نے ریوالور سے دو فائر کئے اور یکلخت موٹر سائیکل تیز کر دی۔

سکھ تیزی سے گاڑی سے نکلا۔ مقتول گر پڑا تھا اور موٹر سائیکل بہت ہی تیز

رفتاری سے غائب ہوگیا تھا۔ سکھ نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ موٹر سائیکل والا رک کر مقتول پر چھُری چاقو سے حملہ کرتا اور موٹر سائیکل پر سوار ہو کر بھاگتا تو وہ ٹیکسی میں اُس کا تعاقب کرتا لیکن قاتل کے پاس ریوالور تھا اس لئے اس نے تعاقب کی جرأت نہ کی۔ اس نے گیٹ کے اندر جاکر آوازیں دیں تو گھر والے باہر آئے۔ سکھ نے انہیں بتایا کہ یہ واردات ہوگئی ہے۔ تھانے رپورٹ ہوئی۔ سکھ وہیں موجود رہا۔

علاقہ تھانیدار آیا تو اس نے پہلا شبہ سکھ پر ہی کیا جو اس بنا پر غلط ثابت ہُوا کہ سکھ نے ہی کوٹھی میں جاکر واردات کی اطلاع دی تھی۔ دوسری بات یہ کہ مقتول کی جیب میں اس کا بٹوہ موجود تھا جس میں بہت سی رقم تھی۔ اس کی کلائی میں گھڑی اور انگلیوں میں سونے کی دو انگوٹھیاں تھیں۔ سکھ اسے قتل کرتا تو اس کا مقصد مقتول کو لُوٹنا ہی ہو سکتا تھا۔ سکھ نے اسے لُوٹا نہیں تھا اور اس کے پاس ریوالور بھی نہیں تھا۔ سکھ تو موقعہ کا گواہ تھا۔

قتل کی واردات جس کوٹھی میں ہوئی وہاں آبادی گنجان نہیں تھی۔ شہر سے پالم ایئرپورٹ کی طرف سڑک جاتی تھی۔ اُس وقت ایئرپورٹ پر آج والی ہوائی جہازوں کی آمدورفت نہیں تھی اس لئے یہ سڑک شام کے بعد ویران اور سنسان ہو جاتی تھی۔ زیادہ علاقہ خالی پڑا تھا۔ آج تو وہاں ایک انچ جگہ بھی خالی نہیں ہوگی۔ رات کو سڑک کے ویران ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پرائیویٹ کاریں بہت ہی کم تھیں۔ موٹر سائیکل نہ ہونے کے برابر تھے۔

اُس وقت ٹھیکیداریوں کی دولت سے چند ایک ہندوؤں نے پرانی دِلّی کے قدیم مکانوں سے نکل کر اس علاقے میں کوٹھیاں بنالی تھیں۔ ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔

سکھ ٹیکسی ڈرائیور نے موٹر سائیکل سوار کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ موٹر سائیکل فوجی تھا۔ اُس وقت پرائیویٹ موٹر سائیکل بھی خاصے بڑے ہُوا کرتے تھے اور انجن کی طاقت آج کی طرح سی سی کے حساب سے نہیں بلکہ ہارس پاور کے حساب سے ہوتی تھی۔ عام طور پر پانچ ہارس پاور کا موٹر سائیکل ہوتا تھا لیکن فوجی موٹر سائیکل اس سے بھی بڑے ہوتے تھے۔

موٹر سائیکل سوار نے پتلون پہن رکھی تھی۔ قمیض پر جیکٹ تھی یا کوٹ۔ وہ پالم ایئرپورٹ کی طرف سے آیا اور شہر کی طرف چلا گیا تھا۔

گولیاں اتنی قریب سے فائر ہوئی تھیں کہ جسم سے پار ہو گئیں اور گیٹ سے لگی تھیں جو لوہے کا تھا۔ تھانیدار نے رات کو گولیوں کے سکّے برآمد کر لئے تھے۔ ایکسپرٹ کی رپورٹ تھی کہ یہ 38 بور کے ریوالور سے فائر ہوئی ہیں۔ گولیوں کے خول وہاں نہیں تھے جو وہاں ہو بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ ریوالور کے سیلنڈر میں ہی چلے گئے تھے۔

ہم نے پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھی۔ ایک گولی دل کے قریب لگی اور کلیجے میں سے گزر گئی تھی اور دوسری ریڑھ کی ہڈی کو کاٹتی دونوں گُردوں کے درمیان سے گزری اور جسم کے پار ہو گئی۔ مقتول موقعہ پر ہی ہلاک ہو گیا تھا۔

دو پہلو ہمارے سامنے آئے۔ ایک یہ کہ رائفل اور بندوق کی گولیاں نشانے پر مارنا مشکل نہیں ہوتا کیونکہ ان کے بٹ کندھے کے ساتھ دبا کر انہیں دونوں ہاتھوں کی گرفت میں رکھا جاتا ہے لیکن ریوالور صرف ایک ہاتھ میں پکڑ کر فائر کیا جاتا ہے۔ کوئی اناڑی اس کا ٹریگر دباتا ہے تو اس کی نالی نیچے ہو جاتی ہے' لہٰذا گولی نشانے پر لگنے کی بجائے نیچے لگتی ہے۔

مقتول پر چلتی موٹر سائیکل سے فائر کیا گیا تھا اور گولیاں نشانے پر لگیں۔ اس سے یہ پہلو سامنے آیا کہ قاتل ریوالور کے فائر کا ماہر تھا۔ ماہر وہی ہو سکتا تھا جس کے پاس اپنا ریوالور تھا اور ریوالور فائر کرتا رہتا تھا۔ یہ کوئی اناڑی نہیں تھا۔

دوسرا پہلو اس واردات کا یہ تھا کہ ہندوؤں میں قتل کی وارداتیں اس طرح نہیں ہُوا کرتی تھیں جس طرح مسلمانوں کے ہاں ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ دیہات اور قصبوں میں دیرینہ عداوت کی بناء پر مسلمان قتل سے کم کوئی کارروائی نہیں کرتے۔ آج کل پاکستان کے شہروں میں اسلحہ اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ سرپھرے نوجوان شوقیہ قتل کرتے پھرتے ہیں۔ ہندوؤں میں یہ بات نہیں تھی۔ شہر کا ہر ہندو قتل کے نام سے ہی لرزتا تھا' پھر بھی کبھی' برسوں میں' ایک ہندو کسی ہندو کے ہاتھوں قتل ہو جاتا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ قاتل انتقام کے جذبے سے پاگل ہو گیا تھا۔

قتل کی اس واردات کی تفتیش میں مجھے پہلا خیال آیا کہ یہ انتقامی کارروائی ہوئی ہے۔ میرے اس خیال کو تقویت یوں ملی کہ مقتول لُوٹا نہیں گیا تھا۔ لہٰذا سب سے پہلے تو یہ دیکھنا تھا کہ قتل کا باعث کیا تھا۔

ابھی تو ہم تھانے میں بیٹھے فائل دیکھ رہے تھے اور تھانیدار سے معلومات لیتے جا رہے تھے۔ تھانیدار ہندو تھا۔ سب انسپکٹر رتن کمار۔ اس نے پندرہ دنوں کی تفتیش میں کوتاہی نہیں کی بلکہ بہت محنت کی تھی لیکن قتل کا باعث معلوم نہیں کر سکا تھا۔ اس نے مصدقہ طور پر معلوم کر لیا تھا کہ مقتول کی کسی کے ساتھ ذاتی یا خاندانی دشمنی نہیں تھی۔

تھانیدار سے ضروری معلومات یہ ملیں کہ مقتول کی شادی کو ابھی چار ہی مہینے ہوئے تھے۔

"آپ نے اس کی بیوی سے پوچھ گچھ کی ہو گی" ــــ میں نے سب انسپکٹر رتن کمار سے کہا۔

"یہ تو بہت ہی ضروری تھا" ــــ رتن کمار نے کہا ــــ "مقتول کے باپ سے ملنے کے بعد میں اس کی بیوی سے ملا تھا۔ بہت خوبصورت لڑکی ہے۔ وہ صرف اس لئے مظلوم نہیں کہ بیوہ ہو گئی ہے بلکہ اسے یہ غم کھا رہا ہے کہ اب اس کی دوسری شادی نہیں ہو گی"۔

قارئین شاید جانتے ہوں گے کہ ہندو لڑکی خواہ نوجوانی میں ہی بیوہ ہو جائے' اس کی دوسری شادی نہیں ہو سکتی۔ اسے منحوس سمجھا جاتا ہے۔ شادی کی پہلی رات ہی خاوند اچانک بیمار ہو کر مر جائے' اچانک حرکتِ قلب بند ہو جائے یا کسی اور وجہ سے مر جائے اور اس نے دلہن کے جسم کو ابھی ہاتھ بھی نہ لگایا ہو تو بھی کوئی اور خاندان اسے قبول نہیں کرتا۔ وہ اپنے والدین کے گھر چلی جاتی ہے۔ اسے زیورات سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اُسے چوڑیاں پہننے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس کے سر پر مَیلا اور پھٹا ہُوا دوپٹہ ڈال دیا جاتا ہے۔ اس کی سہیلیوں کو اس سے ملنے سے روک دیا جاتا ہے کیونکہ اس کے سائے کو منحوس سمجھا جاتا ہے۔

ہندوؤں میں تو ستی کی رسم ہوا کرتی تھی۔ بیوی کو اس کے خاوند کی لاش کے ساتھ چِتا پر بٹھا کر زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ مغلیہ خاندان کے دَورِ حکومت میں اس رسم پر پابندی عائد ہوئی لیکن دیہاتی علاقوں میں یہ ظالمانہ رسم جاری رہی۔ انگریزوں نے آ کر اس رسم پر بڑی سختی سے پابندی عائد کی اور ستی کا کوئی واقعہ ہو گیا تو لڑکی کو زندہ جلانے والے لواحقین کو قتل کے جرم میں سزا دی۔

بھارت کی موجودہ حکومت نے سُتی کو قتل کا جرم قرار دے رکھا ہے پھر بھی چند برس گزرے آپ نے سُتی کے ایک واقعہ کی خبر اخباروں میں پڑھی ہو گی۔ ایک جواں سال عورت کو اس کے خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ جلا دیا گیا تھا۔ اس کا فوٹو پاکستان کے بڑے اخباروں میں شائع ہُوا تھا۔ جلانے والوں کو قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔

آپ کی دلچسپی کے لئے لکھتا ہوں کہ ایک طرف قتل کے جرم میں گرفتاریاں ہوئیں اور دوسری طرف ہندوؤں کی توہم پرستی اور باطل پرستی کا یہ عالم کہ دُور دُور سے ہندو جوق در جوق اُس جگہ آ کر ماتھے ٹیکنے لگے جہاں اس عورت کو جلایا گیا تھا۔ وہ اس مظلوم عورت کو دیوی اور معبود سمجھتے ہیں جس نے اپنے مرے ہوئے خاوند کے ساتھ اپنے آپ کو زندہ جلا دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ہندو جن میں عورتیں زیادہ ہوتی ہیں' وہاں جا کر پھول چڑھاتے اور کھانے پینے کی مختلف اشیاء رکھتے اور وہاں سجدہ کرتے ہیں۔

ہندو ماڈرن تو ہو گئے ہیں لیکن بیوہ کو وہ منحوس سمجھتے ہیں اور اس کی دوسری شادی نہیں کرتے۔ اگر بیوہ کے والدین اس کی شادی کرنا چاہیں تو بھی اسے کوئی قبول نہیں کرتا۔ ایسی جواں سال ہندو بیوہ عورتوں کی زندگی جس طرح گزرتی ہے' وہ ذرا لمبی بات ہے۔ یہ ایک باطل مذہب کی بدی کی داستان ہے جس کا شکار یہ جوان بیوگان ہوتی ہیں اور آشرموں میں پنڈتوں کی ہوس کاری کے جال میں بوڑھی ہو جاتی ہیں۔

اب ایک نوجوان ہندو بیوہ میرے سامنے آ رہی تھی۔ میں نے کہا ہے کہ قتل کی اس واردات سے تعلق رکھنے والے ہندو خاندان ماڈرن تھے۔ گوشت بھی کھاتے اور شراب بھی پیتے تھے لیکن اپنی بیوہ بہو بیٹیوں کے لئے وہ قدامت پسند اور دقیانوسی تھے۔

میں اپنے قارئین سے بھائی صابر حسین راجپوت کی طرح معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ بڑھاپے میں سب سے بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ بوڑھا آدمی بات سے بات نکالتا چلا جاتا اور اصل بات سے دُور چلا جاتا ہے۔ واردات قتل کی سنانے لگا تھا اور قصہ چھیڑ بیٹھا جوان ہندو بیوگان کا۔ مشکل یہ ہے کہ زندگی میں اتنے واقعات' حادثات اور ایسے رنگا رنگ تماشے دیکھے ہیں کہ ایک کی بات کرو تو بیسیوں یاد آ جاتے ہیں۔ ہندو بیوگان کی تو بہت سی کہانیاں میری ڈائریوں میں اور میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ زندگی نے وفا کی تو سناؤں گا۔

میں سنا رہا تھا کہ میں اور انسپکٹر ٹینیسن علاقہ تھانیدار کی فائل پڑھ رہے تھے اور ساتھ ساتھ اس سے تفصیلات بھی پوچھتے جا رہے تھے۔ بجائے اس کے کہ پہلے اس کی بتائی ہوئی تفصیلات سناؤں پھر اپنی تفتیش کی بات کروں میں سیدھے طریقے سے آپ کو کہانی سنا دیتا ہوں۔

بہنوں کا کردار مشکوک

تفتیش تو ہم نے اپنے انداز سے کرنی تھی۔ سب انسپکٹر رتن کمار سے ہم نے راہنمائی لے لی اور اسے کہا تھا کہ اپنے مخبروں کو ہمارے حوالے کر دے۔

یہ تو بتا چکا ہوں کہ مقتول کا باپ ٹھیکیدار تھا۔ مقتول باپ کے ساتھ کام کرتا تھا۔ ان کی ٹھیکیداری وسیع پیمانے کی تھی۔ زیادہ تر ٹھیکے تعمیراتی ہوتے تھے۔ اُن دنوں دِلّی سے پندرہ سولہ میل دُور ان کے پاس ایک فوجی تعمیر کا خاصا بڑا ٹھیکہ تھا۔ مقتول جس کا نام مہندر پال تھا' اُس جگہ چلا جاتا تھا اور رات کی ریل گاڑی سے واپس آتا تھا۔ ہفتے میں دو راتیں ایسی آتی تھیں جو اسے باہر ہی گذارنی پڑتی تھیں۔

قتل کے وقت اُس کی عمر چھبیس سال اور کچھ مہینے تھی۔ وہ حسب معمول قتل کی رات ریل گاڑی سے آیا تھا اور اپنی کوٹھی کے گیٹ پر قتل ہو گیا۔ وہ اس کوٹھی میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ شادی ہوئی تو پندرہ بیس دنوں بعد ماں باپ سے الگ ہو گیا اور اپنی بیوی کے ساتھ ایک فلیٹ میں کرائے پر رہنے لگا۔ یہ دو منزلہ فلیٹ تھے۔ میں نے مقتول کی رہائش تفتیش کے دوران دیکھی تھی۔ اس فلیٹ میں اپر کلاس کے لوگ رہتے تھے۔ یہ عمارت نئی نئی بنی تھی۔

اُس روز وہ اپنے ٹھیکے پر جانے لگا تو بیوی نے اسے کہا کہ آج دن کوٹھی میں گذارنا چاہتی ہے اور رات کو وہ اِدھر ہی آ جائے اور اسے اپنے گھر لیتا جائے۔ یہ وجہ تھی کہ وہ رات اپنے ماں باپ کے گھر گیا تھا۔

ہمیں یہ باتیں مقتول کا باپ بتا رہا تھا۔ میں اور انسپکٹر ٹینیسن اس کی کوٹھی میں جا بیٹھے۔ ہم نے تفتیش کا آغاز اسی سے کیا تھا۔ ہمارے کہنے پر اس نے ہمیں گیٹ کے

سامنے وہ جگہ دکھائی تھی جہاں اس کے بیٹے کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ ہم نے اس سے دشمنی کے متعلق پوچھا۔ اس نے وثوق سے کہا کہ نہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی ہے نہ اس کے بیٹے کا کوئی دشمن تھا۔

"کاروباری دشمنی بھی ہوتی ہے"— میں نے کہا— "اس ٹھیکے کا ٹینڈر کسی اور کا منظور ہونا چاہئے تھا لیکن آپ نے اثر و رسوخ سے یا دے دلا کر اپنا ٹینڈر منظور کرا لیا"۔

"ایسی بھی کوئی دشمنی نہیں"— مقتول کے باپ نے جواب دیا— "آپ اس طرف دھیان نہ دیں۔ میں غور کر چکا ہوں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ ہم کاروباری لوگ ہیں۔ کاروبار میں رقابتیں ہوتی ہیں۔ کمپیٹیشن ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کو قتل نہیں کیا جاتا۔ میرے بیٹے کے قتل کی وجہ کوئی اور ہے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ میرے بیٹے کے قتل کے جرم میں اگر ایک درجن آدمیوں کو پھانسی دے دی گئی تو میرا بیٹا زندہ نہیں ہو جائے گا۔ مجھے ڈر یہ ہے کہ قتل کی وجہ معلوم نہ ہوئی اور قاتل نہ پکڑا گیا تو میرا بڑا بیٹا بھی ہے، میں ہوں، ہم بھی قتل ہو سکتے ہیں"۔

"ہو سکتا ہے یہ وجہ آپ کے گھر میں ہو"— میں نے کہا— "مثلاً آپ کی بہو ہے.... کیا آپ نے اس پر بھی غور کیا ہے؟"

"کیا ہے"— اس نے جواب دیا— "کوئی ہندو لڑکی اپنے خاوند کو قتل نہیں کراتی کیونکہ ہندو لڑکی بیوہ ہو جائے تو اسے ساری عمر بیوگی میں گذارنی پڑتی ہے"۔

"میں ایک بات واضح طور پر آپ سے کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں"— میں نے کہا— "ہم قاتل کا سراغ لگا رہے ہیں۔ ہمیں آپ سے کچھ ایسی باتیں پوچھنی پڑیں گی کہ آپ اپنی بے عزتی محسوس کریں گے۔ ہم آپ کی بے عزتی نہیں کرنا چاہتے۔ یہ ہماری ضرورت ہے"۔

"بلکہ یہ آپ کی ضرورت ہے"— انسپکٹر ٹینیسن نے کہا— "کسی بات پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کرنا"۔

"آپ مجھے پسماندہ آدمی نہ سمجھیں"— اس نے مسکراتے ہوئے کہا— "میں انگریز اور اینگلو انڈین افسروں کی سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے والا آدمی ہوں۔ میرے گھر کی کسی بھی لڑکی کے متعلق کچھ پوچھنا ہے تو بے تکلفی سے پوچھیں"۔

"آپ نے کہا ہے کہ کوئی ہندو لڑکی اپنے خاوند کو قتل نہیں کرائے گی"— میں نے کہا— "کیونکہ اسے ساری عمر بیوہ رہنا پڑے گا۔ میں آپ کو ایسی تین وارداتیں سنا سکتا ہوں کہ ہندو لڑکی نے اپنے خاوند کو قتل کروایا اور مسلمان آشنا کے ساتھ بھاگ کر مسلمان ہو گئی اور اس کے ساتھ شادی کر لی۔ ایک نے اپنے خاوند کو زہر دیا تھا اور دو نے اپنے خاوندوں کو دوسرے طریقوں سے مروایا تھا"۔

"آپ میری بہو کے متعلق جاننا چاہتے ہیں"— اس نے کہا— "اسے بھی ذہن سے اتار دیں۔ یہ لڑکی زندہ دل ہے۔ بڑی کھلی طبیعت والی ہے۔ میرے بیٹے کے ساتھ اسے دلی محبت تھی جو بیویوں کو اپنے خاوندوں سے ہوتی ہے"۔

"یہ بھی ذہن سے اتار دیں"— انسپکٹر ٹینیسن بول پڑا— "وہ بھی ذہن سے اتار دیں۔ اب آپ کہیں گے کہ یہ بھی ذہن سے اتا دیں کہ آپ کا بیٹا اخلاقی لحاظ سے ٹھیک نہیں تھا۔ آپ کہیں گے کہ وہ تو بڑا ہی شریف لڑکا تھا۔ تارک الدنیا تھا۔ دیکھو مسٹر! آپ کہیں تو ہم آپ کے بیٹے کے قتل کو بھی ذہن سے اتار دیں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ کیس آپ کے اثر و رسوخ سے ہمارے پاس آیا ہے۔ آپ ہمیں کوئی گائیڈ لائن دیں گے تو ہم آگے بڑھیں گے.... آپ کا بیٹا کیریکٹر کے لحاظ سے کیسا تھا؟"

"میں آپ کو بالکل صحیح بات بتاتا ہوں"— مقتول کے باپ نے جس کا نام جوگندر پال تھا، کہا— "وہ صرف کاروباری معاملات میں تیز اور بیدار تھا۔ سوشل طور طریقوں میں وہ ٹھیک نہیں تھا۔ یوں کہیں کہ اس میں زندہ دلی نہیں تھی۔ اس کی کمی اس کا بڑا بھائی پوری کرتا تھا۔ مہندر (مقتول) کو ہم کاروباری کاموں میں ہی لگائے رکھتے تھے اور وہ خوش رہتا تھا۔ اس کی حالت یہ تھی کہ راج مزدور کام کر رہے ہیں تو یہ ان کے سر پر سوار ہے۔ لکڑی کے کام کے لئے کیل منگواتا تو ایک ایک کیل گن کر کام کرنے والوں کو دیتا اور پورا حساب رکھتا تھا۔ بچت تو اسی طرح ہوتی ہے"۔

"اپنی بیوی کے ساتھ بھی ایسا ہی کاروباری رویّہ رکھتا ہو گا"— انسپکٹر ٹینیسن نے کہا۔

"میاں بیوی شادی کے فوراً بعد ہم سے الگ ہو گئے تھے"— جوگندر پال نے کہا— "میں ان کی پرائیویٹ لائف کے متعلق صحیح رائے نہیں دے سکتا"۔

"بیوی زندہ دل اور سمارٹ"— میں نے کہا— "خاوند گھٹی ہوئی طبیعت کا

کاروباری آدمی!"

میں نے یہ بات ایسے کہی جیسے کوئی اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے۔ ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ میں انگیٹھی پر رکھی ہوئی دو تصویروں کو بار بار دیکھتا تھا۔ ایک انگیٹھی کے ایک سرے پر اور دوسری دوسرے سرے پر رکھی ہوئی تھی۔ دونوں فریم میں تھیں اور دونوں نئے شادی شدہ جوڑوں کی تھیں۔ جوگندرپال کے دو ہی بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک مقتول کی تھی۔ تصویریں بڑے خوبصورت سنہری فریموں میں لگی ہوئی تھیں۔

"ان میں مہندرپال کا فوٹو کون سا ہے؟"—میں نے پوچھا۔

مقتول کا باپ اٹھا اور ایک فوٹو اٹھا کر مجھے دے دیا۔ لڑکی کی شکل وصورت تو بہت ہی اچھی تھی لیکن اس کا قد کاٹھ ایسی موزوں حد تک لمبوترا تھا کہ میں نے دل ہی دل میں اس کی تعریف کی۔ کمر پتلی اور گردن لمبوتری تھی۔ تصویر میں دل موہ لینے والی ایک اور چیز تھی۔ یہ اس کے ہونٹوں کا تبسم تھا۔ اس کی تو آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ یہ پورے جسم کی تصویر تھی جو شادی سے اگلے روز سٹوڈیو میں اتروائی گئی تھی، یعنی دُلہا دلہن کھڑے تھے۔

میں نے دلہن کا جسمانی حسن بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ دلہا کھڑا تھا۔ دلہا کے کپڑے اچھے تھے۔ باقی جو کچھ تھا وہ یوں تھا کہ جتنا حسین جسم دلہن کا تھا، اس سے زیادہ بھدا جسم دلہا کا تھا۔ اسی عمر میں اس کا پیٹ لٹک آیا تھا۔ اس کا قد دلہن سے چار پانچ انچ کم تھا۔ گردن تو اس شخص کی تھی ہی نہیں۔ جہاں گردن ہونی چاہئے تھی وہاں گوشت اور چربی کی افراط تھی۔ یوں کہہ لیں کہ ایک روایتی دکاندار نے بڑا قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا۔

میں نے فوٹو انسپکٹر ٹینیسن کو دے دی اور میں اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ ٹینیسن کے ہونٹوں پر طنزیہ سا تبسم آگیا۔ معلوم نہیں یہ میری چھٹی حِس تھی یا مجھ میں پلسیوں والی ایک رگ فالتو تھی کہ میرے ذہن میں یہی ایک شبہ جم کے رہ گیا کہ اس شخص کے قتل کا باعث یہ لڑکی ہے۔ قتل اس نے کروایا ہے یا قتل کے ساتھ اس کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے، لیکن ہم نے اور امکانات بھی دیکھنے تھے۔

علاقہ تھانیدار سب انسپکٹر رتن کمار نے اس خاندان کے متعلق وہ تمام معلومات پہلے ہی اکٹھی کرلی تھیں جو تفتیش کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اس نے بتایا تھا کہ ان دو بھائیوں کی بیویاں اور ان بھائیوں کی دو بہنیں بھی ہیں۔ ایک کی عمر پندرہ سولہ سال اور دوسری کی اُنیس بیس سال ہے۔ خاص طور پر خوبصورت تو نہیں لیکن ان کے رنگ گورے ہیں اور نقش بُرے بھی نہیں۔ اُن کی خوشیاں مشہور ہیں۔ دونوں چلبلی ہیں۔ چھوٹی سکول میں پڑھتی ہے اور بڑی فورتھ ایئر میں ہے۔

میں نے رتن کمار سے ان کے چال چلن کے متعلق پوچھا تھا۔ اس نے اپنے مخبروں کے حوالے سے بتایا تھا کہ یہ دونوں بہنیں کالج کے لڑکوں کو اپنے پیچھے لگانے کے فن کی ماہر ہیں۔ شیطان اتنی ہیں کہ ان سے لڑکے بھی گھبراتے ہیں۔

"کیا ایسا کبھی ہُوا ہے کہ ان کی ایسی کوئی حرکت یا بات ان کے گھر تک پہنچی ہو؟"—میں نے رتن کمار سے پوچھا تھا۔

"نہیں!"—رتن کمار نے جواب دیا تھا—"یہ تو میں نے گہرائی میں جاکر معلوم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ایسا کوئی واقعہ نہیں ہُوا۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس خاندان کی لڑکیوں کا کردار کچھ ایسا ویسا ہی ہے"۔

میں نے اور انسپکٹر ٹینیسن نے مقتول کے باپ کو باہر بھیج کر آپس میں تبادلۂ خیالات کیا اور مقتول کی بیوی سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ جوگندرپال کو اندر بلا کر کہا کہ اپنی بہو کو ہمارے پاس بھیج دے۔

"وہ یہاں تو نہیں"—اس نے جواب دیا—"مہندر کے قتل کے پانچویں روز یہاں سے چلی گئی تھی"۔

"اپنے ماں باپ کے گھر ملے گی؟"

"نہیں!"—اس نے جواب دیا—"اُسی فلیٹ میں رہتی ہے جس میں خاوند کے ساتھ رہتی تھی"۔

"کب تک وہاں رہے گی؟"

"وہ جانے اور فلیٹ والے جانیں"—اس نے کہا—"وہاں رہے گی تو کرایہ خود ہی دے گی یا اس کے ماں باپ دیں گے۔ ہمارے ساتھ تو اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لڑکی تو ٹھیک تھی لیکن منحوس نکلی۔ میری بیوی نے اسے خود ہی کہہ دیا تھا کہ وہ یہاں سے چلی

جائے"۔

"ایک بات بتائیں"— میں نے پوچھا— "ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس لڑکی کی بات کہیں اور پکّی ہو گئی تھی اور آپ نے یا آپ کے بیٹے مہندر نے لات ماری اور اُدھر سے طے شدہ رشتہ منسوخ کرا کے آپ لڑکی کو بیاہ لائے"۔

"اس لڑکی کے تین امیدوار تھے"— اس نے کہا— "یہ کوئی لڑائی جھگڑے والا معاملہ نہیں تھا۔ لڑکی کے ماں باپ نے دیکھنا تھا کہ زیادہ امیر کبیر کون ہے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے رشتہ ہمیں دے دیا"— ذرا سوچ کر اس نے کہا— "ہم ہندوؤں میں ایسے نہیں ہوتا کہ رشتے سے جواب مل گیا تو اس کے دشمن ہو گئے جسے یہ رشتہ ملا ہے۔ ہندو کاروباری قوم ہے جناب! ہم لوگ پیسے سے پیسہ کماتے ہیں۔ ہم اپنے قریبی رشتہ داروں کو پیسہ دیتے ہیں تو بھی اس کا سُود لیتے ہیں۔ ہم مقدمہ بازی میں روپیہ پیسہ برباد کرنے والی قوم نہیں"۔

اس کے بعد ہم نے مقتول کی ماں کو بلایا۔ وہ خاصی دیر لگا کر آئی۔ اس کی عمر پچاس برس سے اوپر ہی ہو گی' کم نہیں تھی۔ اس کے بیٹے کو قتل ہوئے ابھی دو ہفتے ہی ہوئے تھے لیکن وہ پورا میک اَپ کر کے اور نوجوان لڑکیوں جیسے کپڑے پہن کر آئی۔ وہ آخر ماں تھی۔ اپنے بیٹے کا نام سنتے ہی اُس نے رونا شروع کر دیا۔ اس زمانے میں ٹشو پیپر نہیں ہُوا کرتے تھے۔ اس عورت نے تین چار بار دوپٹے سے ناک اور آنسو پونچھے تو آنکھوں سے کاجل اور چہرے سے میک اَپ بھی صاف ہو گیا۔

ہمیں توقع تھی کہ کاجل اور سرخی پوڈر کی تہہ میں سے جو عورت برآمد ہوئی ہے' یہ اپنی بہو کے خلاف بولے گی اور اس بات پر تو اسے ضرور کوسے گی کہ وہ اس کے بیٹے کو چھین کر لے گئی اور الگ جا آباد ہوئی تھی لیکن اس عورت نے بہو پر کوئی الزام عائد نہ کیا سوائے اس کے کہ وہ منحوس تھی' میرے بیٹے کو کھا گئی ہے۔

میں نے اور انسپکٹر ٹینیسن نے اسے بہت کریدا اور اسے بہو کے خلاف مشتعل بھی کیا لیکن اس کے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکلی جو مقتول کی بیوی کے خلاف شبہ پیدا کرتی۔

مقتول کے ماں باپ نے ہمیں ذرا سا بھی اشارہ نہ دیا جس سے ظاہر ہوتا کہ قتل کا باعث یہ ہو سکتا یا فلاں شخص پر قتل کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ذہن میں جو ممکن

باعث آ سکتے تھے وہ جوگندر پال کے آگے رکھے لیکن اس نے قابلِ قبول دلائل دے کر ہمارے ہر شک کو صاف کر دیا۔

اس نے اتنی طویل گفتگو میں ہمیں بتایا تھا کہ مقتول جس کام پر جایا کرتا تھا وہ بہت بڑا تعمیراتی ٹھیکہ تھا۔ اس نے اپنے مقتول بیٹے کی تعریف کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس کام پر ایک سو سے زیادہ مزدور کام کرتے ہیں۔ راج اور ترکھان الگ ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ ان مزدوروں میں عورتیں بھی ہیں۔

"میرا بیٹا اس فوج کو بڑی عقلمندی سے کنٹرول میں رکھتا تھا"— جوگندر پال نے کہا تھا اور اس کے آنسو نکل آئے تھے۔

ہم جب مقتول کی ماں اور اس کے باپ سے مایوس ہو گئے تو اس کے باپ کی مجھے یہ بات یاد آئی کہ مقتول ایک سو سے زیادہ مزدوروں کو اپنے کنٹرول میں رکھتا تھا۔ میرے ذہن میں دو شکوک آئے۔ ایک یہ کہ مقتول نے کسی مزدور' راج یا ترکھان کو کام سے ہٹا دیا ہو گا اور اُس نے یہ انتقامی کارروائی کی ہو گی کہ اسے گولی مار دی یا مروا دی۔

مجھے یہ خیال بھی آیا کہ مزدور ایسی کارروائی نہیں کر سکتا۔ اگر وہ کرتا تو پیدل آتا اور چُھری یا چاقو سے قتل کرتا۔ غریب آدمی موٹر سائیکل کہاں سے لا سکتا تھا۔ یہ انتظام کوئی راج یا لکڑی کا کام کرنے والا کاریگر کر سکتا تھا۔ یہ لوگ اچھا خاصا پیسہ کما لیتے تھے۔

دوسرا شک اُن عورتوں کے متعلق تھا جو مزدوری کرتی تھیں۔ پاکستان میں مکان یا کسی عمارت کی تعمیر میں عورتیں مزدوری نہیں کرتیں جس طرح مرد کرتے ہیں۔ یہ رواج ہندوستان میں نہ جانے کس صدی سے چلا آ رہا ہے کہ مردوں کے ساتھ عورتیں بھی اینٹ گارا اُٹھانے کی مزدوری کرتی ہیں۔ یہ دیہات میں یا شہروں کے مضافات میں خانہ بدوشوں کی نسل جیسی ایک قوم خیموں میں رہتی ہے۔ یہ لوگ شہروں میں مزدوری کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔ کام مل جائے تو یہ لوگ اپنی عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کو بھی اپنے ساتھ کام میں لگا دیتے ہیں۔ ان میں بعض لڑکیاں بڑی اچھی شکل و صورت والی بھی ہوتی ہیں۔

لڑکی غائب کیوں نہیں ہوئی؟

میں پاکستان کی مثال دیتا ہوں۔ پاکستان میں اینٹوں کے بھٹوں پر پورا پورا گھرانہ کام کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھی کچّی پکّی اینٹیں اٹھاتے ہیں۔ بھٹوں کے اکثرو بیشترمالکان پورے پورے کنبے کو کچھ قرض دے کر کام لیتے رہتے ہیں۔ بعض لوگ کسی مجبوری کی وجہ سے ان مالکان سے کچھ رقم قرض لے لیتے ہیں جو وہ کبھی واپس نہیں کر سکتے۔ آج کل تو سنا ہے کہ یہ رواج ہوگیا ہے کہ کسی بھٹے پر نوکری کے لئے کوئی کنبہ جاتا ہے تو وہ قرض کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس قرض کا اسٹام لکھا جاتا اور مقروض کے انگوٹھے لگوا لئے جاتے ہیں۔ اَن پڑھ دیہاتی اسٹام اور انگوٹھے سے بہت ڈرتے ہیں۔ بھٹہ مالکان ان کے ساتھ من مانی کرتے ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں سے بھی اینٹیں اٹھواتے اور صبح سے شام تک کام لیتے ہیں۔ ان کی جوان عورتوں کو وہ اپنی ذاتی ملکیت بنا لیتے ہیں۔

"حکایت" شمارہ جون 1992ء کا ٹائٹل دیکھیں۔ اس پر چھوٹی سی ایک بچی کی تصویر ہے جس نے دو اینٹیں اٹھا رکھی ہیں۔ یہ امریکہ کے ایک مشہور ہفتہ وار پرچے "نیوز ویک" سے لیا ہُوا فوٹو ہے۔ اس امریکی پرچے نے پاکستان اور بھارت میں عورتوں اور بچوں سے مشقت لینے اور انہیں مختلف طریقوں سے اپنے غلام اور لونڈیاں بنا کر رکھنے کے متعلق ایک فیچر باتصویر شائع کیا تھا۔

یہ ظالمانہ سلسلہ کچھ عرصے سے پاکستان میں شروع ہُوا ہے۔ بھارت میں تو یہ ہمیشہ جاری رہا ہے۔ مردوں کے ساتھ عورتیں بھی مزدوری کرتی آ رہی ہیں۔

میں کہہ رہا تھا کہ میں نے جب سنا کہ مقتول ایک سو سے زیادہ مزدوروں کو کنٹرول میں رکھتا تھا تو میرا دماغ کسی اور طرف چلا گیا۔ میں نے جوگندر پال سے اس کی بہو کے فلیٹ کا ایڈریس نوٹ کیا اور ہم وہاں سے آ گئے۔ مجھے یاد ہے کہ شام کے چار بج رہے تھے۔ گاڑی میں انسپکٹر ٹینیسن کو میں نے اپنا شک بتایا۔

ایک شک تو یہ تھا کہ مقتول نے کسی کو نوکری یا مزدوری سے محروم کر دیا ہو گا

لیکن میں نے ٹینیسن کے ساتھ دوسرے شک پر زیادہ بات کی۔ میرا خیال یہ تھا کہ مقتول نے کسی مزدور لڑکی کے ساتھ دست درازی کی ہو گی اور لڑکی کے آدمیوں نے اس سے انتقام لیا۔

"نہیں مسٹر ملک!" — انسپکٹر ٹینیسن نے کہا — "جن لوگوں کی عورتیں بھی روٹی کی خاطر مزدوری کرتی ہیں وہ لوگ موٹر سائیکل اور ریوالور کہاں سے لے آئے ہوں گے؟.... اس کے علاوہ یہ بھی ذہن میں رکھو کہ مقتول اس کے باپ کے کہنے کے مطابق صرف کاروباری معاملات میں دلچسپی رکھتا تھا۔ ایسے آدمی بُزدل اور تنگ نظر ہُوا کرتے ہیں، عورتوں میں دلچسپی نہیں لیا کرتے"۔

"انسپکٹر ٹینیسن!" — میں نے کہا — "اگر تم ناراض نہ ہو جاؤ تو کہوں.... تمہارے پادری، ہمارے مولوی اور ہندوؤں کے مندروں کے پنڈت بھی عورتوں میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟.... ہم وہاں چلیں گے۔ اپنے ملک کے مقتول جیسے سیدھے سادے آدمیوں کو میں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں"۔

"مقتول کی بیوی سے ملنا زیادہ ضروری ہے" — ٹینیسن نے کہا اور کچھ سوچ کر بولا — "مسٹر ملک! میں کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ ہم قاتل کو جلدی پکڑ لیں گے حالانکہ ہمیں ابھی ذرا سا بھی کوئی اشارہ نہیں ملا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں تو اپنے خدا سے راہنمائی لیا کرتا ہوں" — میں نے کہا — "خدا نے میری ہمیشہ مدد کی ہے"۔

"تم مسلمان تو ہر بات میں خدا ہی خدا اور اللہ ہی اللہ کرتے رہتے ہو" — ٹینیسن نے کہا — "اور مجرم زمین کے نیچے چلے جاتے ہیں۔ میں اپنے دماغ سے راہنمائی لیا کرتا ہوں"۔

"لیکن انسپکٹر ٹینیسن!" میں نے کہا — "خدا صرف اُن کی راہنمائی کرتا ہے جن کے دلوں میں بھی خدا ہوتا ہے"۔

"اوہ!" — اس نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا — "تم تو کبھی کبھی مولوی بن جاتے ہو"۔

قتل کے اس کیس کے تھوڑا ہی عرصہ بعد ہم دونوں کو ایک عیسائی عورت کے قتل کا کیس دیا گیا تھا۔ اس میں ٹینیسن کے دماغ نے اس کی ایسی راہنمائی کی تھی کہ سزا

کے طور پر اس کی چار سال کے لئے ترقی رک گئی اور اسے واپس انگلینڈ بھیج دیا گیا تھا۔
مجھ پر اللہ نے یہ کرم کیا کہ مجھے ترقی دے کر سب انسپکٹر سے انسپکٹر بنا دیا گیا تھا۔ میں اس کہانی میں اس کیس کا پہلے بھی حوالہ دے چکا ہوں۔ اس کا عنوان —— "ڈیٹل' ڈیزی اور ڈسپنسر" —— ہے۔

ہم جب جوگندر پال کے گھر سے نکلے تھے اُس وقت شام کے ساڑھے چار بج چکے تھے۔ انسپکٹر ٹینیسن نے کہا کہ مقتول کی بیوی کے پاس ابھی چلتے ہیں۔ میں تو چاہتا ہی یہی تھا کہ کام ساتھ ساتھ ہوتا چلا جائے تو اچھا ہے۔ قتل کو پہلے ہی پندرہ سولہ دن گزر گئے تھے۔ اتنے عرصے میں شہادت کے بیشتر اور اہم حصوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ قاتل اگر واردات کے فوراً بعد یا دو تین دنوں میں پکڑا جائے تو اس سے اقبال جرم آسانی سے کرایا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ قتل کے ساتھ ہی قاتل پر ایسی ہیجانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس پر وہ قابو نہیں پا سکتا۔ انسان کا خون کوئی بڑے ہی مضبوط دل والا آدمی ہضم کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا خون کوئی انسان ہضم نہیں کر سکتا لیکن دو تین ہفتے گزر جائیں تو اس کا دل کچھ مضبوط ہو جاتا ہے۔

میں ذاتی طور پر یہی خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ قاتل زمین میں اُتر چکا ہو گا اور اگر وہ مل بھی گیا تو اسے قاتل ثابت کرنے کے لئے شہادت نہیں ملے گی۔ میں نے انسپکٹر ٹینیسن سے کہا کہ ہمیں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ وہ وہی کچھ سوچ رہا تھا جو میں سوچ رہا تھا۔

"مسٹر ملک!" —— ٹینیسن نے پوچھا —— "تمہارا کیا خیال ہے مقتول کو بیوی نے قتل کرایا ہے؟؟"

"ہو سکتا ہے" —— میں نے جواب دیا —— "اگر یہ لڑکی خاوند سے آزاد ہونے کی کوشش میں تھی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی پسند کا آدمی موجود ہے اور یہ آدمی قاتل ہے.... اور میں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ یہ آدمی مسلمان ہو گا۔ وہ ہندو اس لئے نہیں ہو سکتا کہ کوئی ہندو کسی بیوہ کے ساتھ شادی نہیں کرتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہندو قتل کرنے والی قوم نہیں۔ ہندو قتل کیا کرتے ہیں لیکن صرف مسلمانوں کو۔ وہ اس طرح کہ چند ایک مسلمانوں کو قتل کرنے کے لئے سینکڑوں ہندو ان مسلمانوں پر اپنے

مذہب کی توہین کا الزام لگا کر ان پر حملہ کر دیں گے۔ ہندو ایک مسلمان کو قتل کرنے کے لئے بلوائیوں کے ایک ہجوم کی صورت میں حملہ کیا کرتے ہیں اور اسے وہ فرقہ وارانہ فساد کہتے ہیں"۔

"میرا خیال بھی یہی ہے" —— ٹینیسن نے کہا —— "قاتل مسلمان ہو سکتا ہے لیکن میں سوچتا ہوں کہ لڑکی اب تک غائب کیوں نہیں ہوئی"۔

"وہ عقل والی معلوم ہوتی ہے" —— میں نے کہا —— "بیوقوف ہوتی تو اپنے دوست کے ساتھ اُسی رات غائب ہو جاتی اور اب تک پکڑی بھی جا چکی ہوتی۔ اگر تین چار مہینوں بعد غائب ہوئی اور اسلام قبول کر کے اس نے قاتل آشنا کے ساتھ شادی کر لی تو پکڑے جانے کی صورت میں کہے گی کہ اس شخص سے وہ کچھ دن پہلے ملی تھی اور وہ بالغ ہے اس لئے وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کر سکتی ہے۔ پولیس کے لئے یہ ثابت کرنا ناممکن ہو گا کہ اس کا یہ مسلمان خاوند اس کے ہندو خاوند کے قتل سے پہلے سے اس کا دوست ہے"۔

بیوہ کی بیماری مشکوک!

وہ فلیٹ بڑی مشہور جگہ تھا جس میں مقتول کی نوجوان بیوہ رہتی تھی اس لئے ہمیں آسانی سے مل گیا۔ بیوہ اوپر کی منزل میں رہتی تھی۔ ہم نے دروازے پر دستک دی تو تقریباً تیس سال عمر کے ایک آدمی نے دروازہ کھولا۔ لباس' چہرے اور انداز سے وہ اپر کلاس کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس فلیٹ میں سب اپر کلاس کے ہی لوگ رہتے تھے۔ یہ اُس وقت کے جدید فلیٹ تھے۔ کرایہ اتنا زیادہ کہ مڈل کلاس فیملی یہاں نہیں رہ سکتی تھی۔

میں نے اپنا اور انسپکٹر ٹینیسن کا تعارف کرایا۔

"تو یہ کیس کرائمز برانچ میں چلا گیا ہے!" —— اس نے کہا —— "یہ تو بہت اچھا ہوا۔ تھانے والے تو کچھ بھی نہیں کر سکے.... آیئے.... یہ میری بہن کا گھر ہے جو مہندر پال کی بیوی تھی۔ وہ یہیں ہے"۔

اندر لے جا کر اس نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ یہ فلیٹ نہیں بلکہ جدید کوٹھی لگتی تھی۔ ڈرائنگ روم کے فرنیچر وغیرہ سے ان لوگوں کے سوشل سٹینڈرڈ کا اندازہ ہوتا تھا..... ہمارے میزبان نے اپنا نام سدھیر بتایا۔

"کنول کو بلالوں؟" — سدھیر نے پوچھا — "اپنی بہن کو؟"

"ابھی نہیں" — انسپکٹر ٹینیسن نے کہا — "آپ بیٹھیں۔ کچھ باتیں آپ سے پوچھنی ہیں" — وہ بیٹھ گیا تو ٹینیسن نے کہا — "عجیب بات ہے ہمیں کوئی گائیڈ لائن نہیں دی جا رہی۔ آپ نے یقیناً سوچا ہو گا کہ قاتل کون ہو سکتا ہے"۔

"بہت سوچا ہے" — اس نے کہا — "کچھ سمجھ نہیں آتی۔ ظاہری طور پر قتل کی کوئی وجہ نہیں تھی"۔

"مقتول کے ساتھ آپ کے تعلقات کیسے تھے؟" — میں نے پوچھا۔

"وہ تھا تو میرا بہنوئی" — اس نے کہا — "لیکن تعلقات دوستوں جیسے تھے"۔

"کیا وہ خوش طبع اور زندہ دل تھا؟"

"نہ خوش طبع تھا نہ زندہ دل" — اس نے جواب دیا — "لیکن آدمی ٹھیک ٹھاک تھا"۔

ہم مقتول کے باپ اور اس کی ماں سے مل آئے تھے۔ ان کے ساتھ جو باتیں ہوئی تھیں وہ سنا چکا ہوں۔ اس شخص سدھیر پر ہم یہ ظاہر کر رہے تھے کہ ہم ابھی اس کی بہن کے سسرال نہیں گئے۔

"آپ کی بہن کے سسرالی لوگ کیسے ہیں؟" — میں نے پوچھا۔

"اچھے لوگ ہیں" — اس نے جواب دیا — "پہلے پولیس سٹیشن کا تھانیدار تفتیش کرتا رہا تھا۔ ہمیں ڈر تھا کہ مندر کا باپ یا اس کی ماں یہ نہ کہہ دے کہ ان کے بیٹے کو بیوی نے قتل کرایا ہے لیکن انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ میں تھانیدار سے ملا تھا۔ اس نے بھی میری بہن کے سسرال کی تعریف کی تھی۔ اب آپ ان سے ملیں گے تو دیکھیں گے کہ...."

وہ اسی قسم کی باتیں کرتا رہا۔ ہم اس کوشش میں تھے کہ اس سے کوئی اشارہ ملے۔ ہم دونوں نے باتوں اور سوالوں کے ذریعے بہت کوشش کی کہ اس کے منہ سے ہمارے مطلب کی کوئی بات نکل آئے لیکن ہمیں کامیابی نہ ہوئی۔ ہمارے سوالوں کے

جواب دینے میں وہ کوئی ہیرا پھیری نہیں کر رہا تھا۔ شائستگی اور سادگی سے جواب دیتا تھا۔

"بہن کو یہاں اکیلا کیوں رکھا ہُوا ہے؟" — میں نے پوچھا — "اسے اپنے گھر نہیں لے جائیں گے؟"

"آپ مسلمان ہیں" — اس نے کہا — "آپ بیوہ کی دوسری شادی کر دیتے ہیں۔ ہم نہیں کرتے۔ صرف اتنا ہی ہو کہ بیوہ کو کوئی دوسرا آدمی قبول نہ کرے تو قابلِ برداشت ہے لیکن ہمارے ہاں بیوہ کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کیا جاتا ہے جیسے اپنے خاوند کی اس نے خود جان لی ہو۔ اسے دھتکار دیا جاتا ہے۔ اپنی ماں اور اپنی سگی بہنیں بھی اسے حقارت کی نظروں سے دیکھتی ہیں"۔

"آپ تو روشن دماغ ہیں" — انسپکٹر ٹینیسن نے کہا — "آپ ان فرسودہ رسموں کی پابندی کیوں کرتے ہیں؟"

"آپ اسے رسم کہتے ہیں؟" — سدھیر نے کہا — "ہمارے مذہبی پیشواؤں نے بیوہ کو نجس اور منحوس قرار دینا مذہبی حکم بنا رکھا ہے۔ بیوہ کو مندر میں بھی داخل نہیں ہونے دیا جاتا۔ میں جب سوچتا ہوں کہ میری بہن کی جس زندگی کا آغاز ہو چکا ہے یہ کس قدر اذیّت ناک ہے تو مجھے یوں پتہ چلتا ہے کہ ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے اور میں کچھ دیر بعد مر جاؤں گا۔ آپ غور کریں کہ بہن کی شادی کو ابھی چار مہینے ہی ہوئے تھے کہ بیوہ ہو گئی ہے۔ یہ بھی سوچیں کہ لڑکی روشن خیال اور سوشل ہے۔ میں اس کے لئے بہت پریشان ہوں۔ اس بہن کے ساتھ مجھے روحانی محبت ہے"۔

اس نے اپنا رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کی بہن کے ساتھ ہمیں کوئی ہمدردی نہیں تھی نہ ہم ان کے مذہب کی اچھائیاں اور برائیاں سُننے آئے تھے۔

"میں اپنی بہن کے لئے جو کچھ کر سکتا ہوں کر رہا ہوں" — وہ کہے جا رہا تھا — "میں نے اسے کہا کہ یہیں رہو، کرایہ میں دوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ ذہنی اور جذباتی لحاظ سے سنبھل جائے تو سوچوں گا کہ اُسے زندگی کے کس راستے پر ڈالوں کہ یہ ذرا سکھ چین سے رہے۔ اسے نوکرانی رکھ دی ہے۔ میں سارا دن اپنے کام اور کاروبار کے لئے باہر رہتا ہوں۔ شام کو اس کے پاس آ جاتا ہوں اور رات کو اپنے گھر چلا جاتا ہوں"۔

"اپنی بہن کو بلالیں" — میں نے کہا۔

وہ ساتھ والے کمرے میں گیا اور واپس آگیا۔

"وہ سوئی ہوئی ہے"— اُس نے کہا— "آپ کہیں تو جگالیتا ہوں لیکن ڈاکٹر نے بڑی سختی سے کہہ رکھا ہے کہ یہ سوئی ہو تو اسے جگانا نہیں"۔

"ڈاکٹر کیوں؟"— ٹینیسن نے پوچھا— "کیا آپ کی بہن بیمار ہے؟"

"اسی عمر میں بیوہ ہو جانے کا صدمہ!"— سدھیر نے کہا— "ڈیپریشن بھی ہے اور نروس بریک ڈاؤن بھی ہے۔ ڈاکٹر اسے گھر دیکھنے آجاتا ہے۔ یہ تکلیف چار پانچ دنوں سے ہے۔ پہلے اس نے بیوگی کا صدمہ برداشت کرلیا تھا لیکن چار پانچ دن پہلے اسے اچانک کچھ ہوگیا۔ اتنی زیادہ روئی کہ اسے غشی آنے لگی"۔

"نہ جگائیں"— ٹینیسن نے کہا— "ہم پھر کسی وقت آئیں گے"۔

میں نے احتیاطاً ڈاکٹر کا نام اور ایڈریس معلوم کرلیا اور ہم وہاں سے آگئے۔ میں نے ٹینیسن سے پوچھا کہ اس شخص سدھیر کے متعلق اس کی کیا رائے ہے۔

"اگر یہ شخص بیوقوف نہیں تو بہت ہی عیّار اور لومڑی جیسا چالاک ہے"— ٹینیسن نے کہا— "کوئی ہندو اتنا سیدھا سادا نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ شخص سیدھا یا بدھو ہوتا تو ہم سے ڈرتا اور اس کے بولنے کا انداز کچھ اور ہوتا.... اسے ہم نظرانداز نہیں کرسکتے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"مجھے اس کی بہن کی بیماری مشکوک نظر آتی ہے"— میں نے کہا۔

مقتول کی نفسیات

اگلے روز ہم دِلّی سے پندرہ میل دُور اُس جگہ چلے گئے جہاں مقتول کے باپ کے ٹھیکے کا کام ہو رہا تھا۔ خاصا بڑا تعمیراتی پروجیکٹ تھا۔ بے شمار مزدور کام کررہے تھے۔ وہاں ٹھیکیدار کے گھر کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ معزّز سی قسم کا ایک آدمی ہمیں دیکھ کر ہمارے پاس آیا۔ ہم پولیس کی وردی میں نہیں تھے۔ سی آئی اے کے افسر اور دیگر عملہ پرائیویٹ کپڑوں میں رہتا تھا۔ میرے ساتھ چونکہ ایک انگریز تھا اس لئے یہ آدمی دوڑتا آگیا تھا۔

میں نے اپنا اور انسپکٹر ٹینیسن کا تعارف کرایا تو اُس نے بتایا کہ وہ مینیجر ہے۔ پہلے مقتول صبح ہی یہاں آجایا کرتا تھا۔ وہ قتل ہوگیا تو اس کا بڑا بھائی یا باپ دن کو کسی وقت یہاں آتے اور دو تین گھنٹے وہیں رہتے تھے۔ اس مینیجر کا تو سارا دن یہیں گزرتا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر ہندو تھا اور روایتی ہندوؤں جیسا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر بات کرتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم مہندرپال کے قتل کی تفتیش کے لئے آئے ہیں۔

وہ ہمیں دفتر میں لے گیا۔ یہ دو کمرے تھے جو عارضی طور پر بنائے گئے تھے۔ ان میں ایک کمرہ تو اندر سے بہت ہی خوبصورت تھا۔ نہایت اچھی میز اور کرسیوں کے علاوہ ایک دیوان بھی پڑا تھا جس پر پلنگ پوش بچھا ہُوا تھا۔ یہ مقتول کا کمرہ تھا۔

میں نے ٹینیسن سے کہا کہ پہلے ذرا گھوم پھر کر مزدوروں وغیرہ کو دیکھ لیں۔ چنانچہ ہم دونوں اس تعمیراتی کام میں لگے ہوئے مزدوروں کے درمیان گھومنے پھرنے لگے۔ میں جو چیز دیکھنا چاہتا تھا وہ مجھے نظر آنے لگی۔ یہ عورتیں تھیں جو مزدوری کررہی تھیں۔ ان میں ادھیڑ عمر عورتیں بھی تھیں اور نوجوان لڑکیاں بھی۔

بھارت میں اس نسل کی عورتیں آج بھی موجود ہیں اور مزدوری کرتی ہیں۔ یہ ٹخنوں سے ذرا اونچے گھگرے اور بلاؤز پہنتی ہیں۔ بلاؤز اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ ان کے پیٹ کچھ کچھ ننگے رہتے ہیں۔ سروں پر دوپٹے لیتی ہیں۔ ان کے رنگ سانولے نہیں بلکہ سیاہ ہوتے ہیں۔ کچھ تو ان کا رنگ قدرتی طور پر ایسا ہی ہوتا ہے اور زیادہ تر دھوپ میں محنت مزدوری کرنے سے رنگ بالکل سیاہ ہو جاتا ہے۔

ان میں نوجوان لڑکیاں بھی ہوتی ہیں جن میں سے بعض کے رنگ گندمی اور نقش و نگار بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی بھی لڑکی اکیلی نہیں ہوتی۔ یہ پورا پورا کنبہ ہوتا ہے۔ یہ لڑکیاں مالکوں کی ہوس کاری کے کام آتی ہیں۔

مجھے اب یہ معلوم کرنا تھا کہ مقتول کی بھی ان لڑکیوں کے ساتھ دلچسپی تھی یا نہیں۔ میں اس شک کا پہلے اظہار کرچکا ہوں۔ آپ کہیں گے کہ اپر کلاس کے اتنے دولت مند آدمی کے لئے یہی کالی' پسینے میں نہائی ہوئی' میلے کچیلے کپڑوں والی بدبودار لڑکیاں ہی رہ گئی تھیں؟

یہ ایک نفسیاتی معاملہ ہے۔ مقتول کی شخصیت جو ہمارے سامنے آئی تھی وہ گھٹی

ہوئی اور اپنی ذات کے خول میں بند شخصیت تھی۔ مقتول بھدے اور پھولے ہوئے جسم کا آدمی تھا۔ ایسی شخصیت احساسِ کمتری میں مبتلا ہوتی ہے۔ ذہنِ لاشعور انہیں سوسائٹی میں مقبولیت والا مقام حاصل کرنے ہی نہیں دیتا۔ اس قسم کے لوگ جنہیں سیدھا سادا کہا جاتا ہے' ذہنی لذّت پرستی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان کے لئے اسی قسم کی لڑکیاں قابلِ قبول ہوتی ہیں جو ان کی زر خرید لونڈیاں ہوں' غریب ہوں اور پیٹ کی خاطر انہیں اپنا دیوتا سمجھیں۔

اس احساسِ کمتری کا دوسرا پہلو دیکھیں۔ مقتول کو بڑی خوبصورت' زندہ دل' نئے فیشن کی دلدادہ اور مالدار خاندان کی لڑکی مل گئی تھی جو اس کی بیوی تھی۔ احساسِ کمتری کے مارے ہوئے خاوند اس قسم کی بیویوں کے آگے مٹی کے مادھو بن جاتے ہیں۔ کشادہ دل' خوشگوار طبع اور سوشل لڑکیاں تنگ دل اور گھُٹے ہوئے خاوندوں کو پسند نہیں کیا کرتیں۔

آپ میری اس کہانی کو بے مزہ سا پائیں گے کیونکہ میں نے نفسیاتی تجزیہ شروع کر دیا ہے اور یہ کہانی میری دوسری تفتیشوں سے مختلف ہو گئی ہے۔ عرض یہ ہے کہ میں کہانیاں گھڑا نہیں کرتا۔ جس طرح کوئی واردات ہوئی اور جس طرح میں نے تفتیش کی وہ اسی طرح سنا دی۔ کہانی کو دلچسپ اور چسکے دار بنانے کے لئے میں ایسے واقعات شامل نہیں کیا کرتا جو ہوئے ہی نہ ہوں۔

اس واردات میں مقتول کی نفسیات کی طرف میری توجہ اس وجہ سے گئی تھی کہ اس کے گھر میں' اس کی سوسائٹی میں اور اس کی کاروباری فیلڈ میں اس کے قتل کا کوئی باعث نہیں مل رہا تھا۔

اب میں نے یہ دیکھنا تھا کہ میں نے مقتول کا جو نفسیاتی تجزیہ کیا ہے یہ کہاں تک صحیح ہے۔ میں نے انسپکٹر ٹینیسن کو یہ تجزیہ سنایا۔ وہ انگریز تھا' انسپکٹر تھا اور سکاٹ لینڈ یارڈ کا تربیت یافتہ تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ عقلمند تھا۔ اس نے میرا تجزیہ قبول کر لیا۔

وہاں ایک تو مینجر تھا۔ اس نے بتایا کہ مزدوروں پر دو میٹ بھی ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ دو آدمی اور بھی رکھے ہوئے ہیں جو شہر کے غنڈے اور جرائم پیشہ ہیں۔ یہ ہر کسی پر نظر رکھتے ہیں کہ کوئی یہاں بدمعاشی نہ کرے۔ مینجر نے بتایا کہ انہیں مقتول کے باپ جوگندر پال نے اپنی اور اپنے کاروبار کی حفاظت کے لئے رکھا ہُوا ہے۔

"وہ کون ہیں؟" — میں نے پوچھا — "کہاں ہیں؟"

"آنے ہی والے ہیں" — مینجر نے جواب دیا — "اپنی مرضی سے آتے اور اپنی مرضی سے چلے جاتے ہیں"۔

یہ دونوں غنڈے اور جرائم پیشہ آدمی ہمارے لئے عجوبہ نہیں تھے۔ جوگندر پال جیسے بڑے کاروباری لوگ کرائے کے غنڈے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ٹھیکیداریوں میں دشمنی اور رقابت لگی رہتی ہے۔ اس مقصد کے لئے غنڈے رکھے جاتے تھے۔ پاکستان کی سیاسی پارٹیوں میں غنڈے موجود ہوتے ہیں۔ سیاسی لیڈر بلکہ اکثر اسمبلیوں کے ممبر بھی اپنے ساتھ دو تین غنڈے بطور محافظ رکھتے ہیں۔ بڑے زمینداروں نے باقاعدہ غنڈے پالے ہوئے ہوتے ہیں۔ کارخانہ دار فیکٹریوں میں دو تین غنڈے رکھتے ہیں۔ کل اور آج میں فرق یہ ہے کہ آج کے غنڈوں کے پاس کلاشنکوفیں اور ریوالور ہوتے ہیں اور ہمارے وقتوں میں چاقو اور خنجر ہوتے تھے یا کسی کسی کے پاس ریوالور بھی ہوتا تھا۔

ہر روز ایک لڑکی

ہم مینجر کو اُس کمرے میں لے آئے جو مقتول کا دفتر تھا۔

"میری بات غور سے سن لو لالہ جی!" — میں نے مینجر سے کہا — "تمہارا چھوٹا سیٹھ قتل ہو گیا ہے۔ یہ دیکھ لو کہ ایک انگریز افسر تفتیش کر رہا ہے۔ تم جو کچھ جانتے ہو وہ ٹھیک ٹھیک بتا دینا۔ کوئی بات چھپانے کی کوشش نہ کرنا"۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ مینجر روایتی ہندو تھا۔ اپنے سے کم درجہ ملازموں کے لئے شیر اور اپنے سے اوپر والوں یا ذرا طاقت والوں کے آگے بھیگی بلّی' یعنی کمزوروں کے لئے بادشاہ اور طاقتوروں کے لئے غلام۔ اس نے میری اتنی سی بات پر ہی ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"ہم تو نوکر چاکر ہیں سرکار!" — اس نے کہا — "یہ بڑے سیٹھوں کے معاملات ہیں اور رگڑے ہم جاتے ہیں۔ آپ جو پوچھیں گے وہ میں سولہ آنے سچ بتاؤں گا...."

لیکن سرکار! ہم غریبوں کا خیال رکھنا سیٹھ کو یہ پتہ نہ چلے کہ میں نے کوئی بات بتائی ہے"۔

میں نے اسے جھوٹی سچی تسلیاں دیں اور سوال جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس نے مقتول کی شخصیت کی بالکل وہی تصویر پیش کی جو اس کا باپ ہمیں دکھا چکا تھا' یعنی صرف کاروبار میں دلچسپی رکھنے والا' بدھو ٹائپ' دنیا کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔

اس مینجر سے میں نے جو باتیں کیں اور جو اس نے بتائیں وہ ساری کی ساری سنانے کی ضرورت نہیں۔ میں اصل بات پر آنا چاہتا ہوں۔ میں مقتول کی دوستی اور دشمنی معلوم کرنے کی کوشش میں تھا۔ کہیں بھی اس کی دشمنی کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ مقتول نے کسی راج' مزدور یا کسی کاریگر کو کام سے نہیں ہٹایا تھا۔

"اب لالہ جی سولہ آنے سچ بولنا"— میں نے کہا— "میں نے مزدور عورتوں میں تین نوجوان لڑکیاں دیکھی ہیں"۔

"سرکار!"— مینجر نے میری پوری بات سنے بغیر حسب عادت ہاتھ جوڑ کر بھکاریوں کے لہجے میں کہا— "میں حضور کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ یہ بات بار بار میری زبان پر آتی تھی لیکن میں بولتا نہیں تھا۔ اگر مجھے پردے میں رکھیں تو یہ بات بھی بتا دیتا ہوں.... یہ تینوں لڑکیاں آج کام کر رہی ہیں۔ چھوٹے سیٹھ جی مارے گئے تو انہوں نے کام شروع کیا ہے۔ ان کی زندگی میں یہ کام پر صرف آتی تھیں۔ ذرا سا ہاتھ پیر ہلا دیتی تھیں اور سارا دن مزدور عورتوں میں گھومتی پھرتی رہتی تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی نہا دھو کر آتی اور دوپہر کو چھوٹے سیٹھ (مقتول) کے پاس اس کمرے میں آ جاتی تھی۔ کم از کم تین گھنٹے کمرے میں گذارتی تھی۔ چھوٹے سیٹھ کی ٹانگیں دباتی اور سارا جسم سہلاتی اور پھر داشتہ والا کام ہوتا تھا۔ لڑکیوں کی باریاں لگی ہوئی تھیں.... ہر روز ایک لڑکی.... یہ لڑکیاں اسی کام کی دیہاڑی لیتی تھیں۔ مہندر سیٹھ انہیں الگ پیسے بھی دیتا تھا"۔

میرا نفسیاتی تجزیہ بالکل صحیح نکلا۔ انسپکٹر ٹینیسن بالکل خاموش بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ میں صحیح لائن پر چل رہا ہوں۔ اس نے مینجر کے ساتھ صرف ایک بات کی تھی۔

"خیال کرو مینجر!"— اس نے کہا— "تم ٹھیک بولے گا تو ہم تمہارے ساتھ ٹھیک رہے گا۔ سچ بولو۔ کسی کو مالم نہیں ہونے دے گا"۔

"ان لڑکیوں کے ساتھ ان کے مرد بھی یہاں کام کرتے ہوں گے؟"— میں نے مینجر سے پوچھا۔

"ہاں سرکار!"— اس نے جواب دیا— "ان کے بھائی یہاں کام کرتے ہیں۔ ایک کا باپ بھی یہیں ہے"۔

"وہ اپنی لڑکیوں کو روکتے نہیں؟"— میں نے پوچھا— "یا انہیں معلوم ہی نہیں کہ ان کی لڑکیوں سے کیا کام لیا جا رہا ہے؟"

"آپ انہیں کیا سمجھتے ہیں سرکار!"— مینجر نے کہا— "ان لوگوں نے پیسہ کمانا ہے۔ یہ ہر کام کر لیتے ہیں۔ ان کے باپ اور بھائی مقتول سیٹھ کو جھک کر سلام کرتے ہیں کہ وہ ان کی لڑکیوں کو بہت پیسے دیتا ہے"۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں اس کلاس کو اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ لوگ چھوٹے موٹے جرائم بھی کر لیتے تھے۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ دشمنی کا ایک باعث یہ بھی ہو سکتا ہے۔

میں نے مینجر سے کہا کہ باہر جا کے دیکھے کہ سیٹھوں کے وہ غنڈے آ گئے ہوں تو انہیں ہمارے پاس لے آئے۔

"مسٹر ملک!"— مینجر کے جانے کے بعد انسپکٹر ٹینیسن نے مجھے کہا— "میرا خیال ہے ہم یہاں وقت ضائع کر رہے ہیں"۔

"نہیں"— میں نے کہا— "اس مینجر سے ہمیں کچھ کام کی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ یہ پتہ چل گیا ہے کہ مقتول کا کردار کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ مقتول کسی اور عورت کے چکر میں آ کر قتل ہُوا ہے.... یہ جو دو غنڈے آ رہے ہیں' ان سے بھی کچھ نہ کچھ معلوم ہو جائے گا"۔

"وہ آ گئے ہیں سرکار!"— مینجر نے اندر آ کر اطلاع دی۔

"انہیں اندر بھیج دو"— میں نے کہا— "آپ باہر بیٹھیں"۔

دو آدمی اندر آئے۔ ایک کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ اور دوسرا تیس سال کا ہو گا۔ دونوں نے صاف ستھرے اور قیمتی کپڑے پہن رکھے تھے۔ دونوں کے چہروں پر

رونق اور خوداعتمادی تھی۔ دونوں نے ہمیں جھک کر سلام کیا۔ بڑے کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر گھبرا گیا تھا اور حیران بھی ہو رہا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا تو اس کا چہرہ مانوس لگا۔

"کیا میں تمہیں جانتا ہوں؟" — میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں صاحب!" — اس نے مسکرا کر جواب دیا — "آگرہ میں ملاقات ہوئی تھی ... تین سال سے کچھ اوپر عرصہ ہو گیا ہے"۔

اس نے مجھے ڈکیتی کی ایک واردات سنائی۔ یہ اس علاقے کا وارداتیا تھا اور کرائے کی غنڈہ گردی کا ماہر تھا۔ اس نے بڑی اچھی مخبری اور پھر نشاندہی کی تھی۔ میں نے اس کی راہنمائی سے ملزموں کو پکڑا تھا۔ دو ملزموں کو سزا ہوئی تھی۔ اس گینگ کے ایک آدمی نے اس سے انتقام لینا چاہا تھا۔ دونوں کی چاقوؤں سے لڑائی ہوئی تھی اور دونوں بُری طرح زخمی ہوئے تھے۔ دونوں چاقو زنی کے مجرم تھے۔ دونوں نے تیز دھار ہتھیار سے ایک دوسرے کو زخمی کیا تھا لیکن میں نے اسے اس طرح بچا لیا تھا کہ دوسرے کو قاتلانہ حملے کا ملزم قرار دے دیا تھا اور اس کے متعلق میں نے مؤقف اختیار کیا تھا کہ اس نے اپنے دفاع (حفاظتِ خود اختیاری) میں حملہ آور کو زخمی کیا ہے۔ میں نے کیس ایسا ہی تیار کیا تھا۔ اسے بچا لیا اور اس کے دشمن کو چار سال سزائے قید دلا دی تھی۔ نام ابراہیم تھا اور اِبرا کے نام سے مشہور تھا۔

"میں تمہارا نام بھول گیا ہوں" — میں نے کہا — "دِلّی کب سے آئے ہو؟"

"نام اِبرا ہے صاحب!" — اس نے جواب دیا — "ابراہیم.... دو اڑھائی سال سے دِلی میں ہوں.... یہ دارا ہے۔ پورا نام دلدار سنگھ ہے۔ مونا سکھ ہے"۔

"کیا کرتے ہو یہاں؟"

"کوئی اچھا کام تو نہیں کرتا صاحب!" — اس نے جواب دیا — "بھاڑے (کرائے) پر چلتا ہوں.... اچھی گزر بسر ہو رہی ہے۔ اللہ آپ کو ترقی دے۔ آپ کا احسان یاد ہے"۔

"دارے بھائی!" — میں نے اس کے ساتھی سے کہا — "تم باہر بیٹھو.... آگے آؤ اِبرے! بیٹھ جاؤ"۔

میں سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ انسپکٹر ٹینیسن کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر

اِبرے کو دیا۔

ایک مسلمان فوجی افسر

"یار تمہارے چھوٹے سیٹھ کو کون مار گیا ہے؟" — میں نے کہا — "اس کے گھر والے کہتے ہیں کسی سے دشمنی تھی ہی نہیں"۔

"ذرا ہمارا خیال رکھنا صاحب!" — اِبرے نے کہا — "ہماری گواہی نہ ڈال دینا۔ اعتبار قائم رہے تو اچھا ہوتا ہے۔ سیٹھ جوگندر پال ہمارا بہت خیال کرتا ہے۔ ہم نے اس کا رعب دبدبہ ایسا رکھا ہُوا ہے کہ کسی کی جراَت نہیں جو اس خاندان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ یہ بالکل صحیح ہے ملک صاحب کہ ان کا کوئی دشمن نہیں لیکن قتل گھر سے کروایا گیا ہے"۔

"بیوی نے؟"

"آپ سمجھ گئے" — اس نے کہا — "معلوم نہیں آپ نے مہندر کی بیوی کو دیکھا ہے یا نہیں۔ مہندر کو تو آپ نے دیکھا ہی نہیں ہو گا۔ یہ کوئی جوڑ نہیں تھا۔ جسم کے لحاظ سے بھی اور مزاج کے لحاظ سے بھی۔ یہ کوئی جوڑ نہیں تھا۔ دارا ان کے گھر کی باتیں مجھ سے زیادہ جانتا ہے میں اسے بلا لیتا ہوں۔ سب کچھ بتائے گا"۔

وہ باہر گیا اور اپنے ساتھی کو ساتھ لے آیا۔ اسے آگرے کی واردات سنائی اور کہا کہ وہ میرا احسان مند ہے۔

"ملک صاحب جو پوچھتے ہیں وہ بتا دینا" — ابرے نے دارے سے کہا — "یہ ہمیں پردے میں رکھیں گے۔ یہ ملک صاحب میرے بڑے پرانے مہربان ہیں.... یہ کرائم برانچ میں ہیں۔ مہندر کے قتل کی تفتیش کے لئے آئے ہیں"۔

"پردے میں نہیں رکھیں گے تو کیا ہو جائے گا!" — دارے نے کہا — "ان سیٹھوں نے ہمارا کیا بگاڑ لینا ہے.... ملک صاحب جی! پکی بات تو ہم کر نہیں سکتے، پکّا شک بتا سکتے ہیں۔ مہندر کی بیوی کو میں نے دو بار ایک مسلمان کے ساتھ ٹیکسی پر کہیں جاتے دیکھا تھا۔ بڑا خوبصورت جوان ہے۔ ایک بار وہ فوجی وردی میں تھا۔ میں یہ نہیں بتا سکتا

کہ وہ لیفٹیننٹ ہے' کپتان ہے یا میجر ہے.... وہ ہے افسر!"

"یہ تم کیسے بتا سکتے ہو کہ وہ مسلمان ہے؟"— میں نے کہا— "فوجی افسر ہندو ہو یا مسلمان' وردی ایک ہی جیسی ہوتی ہے"۔

"یہ اسے میں نے بتایا تھا"— اِبرے نے کہا— ایک بار میں نے مہندر کی بیوی کو اس فوجی افسر کے ساتھ کناٹ پیلس میں دیکھا تھا۔ میں ان کے پیچھے تھا۔ آپ جانتے ہیں کناٹ پیلس میں ذرا رش ہوتا ہے۔ اُس روز یہ جوان فوجی وردی میں تھا۔ آگے سے اسی جیسے دو فوجی افسر آ رہے تھے۔ مہندر کی بیوی والا افسر انہیں دیکھ کر رک گیا۔ مہندر کی بیوی آگے نکل گئی۔ اس افسر نے ان دونوں افسروں کو بڑی زور سے السلام علیکم کہا اور ہاتھ ملایا۔ میں آگے نکل گیا....

"یہ مہندر کی شادی سے دس بارہ دن پہلے کی بات ہے۔ لڑکی اتنی خوبصورت تھی کہ میں نے اسے بہت ہی اچھی طرح دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے ان دونوں کو پھر دیکھا۔ وہ ایک ٹیکسی کے قریب کھڑے تھے۔ میں انہیں نئے بیاہے ہوئے میاں بیوی سمجھ رہا تھا اور میں نے دل میں کہا کہ کتنا خوبصورت جوڑا ہے۔ دس بارہ دنوں بعد مہندر کی شادی ہوئی تو وہ اپنی دلہن کو یہاں لایا اور اسے گھمایا پھرایا' یہ کام دکھایا جو چل رہا ہے....

"ملک صاحب! میں نے لڑکی کو دیکھا تو مجھے اس پر یقین نہیں آ رہا تھا جو میں دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے میں نے اس فوجی افسر کے ساتھ دیکھا تھا۔ پھر میں نے کہا کہ بعض انسانوں کی شکلیں آپس میں اتنی زیادہ ملتی ہیں کہ آدمی دھوکے میں آ جاتا ہے لیکن میرا دل کہتا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے' پھر جب ہم نے شادی کے بعد اس لڑکی کو آزادی سے باہر نکلتے اور گھومتے پھرتے دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہی ہے....

"شادی کے بعد دارے نے دوبارہ مجھے بتایا کہ اس نے مہندر کی بیوی کو ایک بڑے خوبصورت اور جوان فوجی افسر کے ساتھ دیکھا تو میں نے اسے بتایا کہ وہ مسلمان ہے۔ دارا کہنے لگا کہ سیٹھ کو بتا دیتے ہیں کہ یہ لڑکی ٹھیک نہیں۔ میں نے اسے کہا کہ رہنے دو یار' یہ بڑے لوگ ہیں' یہ اُلٹا ہم پر الزام دھر دیں گے کہ ہم ان کی لڑکی کو بدنام کر رہے ہیں۔ یہ ہماری بات نہیں مانیں گے"۔

"تم یہ تو نہیں بتا سکتے کہ یہ میاں بیوی آپس میں کس طرح رہتے تھے؟"— میں نے پوچھا۔

"میں بتا سکتا ہوں"— دارے نے کہا— "میں مسلمان نہیں' سکھ ہوں۔ چونکہ میں نے داڑھی نہیں رکھی اور کیس (سر کے بال) بھی نہیں اس لئے یہ لوگ مجھے ہندو سمجھتے ہیں۔ میرا ان کے گھر آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ان کے دو نوکر میرے یار ہیں۔ کچھ تو میں نے خود دیکھا ہے اور زیادہ باتیں نوکروں نے بتائی ہیں۔ مہندر اپنی بیوی کا غلام بنا ہُوا تھا۔ بیوی اس پر اپنا حکم چلاتی تھی۔ کچھ دن ہی گزرے تھے وہ مہندر کو ماں باپ سے الگ کر کے لے گئی۔ اتنی ہوشیار لڑکی ہے کہ اس نے مہندر کے ماں باپ اور اس گھر کے ہر فرد کے ساتھ تعلق اتنا پیارا رکھا کہ ہر کوئی اس کی تعریف کرتا تھا"۔

میں نے انسپکٹر ٹینیسن سے کہا کہ مقتول کی بیوی اسے اس فلیٹ میں صرف اس مقصد کے لئے لے آئی تھی کہ اس فوجی افسر سے ملنے میں سہولت رہے۔ مقتول تو صبح کا گیا ہُوا شام کے بعد واپس آتا تھا۔

"اس کے سوا اس کا اور کوئی مقصد ہو ہی نہیں سکتا تھا"— ٹینیسن نے کہا— "اس فلیٹ میں رہنے والے ان کے پڑوسیوں سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس کی نوکرانی بھی ہے۔ اس سے ذرا دھمکا کر پوچھیں گے"۔

"اب اس لڑکی نے غائب ہونا ہے"— میں نے کہا— "اور اس آرمی آفیسر کے ساتھ شادی کرنی ہے"۔

ہم نے یہ بات انگریزی میں کی تھی تاکہ اِبرا اور دارا نہ سمجھ سکیں۔ ان دونوں نے ہمیں راستے پر ڈال دیا تھا۔ ان سے میں نے چند اور ضروری باتیں پوچھیں۔

"مہندر بھی کوئی آدمی تھا ملک صاحب؟"— اِبرا بولا— "خدا نے اتنی خوبصورت بیوی دی اور یہ سیٹھ صاحب اس کمرے میں مزدور لڑکیوں کے ساتھ جھک مار رہے ہیں"۔

میں نے ان دونوں سے کہا کہ وہ چاہیں تو سی آئی اے میں انفارمر (مخبر) بن جائیں۔ میں انہیں بہت معاوضہ دلاؤں گا۔ سیٹھ کا کام بھی جاری رکھیں۔ انہوں نے حامی بھر لی۔ انسپکٹر ٹینیسن نے انہیں کہا کہ اس کیس میں انہوں نے ہماری جو مدد کی ہے' اس کا انہیں انعام ملے گا اور دو تین دنوں میں مل جائے گا۔

اب ہمیں وہاں مزید رکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مینجر کو بھی میں نے اندر بلالیا اور ان تینوں سے کہا کہ جوگندر پال یہاں آئے تو اُسے یہ بتادیں کہ ہم یہاں آئے تھے اور گھوم پھر کر اور یہ کمرہ دیکھ کر چلے گئے تھے۔ یہ نہ بتائیں کہ ان کے ساتھ کیا باتیں ہوئی تھیں۔

ہم واپس آ گئے۔ اب ہمارے ذہن سے بوجھ کم ہو گیا تھا۔ ہم نے تین افراد کو اپنے ہیڈ کوارٹر میں بلانے کا پروگرام بنالیا۔ ان میں سے سب سے زیادہ اہم مقتول کی بیوی کی نوکرانی تھی جو اس کے ساتھ فلیٹ میں رہتی تھی۔ ہم جب وہاں گئے تھے تو چائے کی ٹرے وہی لائی اور ہمارے آگے رکھی تھی۔ میں نے اسے پولیس کی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس کی عمر کم و بیش چالیس سال تھی۔ اس کا رنگ گندمی اور نقش تیکھے تھے۔ اس کی آنکھوں میں کوئی خاص بات تھی۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ یہ آنکھیں اپنے اندر کوئی ایسا تاثر یا اثر رکھتی ہیں کہ کوئی عام سا آدمی ان آنکھوں کا سامنا نہیں کر سکتا۔ مختصر یہ کہ یہ عورت عام گھریلو نوکرانیوں سے بالکل مختلف تھی اور یہ قابلِ تعریف کردار کی عورت نہیں تھی۔

میں نے باہر آکر انسپکٹر ٹیننسن سے کہا تھا کہ یہ نوکرانی شاید کسی وقت ہمارے کام آئے۔ اس کی آنکھوں میں کچھ راز ہیں۔ باقی جن دو افراد کو بلانا تھا وہ مقتول کی بیوی کے پڑوسی تھے۔ ایک دائیں طرف کے گھر والا اور ایک بائیں طرف رہنے والا۔

"تینوں کو ایک ہی بار نہیں بلائیں گے" ــــ انسپکٹر ٹیننسن نے کہا ــــ "پہلے نوکرانی کو بلائیں گے۔ اگر اس نے راز اُگل دیا تو پڑوسیوں کی ضرورت نہیں رہے گی"۔

ہم نے اُسی دن کے پچھلے پہر اپنی برانچ کے ایک اے ایس آئی کو تحریری سمن دے کر بھیج دیا کہ اس نوکرانی کو ساتھ لے آئے۔

پُراسرار نوکرانی' بیوہ کی رازدار

جہاں تک مجھے یاد ہے' یہ نوکرانی چار بجے سے کچھ پہلے آ گئی۔ اے ایس آئی نے

بتایا کہ مقتول کی بیوہ کو بتایا کہ اس کی نوکرانی کو اپنے ساتھ تفتیش کے لئے لے جانا ہے تو یکلخت اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا اور آنکھیں سفید ہو گئیں۔

"آپ اتنی زیادہ نروس کیوں ہو گئی ہیں؟" ــــ اے ایس آئی نے اسے کہا ــــ "اس سے کچھ باتیں پوچھنی ہیں پھر میں اسے خود یہاں چھوڑ جاؤں گا۔ آپ کو ذرا سا بھی پریشان نہیں ہونا چاہئے"۔

ہمیں اس کی پریشانی کا کوئی خیال نہیں تھا۔ یہ تو ڈپلومیسی تھی کہ اے ایس آئی اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ پولیس جس کسی کو بھی شاملِ تفتیش کرتی ہے اُس کے گھر والے پریشان ہوتے ہیں۔ منتیں کرتے ہیں' رشوت بھی پیش کرتے ہیں کہ ان کے آدمی کو تھانے نہ بلایا جائے۔

نوکرانی آئی۔ انسپکٹر ٹیننسن نے مجھے کہا کہ میں اکیلا اس سے پوچھ گچھ کروں کیونکہ انگریز افسر کی موجودگی میں یہ عورت گھبرائے گی۔ یہ اللہ کا کرم تھا کہ میری ساکھ ایسی بن گئی تھی کہ انگریز افسر مجھ پر بھروسہ کرتے اور میری رائے اور میرے فیصلوں کو مانتے تھے۔

میں نوکرانی کو تفتیش کے کمرے میں لے گیا اور کرسی پر بٹھا دیا۔

اس نے اپنا نام رانی بتایا اور میرے اس سوال کے جواب میں کہ وہ کب سے ان لوگوں کے ہاں ملازمہ ہے' بڑی اہم بات بتائی کہ وہ مقتول کے گھر کی نوکرانی نہیں بلکہ وہ کنول (مقتول کی بیوہ) کے میکے گھر میں اُس وقت سے نوکری کر رہی ہے جب کنول چودہ پندرہ سال کی تھی۔ کنول کی شادی ہوئی تو کنول اپنے خاوند کے ساتھ فلیٹ میں آ گئی۔ یہاں آتے ہی اس نے اپنے میکے گھر سے اس نوکرانی کو بلالیا۔

"کیوں؟" ــــ میں نے پوچھا ــــ "تمہارے ساتھ کنول کو بہت پیار تھا؟"

"یہ چھوٹی سی تھی جب میں اس گھر میں آئی تھی" ــــ اس نے جواب دیا ــــ "یہ میرے دل کو بڑی اچھی لگتی تھی۔ اس کے دل میں میرا پیار پیدا ہو گیا"۔

"دیکھو رانی!" ــــ میں نے کہا ــــ "ڈرنا اور گھبرانا نہیں اور یہاں اپنے آپ کو نوکرانی نہ سمجھنا۔ ہم تمہاری عزت کریں گے لیکن شرط یہ ہے کہ تم نے جھوٹ نہیں بولنا۔ اگر جھوٹ بولو گی یا کوئی بات چھپا لو گی تو یہ بات ہمیں دوسروں سے معلوم ہو جائے گی۔ ہم کل تمہارے مالکوں کے گھر گئے تھے۔ کنول کے بھائی نے ہمیں بہت سی

باتیں بتائی ہیں۔ کچھ باتیں تمہارے پڑوسیوں سے معلوم ہوئی ہیں۔ اگر تم کوئی بات چھپا کر رکھو گی تو پھر تمہیں یہاں سے ہم جانے نہیں دیں گے۔ پولیس کے آگے جھوٹ بولنا جرم ہے جس کی سزا ملتی ہے۔ تم نوکرانی ہو' غریب عورت ہو۔ ان امیر لوگوں کے معاملوں میں نہ پڑنا۔ میں تمہارے مالکوں کو پتہ نہیں چلنے دوں گا کہ تم نے ہمیں کیا بتایا ہے"۔

اس طرح میں نے اسے بڑے پیارے انداز میں ڈرایا اور چند اور ایسی باتیں کیں جن سے اسے پھونک ملی اور اس کے چہرے کا کھچاؤ کم ہو گیا۔ میں نے اپنے شک کے مطابق ہوا میں تیر چلایا۔

"ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ تمہاری مالکہ کنول کی دوستی ایک مسلمان کے ساتھ ہے"— میں نے کہا— "وہ فوجی افسر ہے اور کبھی کبھی وہ فلیٹ میں بھی کنول کے پاس آیا کرتا ہے۔ اب اگر تم اپنی مالکن پر پردہ ڈالنے کے لئے کہو گی کہ نہیں یہ غلط ہے تو اس میں تمہارا ہی نقصان ہے۔ ہم جانتے ہیں یہ بات سچ ہے۔ پھر یہ ہو گا کہ ہم تمہیں جھوٹ بولنے کے جرم میں گرفتار کر لیں گے"۔

"میں اتنے بڑے افسروں کے آگے جھوٹ کیوں بولوں گی مہاراج!"— اس نے مرعوب آواز میں کہا— "ایک عرض کروں گی۔ میں بچوں والی ہوں۔ خاوند کو بڑا بخار (ٹائی فائیڈ) ہُوا تھا۔ اس سے اس کا دایاں بازو اکڑ گیا تھا۔ وہ گھر میں بچوں کی دیکھ بھال کے سوا کوئی اور کام نہیں کر سکتا۔ کنول دیوی کی مہربانی ہے کہ میں معذور خاوند اور تین بچوں کا پیٹ پال رہی ہوں۔ اگر کنول کو پتہ چل جائے کہ میں نے اس کا بھید کھول دیا ہے تو میرے بچوں کا کیا بنے گا؟ نہ آپ کا حکم ٹال سکتی ہوں نہ اپنی مالکن کا۔ اس کا حکم ہے کہ اس کی کوئی بات کسی کو نہیں بتانی"۔

نوکروں اور مزارعوں کی یہ بہت بڑی مجبوری ہوتی ہے کہ وہ اپنے آقاؤں کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے لیکن یہ بد قسمت لوگ جب پولیس کے ہاتھوں میں آ جاتے ہیں تو ان پر نزع جیسی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ انہیں موت نظر آتی ہے مگر بھاگ نہیں سکتے۔ تفتیش کرنے والے افسر کو ایک انسان کی حیثیت سے ان کے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے لیکن اس کی ذمہ داری ایسی ہوتی ہے جسے وہ انسانی ہمدردی پر قربان نہیں کر سکتا۔

میں ایسے نوکروں چاکروں کو تسلیاں دینی جانتا تھا۔ میری کوشش یہ بھی ہوتی تھی کہ ان نوکروں اور مزارعوں کو پردے میں ہی رکھوں کیونکہ ان کے آقا ان کے خلاف انتقامی کارروائیاں کرتے تھے جو انتہائی ظالمانہ ہوتی تھیں۔ یہ کارروائیاں آج بھی ہوتی ہیں۔ راز فاش کرنے والے مزارعے کی جوان بیٹی اغوا ہو جائے گی۔ گاؤں میں اس کا حقہ پانی بند کر دیا جائے گا۔ اس کے بچوں کو بھوک کی مار دی جائے گی۔

یہ نوکرانی جو میرے سامنے بیٹھی تھی' کوئی سادہ طبیعت کی بُدھو عورت نہیں تھی۔ اس کا چہرہ' آنکھیں اور اس کا انداز بتا رہا تھا کہ ذہنی طور پر زندہ و بیدار اور حاضر دماغ ہے اور اگر اسے اپنے اثر میں لے لیا جائے تو سمجھو قارون کا خزانہ ہاتھ آ گیا۔ میں نے اسے اپنے مخصوص پُراثر انداز سے یقین دلایا کہ اس کی مالکن کو پتہ نہیں چلے گا۔

"آپ کو ٹھیک بتایا گیا ہے"— اس نے کہا— "میں آپ کو ساری بات بتا دیتی ہوں۔ میں تو کنول کی نوکرانی ہوں لیکن اس کی رازدار ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مجھے اپنے ساتھ رکھا ہُوا ہے۔ یہ جب کالج پڑھتی تھی تو بھی میں اس کی رازدار تھی۔ میں آپ کو یہ بتا دوں کہ راز صرف اتنا سا ہے کہ اس کی دوستی ایک مسلمان فوجی افسر کے ساتھ ہے جو شادی سے پہلے کی ہے۔ یہ بھی بتا دیتی ہوں کہ ان کی دوستی ناجائز تعلقات والی ہے۔ میں یہ نہیں بتا سکتی کہ شادی سے پہلے بھی ان کے تعلقات جسمانی تھے یا نہیں' یہ یقین سے کہتی ہوں کہ شادی کے بعد ان کے تعلقات میاں بیوی والے ہو گئے تھے"۔

میں نے اس سے کچھ باتیں پوچھیں جو اس نے صاف صاف بتا دیں۔ اس نے ایک عجیب بات سنائی۔ شادی کے بعد کنول اپنے خاوند کو اس کے گھر والوں سے الگ کر کے لے آئی تھی۔ یہ فلیٹ کنول کے بھائی نے اسے کرائے پر لے دیا تھا۔ کنول نے فلیٹ میں آتے ہی اس نوکرانی کو اپنے والدین کے گھر سے بلا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

کنول کا خاوند صبح گھر سے نکلتا اور رات کو واپس آتا تھا۔ فلیٹ میں آنے کے ایک ہفتے بعد مقتول کو کاروبار کے سلسلے میں لاہور جانا پڑا۔ وہ دوپہر کی ریل گاڑی سے گیا۔ کنول نوکرانی کو بتا کر کہیں چلی گئی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد واپس آئی اور نوکرانی کو بتایا کہ آج شام کا کھانا وہ ہوٹل میں ظفر کے ساتھ کھائے گی اور ظفر رات یہیں رہے گا۔

ظفر اس کے آشنا فوجی افسر کا نام تھا۔ کنول نے نوکرانی سے کہا کہ وہ بیڈ روم کو

بہت اچھی طرح صاف کرے اور شام کو کناٹ پیلس سے گلاب اور موتیے کے پھولوں کے چھ ہار لا کر بیڈ روم میں رکھ دے۔

سورج غروب ہونے کے کوئی ایک گھنٹہ بعد کنول نے خاص طور پر بناؤ سنگار کیا اور وہ کپڑے پہنے جن میں وہ دلہن بن کر اپنے سسرال آئی تھی۔

"تم کھانا کھا لینا رانی!" — اس نے نوکرانی سے کہا — "اُدھر سے (یعنی سسرال سے) کوئی آ جائے تو کہنا کہ کنول کی دو پرانی کلاس فیلو آ گئی تھیں اور وہ اسے زبردستی پکچر دیکھنے کے لئے لے گئی ہیں.... انہیں چلتا کرنا۔ واپسی پر ظفر میرے ساتھ ہوگا۔ اگر گھر میں کوئی ہُوا تو تم باہر برآمدے میں رہنا" — کنول نے اسے اپنی واپسی کا اندازاً وقت بتایا۔

ایک اور شبِ عروسی

کنول ڈیڑھ دو گھنٹوں بعد واپس آ گئی۔ ظفر اس کے ساتھ تھا۔ دونوں بیڈ روم میں چلے گئے اور سحر کے وقت باہر نکلے۔ ظفر ناشتہ کئے بغیر چلا گیا۔ کنول عروسی لباس میں تھی۔ اس نے نوکرانی کو پچیس روپے انعام دیا۔ اسے آج کا پانچ سو روپیہ کہہ لیں۔

نوکرانی نے بتایا کہ اگلی رات ظفر پھر آیا اور رات بارہ بجے کے بعد گیا تھا۔ پھر مہندر پال (مقتول خاوند) آ گیا۔ اس کے بعد ظفر دن کے وقت ہفتے میں ایک بار آتا اور جلد ہی چلا جاتا تھا۔ وہ نوکرانی کو ہر بار دس روپے دے جاتا تھا۔

"کنول بڑی ہوشیار لڑکی ہے" — نوکرانی نے بتایا — "اس نے اپنے سسرال کے بچّے سے لے کر بوڑھے تک کو اتنا خوش رکھا ہُوا تھا کہ وہ تو اس پر جان چھڑکتے تھے۔ ہنسنے اور ہنسانے والی لڑکی ہے۔ تیسرے چوتھے دن سسرال والوں کے گھر چلی جاتی تھی"۔

"خاوند کے ساتھ کس طرح رہتی تھی؟" — میں نے پوچھا — "کبھی کبھی رہتی ہوگی؟"

"نہیں مہاراج!" — نوکرانی نے جواب دیا — "گھر کی نوکرانی تو میں ہوں۔

مہندر جی کی جو خدمت مجھے کرنی چاہئے تھی وہ کنول کرتی تھی۔ وہ شام کو آتے تھے تو کنول ان کے جوتوں کے تسمے کھولنے بیٹھ جاتی تھی۔ مہندر جی اسے ہر روز منع کرتے تھے لیکن کنول زبردستی ان کے تسمے کھولتی تھی۔ وہ رات کو جتنی بھی دیر سے آتے کنول ان کے ساتھ کھانا کھاتی تھی۔ ان کے ساتھ ہو کر ان کے کپڑے تبدیل کراتی تھی۔ وہ صبح تیار ہو کر نکلتے تو کنول ان سے بغلگیر ہو کر انہیں رخصت کرتی تھی"۔

"لیکن رانی!" — میں نے کہا — "میں نے سنا ہے کنول کا خاوند تو مٹی کا مادھو تھا"۔

"مہاراج جی!" — رانی نے جواب دیا — "مٹی کا مادھو اگر کسی نے بنایا تھا تو اچھا ہی بنایا ہوگا لیکن مہندر جی کا کیا بتاؤں۔ جس طرح اس کے جسم میں غبارے کی طرح ہوا بھری ہوئی تھی اسی طرح اس کے دماغ میں بھی ہوا ہی بھری ہوئی تھی۔ ایک شام وہ ذرا جلدی گھر آ گیا۔ کنول کو اطلاع ملی تھی کہ اس کی ماں کو تیز بخار ہے۔ وہ مجھے یہ بتا کر چلی گئی کہ شام کو آ جائے گی۔ اس کے آنے سے پہلے مہندر آ گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ کنول کچھ دیر تک آ جائے گی۔ مہندر نے مجھے ہی کنول سمجھ لیا اور اپنے بازوؤں میں مجھے لے کر گود میں بٹھا لیا۔ پھر مجھے پانچ روپے دیئے"۔

"میرا تو خیال ہے کہ کنول اس سے نفرت کرتی ہوگی!" — میں نے کہا۔

"یہ گول گپا نفرت کے قابل ہی تھا" — نوکرانی نے کہا — "لیکن اس کے ساتھ کنول کا جو سلوک اور رویّہ تھا وہ آپ کو بتایا ہے۔ اس کے جواب میں مہندر جی کا یہ حال تھا کہ کنول کی پوجا کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ تنہائی میں کنول کے پاؤں بھی چاٹتے ہوں گے۔ کنول کے منہ سے بات نکلی اور مہندر جی نے پوری کی۔ وہ تو کنول کا غلام تھا۔ شادی کے کچھ ہی دنوں بعد کنول نے کہا کہ وہ علیٰحدہ رہنا چاہتی ہے تو مہندر جی نے اسے ایک بار بھی نہ کہا کہ ماں باپ سے الگ ہو جانا ٹھیک نہیں ہوتا۔ انہوں نے اگلے ہی روز کرائے کی رہائش کا بندوبست کر لیا اور اس فلیٹ میں آ گئے"۔

اس طرح کچھ اور واقعات اور باتیں سنا کر رانی نے بڑی اچھی طرح واضح کر دیا کہ کنول اپنے خاوند کے ساتھ غلامانہ حرکات کر کے اسے اُلّو بناتی رہتی تھی اور خاوند صحیح معنوں میں اس کا غلام بن کر اسے خوش رکھنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ یہ تو [illegible] رانی نے ثابت کر ہی دیا تھا کہ کنول اپنے خاوند کے ساتھ بے وفائی کر رہی تھی۔

"اب ایک اور ضروری بات بتاؤ رانی!" — میں نے پوچھا — "مہندر رات کو قتل ہُوا تھا۔ اُس دن کنول کہیں باہر گئی تھی؟"

"نہیں!" — اس نے جواب دیا — "اس سے ایک روز پہلے ظفر آیا تھا اور ایک گھنٹہ کنول کے ساتھ گذار گیا تھا۔ دوسرے دن مہندر جی صبح اپنے کام پر جانے کے لئے تیار ہو گئے تو کنول نے مجھے بتایا کہ وہ ان کے ساتھ جا رہی ہے اور آج دن وہ سسرال میں گذارے گی اور رات ہم دیر سے واپس آئیں گے۔ مہندر جی اسے اپنے گھر چھوڑ گئے۔ مجھے دوسرے دن خبر ملی تھی کہ مہندر جی کو کسی دشمن نے گولی مار دی ہے۔ میں نے گھر کو تالا لگایا اور وہاں چلی گئی"۔

"کنول کس حالت میں تھی؟" — میں نے پوچھا — "دکھاوے کے آنسو بہاتی ہو گی؟"

"نہیں مہاراج!" — اس نے جواب دیا — "اس کا رونا دکھاوے کا نہیں تھا۔ ایک دن میں وہ دو بار بے ہوش ہوئی۔ اس کے دانت بڑی مشکل سے اکھاڑے گئے تھے۔ دانتوں کے درمیان دو چھوٹے چمچ پھنسا دیئے گئے تھے۔ اسے ہوش آتی تھی تو اپنے بال نوچتی اور اپنے منہ پر زور زور سے دوہتڑ مارتی تھی۔ اس کا چہرہ گہرا لال ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کو بلا کر انجکشن دیا گیا تو اس کی حالت ذرا سی سنبھل گئی"۔

اس نے تفصیل سے سنایا کہ کنول کی حالت اتنی زیادہ بگڑ گئی کہ ڈاکٹر ایک دن اور ایک رات ان کے گھر میں رہا۔ میں نے سوچا کہ یہ نوکرانی اگر مبالغہ نہیں کر رہی تو یہ ایکٹنگ نہیں تھی۔ ایکٹنگ کی ایک حد ہوتی ہے۔

"وہ ابھی تک سنبھلی نہیں" — رانی نے کہا — "پہلے والی حالت نہیں.... اس نے تو رو رو کر بیہوش ہونا ہی ہے مہاراج! اس کا یہ خاوند اچھا تھا' بُرا تھا' چاہے بہت ہی بُرا تھا' کنول کو اب ساری عمر دوسرا خاوند نہیں مل سکتا۔ اس کی زندگی اس طرح اندھیر ہو گئی ہے کہ وہ دھتکاری گئی ہے۔ عورتیں اس سے دور ہٹ گئی ہیں۔ اس نے تمام زیور اتار پھینکا ہے اور اب نہایت معمولی قسم کے کپڑے پہنتی ہے۔ اسے تو اپنے گھر سے بھی پیار نہیں مل سکتا۔ یہ خوش قسمت ہے کہ اس کے بھائی سدھیر جی کے دل میں اس کا اتنا زیادہ پیار ہے کہ انہوں نے اسے کہا کہ اسی فلیٹ میں رہو اور وہ کرایہ دیتا رہے گا"۔

"ظفر آیا ہو گا!" — میں نے کہا۔

"کنول مہندر جی کے مرنے کے تیسرے روز فلیٹ میں آ گئی تھی" — رانی نے بتایا — "اس کے دو تین دن بعد ظفر آیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سدھیر جی صبح اپنے کاروبار پر چلے جاتے ہیں اور شام کو آتے ہیں۔ اس کے بعد ظفر دو بار آیا تھا"۔

"ان کی آپس کی باتیں تم نے نہیں سنیں؟"

"نہیں مہاراج جی!" — رانی نے جواب دیا — "وہ دونوں بیڈ روم میں بیٹھتے ہیں اور دروازہ اندر سے بند کر لیتے ہیں۔ میری ڈیوٹی یہ ہوتی ہے کہ پہرہ دوں۔ کوئی آ جائے تو انہیں اطلاع دوں۔ فلیٹ کے پیچھے لوہے کی گول سیڑھی ہے۔ ظفر ادھر سے آسانی سے بھاگ سکتا ہے لیکن ابھی تک ایک بار بھی ایسا نہیں ہُوا کہ کوئی آ گیا ہو۔ آنا بھی کس نے ہے! کنول کی بڑی گہری سہیلیاں بھی نہیں آتیں"۔

"اب ایک ایسی بات پوچھوں گا جو تم نہیں بتاؤ گی" — میں نے کہا — "جہاں تم نے کوئی راز چھپا نہیں رہنے دیا وہاں یہ راز بھی دے دو.... تم عقل والی عورت ہو۔ کیا تم نے یہ نہیں سوچا کہ کنول نے اپنے خاوند کو ظفر کے ہاتھوں مروایا ہو گا اور کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ ظفر کے ساتھ غائب ہو کر مسلمان ہو جائے گی اور اس کے ساتھ شادی کر لے گی؟ تم کنول کی رازدار ہو۔ میرا خیال ہے اس نے تمہیں یہ راز بھی دے دیا ہو گا"۔

"نہیں مہاراج!" — اس نے جواب دیا — "کنول نے مجھے ایسا کوئی راز نہیں دیا۔ میں نے خود بہت سوچا ہے کہ کنول کو کس نے بیوہ کیا ہے۔ گھوم پھر کر خیال یہیں پر آ کر رک جاتا ہے کہ کنول نے قتل کروایا ہے اور ظفر نے قتل کیا ہے۔ پھر میں نے یہ بھی سوچا کہ کنول نے اگر ظفر کے ساتھ ہی شادی کرنی تھی تو شادی سے پہلے اس کے ساتھ بھاگ جاتی۔ شادی کر کے خاوند کو قتل کرانے کی کیا ضرورت تھی؟....

"لیکن مہاراج جی! کبھی یہ شک بھی ہوتا ہے کہ ظفر قاتل نہیں اور کنول اپنے خاوند کو قتل نہیں کروانا چاہتی تھی۔ مجھے اس کا رونا' بیہوش ہو ہو جانا' اپنے بال اور چہرہ نوچنا یاد آتا ہے تو میں کہتی ہوں کہ کنول اپنے خاوند کو زندہ رکھنا چاہتی تھی.... ایک اور بات ہے مہاراج! بچی میں بھی نہیں' دنیا کو آنکھیں کھول کر دیکھا ہے لیکن آپ زیادہ عقل اور تجربے والے ہیں۔ آپ خود غور کریں۔ مہندر جی کے مرنے کے بعد ظفر کنول

کے پاس آتا رہا اور وہ بیڈ روم میں بیٹھے رہتے تھے۔ ہر بار دو گھنٹے تو ضرور بیٹھتے تھے پھر کنول دروازے تک اس کے ساتھ جاتی تھی۔ تین چار دن پہلے یعنی جس دن آپ ہمارے گھر آئے اس سے دو دن پہلے ظفر دن کے وقت آیا اور پہلے کی طرح کنول کے ساتھ بیڈ روم میں چلا گیا۔ کنول کی ذہنی حالت بہتر ہو گئی تھی....

"میں ڈرائنگ روم میں قالین پر صفائی والی مشین پھیر رہی تھی۔ کنول اور ظفر کو بیڈ روم میں گئے ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس کمرے سے کنول کی بڑی اونچی اونچی آوازیں آنے لگیں۔ وہ غصے میں بول رہی تھی۔ بیڈ روم کا دروازہ کھلا تو کنول غصے کی حالت میں کہہ رہی تھی' نکل جا یہاں سے۔ میں پھر کبھی تمہاری صورت نہ دیکھوں.... ظفر کہہ رہا تھا' ذرا ہوش میں آؤ کنول! لیکن کنول اس کی سن ہی نہیں رہی تھی۔ اُس نے کہا' اگر تو یہاں سے نہ نکلا تو میں پولیس کو بلا لوں گی۔ تجھے کس نے کہا تھا کہ مجھے بیوہ کر دے....

"اُس نے ظفر کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا اور دروازہ بند کر کے اتنی روئی کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ بیڈ روم میں پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی اور بچوں کی طرح روتی چلی گئی۔ میں نے اسے بہلانے کی کوشش کی۔ وہ اور زیادہ رونے لگی۔ وجہ پوچھی لیکن اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہ ہو....

"اس کی حالت بگڑتی ہی گئی۔ شام کو اس کے بھائی سدھیر جی آئے تو اس کی یہ حالت دیکھ کر ڈاکٹر کو لے آئے۔ ڈاکٹر نے انجکشن تو نہیں دیا' دوائیاں دی تھیں۔ اب کنول یہ دوائیاں لیتی ہے اور زیادہ وقت سوئی رہتی ہے۔ کل بھی ڈاکٹر آیا تھا۔ کنول کے ساتھ بند کمرے میں بہت دیر بیٹھا رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ کنول کی حالت بہتر ہو گئی تھی"۔

رانی نے ہمارا کام کر دیا تھا۔ انسپکٹر ٹینیسن دوسرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ میں نے اسے جا کر تفصیل سے سنایا کہ اس نوکرانی نے کیا بیان دیا ہے اور میں نے اس سے اور کیا کچھ اُگلوا لیا ہے۔ ٹینیسن اتنا خوش ہوا کہ اس نے جیب سے دس روپے نکالے اور کہا کہ اسے دے دو' ہم محکمے سے وصول کر لیں گے۔

میں نے رانی کے پاس آ کر اسے دس روپے دیئے اور اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہ کنول اور اس کے بھائی کو نہ بتائے کہ اس نے ہمیں کیا کیا بتایا ہے' بلکہ یہ کہے کہ دو

گھنٹے تو انتظار میں باہر بٹھائے رکھا پھر اندر بلا کر صرف دس منٹ گھر کی دو تین باتیں پوچھیں اور دس روپے خرچہ دے کر واپس بھیج دیا۔

خاوند اور آشنا کے درمیان پِسنے لگی

اس کے جانے کے بعد میں نے ٹینیسن کے ساتھ صلاح مشورہ کیا۔ اب کنول کے پڑوسیوں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب اس ڈاکٹر سے ملنا ضروری ہو گیا تھا جو کنول کا علاج کر رہا تھا۔ رانی نے بتایا تھا کہ خاوند کے قتل پر کنول کی ذہنی حالت بہت بُری ہوئی تھی پھر سنبھل گئی تھی پھر ظفر کے ساتھ اس کی کوئی گڑبڑ ہوئی تو اس کی ذہنی حالت پھر اتنی بگڑ گئی کہ ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔

ہم جب کنول کے گھر گئے تھے تو میں نے اس کے بھائی سے اس ڈاکٹر کا ایڈریس لے لیا تھا۔ میں اور ٹینیسن اسی روز اُس کے کلینک کے وقت کلینک میں جا پہنچے اور اپنا تعارف کرایا۔ وہ تقریباً پچاس برس عمر کا آدمی تھا۔ دماغی امراض کا ڈاکٹر تھا۔ ایک سرکاری ہسپتال میں ملازمت بھی کرتا تھا۔ وہ ہندو تھا۔

اُس وقت کے ڈاکٹروں کے متعلق کچھ بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ آج کے ڈاکٹر علاج معالجہ نہیں کاروبار کرتے ہیں۔ اس وقت کے ڈاکٹر صحیح معنوں میں مسیحا تھے۔ ان کے دلوں میں انسانوں کی ہمدردی تھی اور اپنے پیشے کے تقدّس کا خیال رکھتے تھے۔

آج کل دماغی امراض کے ڈاکٹر مریض سے صرف اتنا سنتے ہیں کہ اسے کوئی ذہنی تکلیف ہے۔ یہ نہیں پوچھتے کہ اس تکلیف کا باعث کیا ہے۔ ذرا سی بھی تحقیقات نہیں کرتے اور ذہنی سکون کی گولیاں (ٹرانکولائزر) دے دیتے ہیں۔ ہمارے وقتوں کے ذہنی امراض کے ڈاکٹروں کا انداز کچھ اور ہوتا تھا۔ پولیس کی طرح بیماری کی بڑی محنت سے تفتیش کرتے تھے۔ ذہنی سکون کی گولیاں تو وہ کسی ایسے ذہنی مریض کو دیتے تھے جو بے قابو ہو جاتا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ اُس دَور میں ذہنی مریض بہت ہی کم ہوتے تھے۔ ڈیپریشن کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں تھا۔ آج کل تو ہر تیسرا آدمی ڈیپریشن کا مریض ہے

عورتوں میں یہ مرض زیادہ ہے۔ ڈاکٹروں کی چاندی ہے۔

ہم اس ہندو ڈاکٹر کے پاس گئے اور مقتول کی بیوہ کا حوالہ دیا۔ یہ تو اسے معلوم تھا کہ کنول کا خاوند قتل ہو گیا ہے۔ پہلے دن کنول بیہوش ہوئی تو اسی ڈاکٹر نے وہاں جا کر اسے انجکشن دیا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ کنول پر صدمے کا اثر تھا۔

"اتنا تو ہم بھی سمجھتے ہیں کہ یہ صدمے کا اثر ہے" ــــ انسپکٹر ٹینیسن نے کہا ــــ "ہم قاتل کی تلاش میں ہیں۔ ہمیں شک ہے کہ آپ کی مریضہ کو معلوم ہے کہ قاتل کون ہے"۔

ہم نے دیکھا کہ ڈاکٹر کے ہونٹوں پر تبسم آیا اور وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"کل پرسوں کنول کے ساتھ آپ کی بڑی لمبی گفتگو ہوئی ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "اس کے بعد وہ خاصی بہتر ہو گئی تھی" ــــ میں نے اسے ہندو سمجھتے ہوئے کہا ــــ "ہمیں یہ بھی شک ہے کہ قاتل مسلمان ہے۔ اس قاتل کو زیادہ دیر آزاد نہیں رہنا چاہئے"۔

مجھے معلوم تھا کہ مسلمان کا لفظ سن کر ہی یہ ہندو بچھو کی طرح ڈنک کھڑا کر لے گا۔

"مریضہ کے ضمیر پر جرم کا بوجھ ہے" ــــ ڈاکٹر نے کہا ــــ "میں نے خود اس سے پوچھا تھا۔ خاوند کی موت کا صدمہ تو ہے ہی۔ ہندو عورت کے لئے یہ صدمہ دوہرا ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اسے ساری عمر بیوہ رہنا ہوتا ہے لیکن اس مریضہ کو میں نے کریدا تو پتہ چلا کہ یہ کوئی ایسا کام کر بیٹھی ہے جو اسے نہیں کرنا چاہئے تھا"۔

"کیا آپ نے محسوس نہیں کیا کہ اس نے اپنے خاوند کو قتل کروایا ہے؟" ــــ انسپکٹر ٹینیسن نے کہا ــــ "آپ تجربہ کار سائیکارٹسٹ ہیں اور ایک ذمہ دار ڈاکٹر ہیں۔ مجھے آپ سے صرف یہ توقع ہے کہ آپ ہمارے ساتھ تعاون کریں گے"۔

"میں تعاون سے انکار نہیں کر رہا" ــــ اس نے کہا ــــ "میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کو کس طرح سمجھاؤں کہ مریضہ کی ذہنی کیفیت کیا ہے۔ یہ انسانی فطرت کا عجیب سا مظاہرہ ہے جو بہت کم دیکھنے میں آتا ہے' یا یوں کہنا چاہئے کہ بہت کم لوگ اپنی اس قسم کی ذہنی حالت کا اظہار کرتے ہیں"۔

اس نے ڈاکٹری زبان میں بڑی لمبی بات کی۔ میں یہ سارا تجزیہ یا تشخیص پیش نہیں کر سکتا۔ اس نے کہا کہ یہ مریضہ اپنے خاوند کی موت اور اپنے آشنا کے درمیان اس طرح پس رہی ہے جیسے چکی کے دو پتھروں میں دانہ آ جاتا ہے۔ وہ دونوں کو زندہ دیکھنا چاہتی تھی لیکن اس کے آشنا نے اس کے خاوند کو درمیان سے اٹھا دیا۔ اس سے اس کی ذہنی حالت پاگل پن تک جا پہنچی۔

"کیا اس نے بتایا ہے کہ اس کا آشنا کون ہے؟"

"نہیں" ــــ ڈاکٹر نے جواب دیا ــــ "میں نے پوچھا بھی نہیں.... یہ بھی خیال رکھیں کہ کوئی انسان اس طرح اقبال جرم نہیں کیا کرتا۔ یہ اس دوائی کا اثر تھا جو میں نے اسے دی تھی"۔

"کیا آپ ہماری مدد کریں گے؟" ــــ میں نے کہا ــــ "یہ دوائی اسے پھر دیں"۔

"میرا خیال ہے اس دوائی کی ضرورت نہیں ہو گی" ــــ ڈاکٹر نے کہا ــــ "آپ اس کے پاس چلے جائیں" ــــ اس نے مجھے کہا ــــ "آپ اکیلے جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ برٹش آفیسر کے ساتھ شاید بے تکلف نہ ہو۔ اگر آپ کے ساتھ بات نہ کرے تو میں آپ کی مشکل آسان کر دوں گا"۔

ڈاکٹر کے ساتھ بڑی لمبی گفتگو ہوئی تھی جس سے رانی کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔ میرے لئے یہ بڑا عجیب کیس تھا۔

عجیب لڑکی' دو خاوند

میں اگلے روز صبح دس بجے کے قریب کنول کے گھر چلا گیا۔ اس کا بھائی گھر نہیں تھا۔ رانی مجھے اندر لے گئی اور ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ میں نے پہلی بار کنول کو دیکھا۔ ہر لحاظ سے خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی کا گہرا تاثر تھا اور اس کی چال مریضوں جیسی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ پولیس انسپکٹر ہیں" ــــ اس نے کہا ــــ "آپ یہاں آئے تھے۔ بھائی نے مجھے جگایا نہیں"۔

"میں نے ہی آپ کے بھائی کو روک دیا تھا" — میں نے کہا — "ایک تو آپ اتنے بڑے صدمے میں ہیں دوسرے میں آپ کو پریشان کرنا شروع کر دوں"۔

یہ تو رسمی باتیں تھیں۔ میں بچ بچ کر' آہستہ آہستہ اپنے کام کی باتوں کی طرف آنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس کے ڈاکٹر سے مل آیا ہوں اور ڈاکٹر نے مجھے خاص طور پر اس کے پاس بھیجا ہے۔

وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ میں نے پولیس سروس میں بعض ایسے پیشہ ور مجرموں سے اقبالی بیان صرف زبان کا جادو چلا کر لے لئے تھے جن کے متعلق مشہور تھا کہ ان کی ہڈیاں توڑ دو تو بھی نہیں بولتے۔ میں نے ان کے جسموں کو ہاتھ نہیں لگایا تھا لیکن اس لڑکی سے راز کی بات اُگلوانا مجھے ناممکن نظر آ رہا تھا۔ میں وہ ساری باتیں نہیں لکھ سکتا جو میں نے اس کے ساتھ کی تھیں۔ بہت لمبی گفتگو تھی۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ میرے انداز میں ہمدردی تھی' اپنائیت اور بے تکلفی تھی۔ بہرحال یہ میرے لئے بڑا ہی سخت امتحان تھا۔

اس کی ذہنی حالت بہت ہی کمزور ہو چکی تھی۔ میں نے جب اس کی اس کمزوری کو بھانپ لیا تو میں نے پیار پیار میں سیدھی باتیں شروع کر دیں۔ مثلاً میں نے ایک بات یہ کہی — "اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں رہا کہ آپ قاتل کو جانتی ہیں۔ قاتل کو جاننا اور پولیس سے چھپائے رکھنا جرم ہے۔ آپ کو اس جرم میں گرفتار کیا جا سکتا ہے"۔

"مجھے مشورہ دینے والا کوئی نہیں" — اس نے کہا — "میرا دماغ اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی"۔

"مجھے بتاؤ کنول!" — میں نے کہا — "بھول جاؤ کہ میں پولیس آفیسر ہوں۔ مجھے اپنا ہمدرد ہندوستانی سمجھو۔ اپنے آپ کو نہ جلاؤ۔ بتا دو.... ایک بات یاد رکھو کنول! یہ مشہور ہوتا چلا جا رہا ہے کہ کنول نے اپنے خاوند کو خود مروایا ہے.... میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ مسلمان ہے اور وہ آرمی آفیسر ہے"۔

اُس نے چونک کر میرے منہ پر نظریں گاڑ دیں۔

"یہ بھی مشہور ہو گیا ہے" — میں نے کہا — "کہ تم اس سے شادی کر لو گی۔ اسی لئے تم نے اپنے خاوند کو اس کے ہاتھوں مروایا ہے"۔

"میں نہیں وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے" — اس نے کہا — "میں اس

کے ساتھ شادی نہیں کروں گی"۔

"اس کا نام ظفر ہے نا؟" — میں نے کہا۔

"ہاں!" — اس نے جواب دیا — "ظفر.... وہ کیپٹن ہے۔ میں اسے گرفتار کرانا چاہتی ہوں"۔

اس کے یہ الفاظ سن کر میں اس کے سوا اور کوئی رائے نہیں دے سکتا تھا کہ یہ لڑکی دماغی توازن کھو بیٹھی ہے۔ میں آج بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ اُن دوائیوں کے اثرات تھے جو ڈاکٹر اسے دے رہا تھا۔ شعوری طور پر وہ بیدار نہیں تھی۔ اس کا ذہن لاشعور بیدار تھا۔ گناہ اور گناہوں کے اعتراف ذہنِ لاشعور میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ کوئی نشہ جب شعور کو سلا دیتا ہے تو انسان کا ذہنِ لاشعور اپنے دروازے کھول دیتا ہے۔ وہ جب ہوش میں آتا ہے یعنی جب اس کا شعوری ذہن بیدار ہوتا ہے تو اسے بالکل یاد نہیں رہتا کہ وہ نشے میں کیا باتیں کرتا رہا ہے۔

کنول نے اپنی اور ظفر کی محبت کا قصہ شروع کر دیا۔ اُس وقت وہ کالج میں تھرڈ ایئر میں پڑھتی تھی۔ ظفر فورتھ ایئر میں تھا۔ کالج ایک ہی تھا۔ وہیں ان کی محبت شروع ہوئی تھی اور یہ محبت پاک نہیں تھی۔ ظفر نے بی اے پاس کیا تو اسے فوج میں کمیشن مل گئی۔

یہاں میں یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جنگِ عظیم میں انگریزوں کو روپے پیسے کی ضرورت تھی۔ انہوں نے چندہ اکٹھا کرنے کے لئے "وار فنڈ" کا اجرا کیا تھا۔ ہندوستان کے جاگیرداروں' ہندو سیٹھوں اور بڑے ٹھیکیداروں نے اتنا زیادہ چندہ دیا تھا کہ انگریز حیران رہ گئے تھے۔ پھر یوں ہونے لگا کہ کسی سیٹھ وغیرہ نے اس درخواست کے ساتھ تیس چالیس ہزار روپیہ چندہ دیا کہ اس کے بیٹے کو فوج میں کمیشن دیا جائے۔ اس طرح انڈین آرمی میں افسروں کی یہ نسل شامل ہو گئی جسے عام زبان میں "وار فنڈ لفٹین" کہتے تھے۔ انہیں چند مہینوں کی ٹریننگ دے کر یونٹوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔ بعض باپ مزید چندہ دے کر بیٹے کو کسی ہیڈ کوارٹر میں بھجوا دیتے تھے جہاں محاذ پر جانے کا امکان نہیں ہوتا تھا۔

ظفر اسی نسل کا کیپٹن تھا۔ اس کا باپ دلی کے نواح کا رہنے والا جاگیردار تھا۔ اس نے سپلائی کور کے ہیڈ کوارٹر میں ظفر کی پوسٹنگ کروالی تھی۔ اس طرح ظفر اور کنول کی ملاقاتیں پھر سے شروع ہو گئیں۔ کنول کو وہ کہتا رہتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرنا

چاہتا ہے اور وہ مسلمان ہو جائے۔ کنول اسے وعدے پر ٹالتی رہتی تھی۔

پھر کنول کی شادی ہو گئی۔ پڑھنے والے شاید یقین نہ کریں لیکن یہ کنول کا اپنا بیان تھا کہ شادی کے بعد کنول نے اپنے خاوند کو صرف اس لئے اس کے ماں باپ سے الگ کر لیا تھا کہ ظفر کے ساتھ ملنے ملانے کا سلسلہ جاری رہے۔ کنول کی نوکرانی نے مجھے سنایا تھا کہ فلیٹ میں آتے ہی کنول نے ظفر کو رات کو بلایا تھا۔ کنول کا خاوند دو تین دنوں کے لئے چلا گیا تھا۔ کنول نے گلاب اور موتیے کے ہار منگوائے تھے جو اس نے بیڈ روم میں سجائے تھے۔ اس نے ظفر کے ساتھ اس کمرے میں ہنی مون منایا تھا اور ظفر سے کہا تھا کہ میرے اصلی خاوند تم ہو۔

ظفر نے کنول سے ضد شروع کر دی کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ چلے اور مسلمان ہو کر اس کے ساتھ شادی کر لے۔ کنول نے اسے کہیں کہہ دیا کہ وہ مہندر کے ساتھ شادی کر کے پچھتا رہی ہے لیکن جب تک یہ زندہ ہے وہ اس سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ کنول نے مجھے بتایا کہ اس نے ظفر سے کہا تھا کہ وہ بیوی جس کسی کی بھی بنا دی گئی وہ کچھ نہیں کہے گی لیکن دلی طور پر دوستی ظفر کے ساتھ رکھے گی۔

میرا خیال ہے کنول کی خوبصورتی اور اس کا زندہ دلانہ انداز ایسا طلسماتی تھا کہ ظفر کا اس کے پیچھے پاگل ہو جانا قدرتی امر تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ظفر بہت امیر باپ کا بگڑا ہوا بیٹا تھا اور بیوقوف بھی تھا۔

مہندر قتل ہو گیا تو کنول کو ذرا سا بھی شبہ نہ تھا کہ قاتل ظفر ہے۔ قتل کے بعد ظفر اس سے تین چار بار ملا اور اسے اپنے ساتھ بھاگ چلنے کو اکساتا رہا لیکن کنول اسے کہتی رہی کہ ابھی غائب ہو گئے تو ہم پر قتل کا الزام لگ جائے گا۔ آخری ملاقات میں ظفر اسے بتا بیٹھا کہ اسی نے اُس کے خاوند کو قتل کیا ہے۔

یہ سننا تھا کہ کنول بگڑ گئی۔ اس نے ایک بار بھی ظفر سے نہیں کہا تھا کہ وہ مہندر کو قتل کر دے۔

"میں اپنے خاوند کے ساتھ خوش تھی" ـــ کنول نے مجھے بیان دیتے ہوئے کہا ـــ "وہ میرا غلام بنا ہوا تھا۔ میرے اشاروں پر ناچتا تھا مگر ظفر نے مجھے بیوہ کر دیا۔ میں نے ظفر کو گھر سے نکال دیا۔ آپ کہیں گے کہ تمہارے سامنے بڑا اچھا راستہ تھا۔ مسلمان ہو جاتی اور ظفر کے ساتھ شادی کر لیتی.... لیکن میرے دل کی آواز کچھ اور

تھی۔ میں نے اس پر عمل کیا"۔

"یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے کنول!" ـــ میں نے کہا ـــ "میں ویسے پوچھ رہا ہوں۔ کیا ظفر کو سزائے موت یا عمر قید دلوا کر تمہیں خوشی ہو گی؟"

"نہیں!" ـــ اس نے کہا ـــ "یہ میرے لئے اتنا ہی بڑا صدمہ ہے جتنا اپنے خاوند کی موت کا ہے"۔

"کیا تم کورٹ میں یہ بیان دو گی؟" ـــ میں نے پوچھا۔

"اگر میں نے کورٹ میں بیان نہ دینا ہوتا تو آپ کو یہ راز کیوں دیتی؟" ـــ اس نے جواب دیا ـــ "میں کورٹ میں یہی بیان دوں گی"۔

اور وہ پاگل ہو گئی

اُسی روز ہم ظفر کے ہیڈ کوارٹر میں جا پہنچے اور کمانڈنٹ سے ملے۔ وہ انگریز کرنل تھا۔ اسے یہ واردات سنائی تو اس نے بھی کہا کہ عجیب لڑکی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ یہ لڑکی دماغی طور پر صحیح معلوم نہیں ہوتی۔

کرنل نے کیپٹن ظفر کو اپنے دفتر میں بلا لیا اور ہمارے حوالے کر دیا۔ ہم اسے اپنے ساتھ لے آئے۔

"کیپٹن ظفر!" ـــ میں نے اسے کہا ـــ "تمہارے لئے صرف ایک راستہ رہ گیا ہے۔ اقبال جرم کر لو۔ ہمارے پاس شہادت مکمل ہے"۔

پہلے تو اس نے پس و پیش کی پھر جب ہم نے اس کے آگے شہادت رکھ دی اور یہ بھی بتایا کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے اسے دیکھا تھا اور یہ سکھ اسے پہچانتا ہے تو وہ کچھ ڈھیلا پڑ گیا۔ ہم نے ٹیکسی ڈرائیور کو بلا کر ظفر کا چہرہ دکھا دیا تاکہ عدالت میں وہ کہہ سکے کہ اس نے ظفر کو سرکاری موٹر سائیکل پر آتے دیکھا' مقتول پر گولیاں چلاتے بھی دیکھا تھا۔

ظفر چونکہ امیر باپ کا بیٹا تھا اس لئے وہ سمجھتا تھا کہ دولت سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔ اُس کی کپتانی بھی خریدا ہوا عہدہ تھا۔ اس کے باپ نے قیمت وار فنڈ کو ادا کی

تھی۔ اب ہم نے اس کے آگے قتل کا الزام اور شہادت رکھ دی تو عقل سے اپنی وکالت کرنے کی بجائے اس نے رشوت پیش کی۔ اس نے کہا کہ میں بلینک چیک دستخط کر کے دے دوں گا' جتنی مرضی ہے رقم لکھ لینا۔

حقیقت یہ تھی کہ اس کے خلاف شہادت کمزور تھی لیکن وہ نہ سمجھ سکا کہ رشوت پیش کرنے کا مطلب ہوتا ہے اقبال جرم۔ ہم نے اسے حوالات میں بند کر دیا اور شہادت اکٹھی کرنے لگے۔ اس کے ہیڈ کوارٹر سے شہادت مل گئی کہ وہ واردات کی رات سرکاری فوجی موٹر سائیکل لے گیا تھا۔ رجسٹر پر اس کے دستخط موجود تھے۔ رجسٹر میں موٹر سائیکل کی واپسی کا وقت بھی درج تھا۔

38 بور کا ریوالور اس کا اپنا تھا۔ اس کا لائسنس تھا۔ فوج میں ذاتی ہتھیار مثلاً ریوالور یا شکاری بندوق' اپنے پاس نہیں رکھے جاتے' یہ آرمری میں رکھے جاتے ہیں اور ریکارڈ پر ہوتے ہیں۔ مالک اپنا اسلحہ لے جائے تو رجسٹر پر دستخط کر کے لے جاتا ہے۔ واپسی پر یہ پھر رجسٹر پر لکھا جاتا ہے۔

ہم نے ریکارڈ دیکھا تو واردات والے دن ظفر اپنا ریوالور لے گیا تھا اور اگلے روز رجسٹر میں واپسی لکھی ہوئی تھی۔ ریکارڈ میں پہلے چوبیس گولیاں تھیں۔ واپس بائیس گولیاں کی گئیں۔

ہم نے موٹر سائیکل' ریوالور' گولیاں اور ریکارڈ کی کاپیاں قبضے میں لے لیں۔

ہمارے پاس دو بڑے مضبوط اور قیمتی گواہ تھے۔ ایک تھی کنول اور دوسری اس کی نوکرانی۔ گواہوں کا ہمیں کوئی غم نہیں تھا' اس کا انتظام ہم کر سکتے تھے۔ میں اور انسپکٹر ٹینیسن نے ان دونوں عورتوں کو گواہی کے لئے تیار کر لیا اور ہم مقدمہ تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ کیپٹن ظفر ایک عام ملزم کی حیثیت سے ہماری حوالات میں بند تھا۔ اس کے باپ نے اوپر تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ ہم تک بھی پہنچا۔ اس کے پاس دولت تھی جو وہ ہر کسی کو پیش کرتا پھرتا تھا لیکن سوائے دھتکار کے اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہو رہا تھا۔

تقریباً ایک مہینے بعد مقدمہ عدالت میں گیا۔ علاقہ تھانیدار سب انسپکٹر رتن کمار کی گواہی ہوئی پھر میری اور انسپکٹر ٹینیسن کی گواہی ہوئی۔ اس کے بعد اس کیس کی سب

سے زیادہ اہم گواہ کنول گواہی دینے کے لئے عدالت میں آئی۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ اب کیس مجسٹریٹ کی کورٹ سے سیشن کورٹ میں آگیا تھا جہاں اس کا فیصلہ ہونا تھا۔

پبلک پراسیکیوٹر کنول سے گواہی دلوانے لگا تو کنول نے کچھ اور ہی حرکتیں اور باتیں شروع کر دیں۔ جج نے اسے وارننگ دی کہ وہ سیشن کورٹ میں کھڑی ہے اور قتل کے کیس کی گواہ ہے لیکن کنول نے ہنسنا شروع کر دیا۔ اس نے جو حرکتیں اور باتیں کیں وہ بہت ہی لمبی ہیں۔ میں ضرورت نہیں سمجھتا کہ یہ سب کی سب لکھی جائیں۔ مثال کے طور پر ایک بات سناتا ہوں۔ پبلک پراسیکیوٹر نے اسے کہا کہ آپ کا خاوند قتل ہو گیا تھا۔ کنول نے جواب دیا کہ میرے دو خاوند تھے۔ ایک قتل ہو گیا ہے اور دوسرا یہ اپیل دائر ہوئی۔ ہائیکورٹ نے صرف اتنی مہربانی کی کہ سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی۔

تقریباً اڑھائی سال بعد پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔ ظفر کا خاندان چونکہ انگریز نواز تھا بلکہ میں انہیں ہندو نواز بھی کہوں گا' اس خاندان میں سے کوئی ایک بھی فرد پاکستان نہیں آیا تھا۔ کنول کے متعلق کیس ختم ہونے کے ڈیڑھ دو مہینے بعد ہی پتہ چل گیا تھا کہ اسے آگرہ کے پاگل خانے میں بھیج دیا گیا تھا۔

* * *

آہ جو دل سے نکلی

دِلّی کی سی آئی اے (کرائمز برانچ) میں ایک انگریز ایس پی کہیں سے تبدیل ہو کر تعیّنات ہُوا۔ اس کا نام پی ایل تھامسن تھا لیکن پولیس کے ہم ہندوستانی افسر ہی نہیں بلکہ اس کے اپنے انگریز بھائی بند بھی اسے باسٹرڈ کہا کرتے تھے۔ باسٹرڈ کے معنی آپ جانتے ہوں گے.... وہ شخص جو اپنے باپ کا نہ ہو.... ایس پی تھامسن بہت ہی سخت طبیعت افسر تھا۔ اس کے ہونٹوں پر کبھی مسکراہٹ نہیں دیکھی گئی تھی۔ ڈسپلن کا اتنا سخت کہ اپنے ماتحتوں کو انسان نہیں سمجھتا تھا۔ کسی مجبوری کے تحت کسی سے ذرا سی کوتاہی ہو جاتی تو مجبوری کو تسلیم کر کے بھی معاف نہیں کرتا تھا۔ صرف ماتحتوں کے ساتھ ہی اس کا یہ رویّہ نہ تھا' وہ ڈی آئی جی اور آئی جی کے بھی گلے پڑ جایا کرتا تھا۔

اس کے اس رویّے کی وجہ یہ تھی کہ ہر وقت اپنے کام میں جُتا رہتا تھا۔ نہ دو منٹ آرام کرتا تھا نہ کسی کو آرام کرنے دیتا تھا۔ اردو بڑی صاف اور صحیح بولتا تھا۔ دو باتیں اپنے سٹاف کے افسروں سے ہفتے میں ایک بار ضرور کہتا تھا۔ ایک یہ کہ لوگوں کی عزت' جان اور ان کے گھروں کی حفاظت کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ واردات ہو جائے تو ملزموں کو پکڑنے کے لئے ہندوستانی تانگے کے گھوڑے کی طرح کام کرو۔

آپ نے اپنے ملک میں دیکھا ہو گا کہ تانگہ بان گھوڑے کو صبح تانگے کے آگے جوت کر رات کو کھولتے ہیں۔ سارا دن دوڑاتے رہتے ہیں۔ ایک درجن سواریاں مل جائیں تو تانگے میں بھر لیتے ہیں۔ گھوڑے کو پوری خوراک بھی نہیں دیتے۔ اسے چھوڑتے اُس وقت ہیں جب گھوڑا سڑک پر گر کر مر جاتا ہے۔ ہندوستان کے تانگہ بان بھی اپنے گھوڑوں کے ساتھ یہی سلوک کیا کرتے تھے۔

ایس پی تھامسن اپنے ماتحت افسروں کو تانگے کے گھوڑے بنا دیا کرتا تھا اور اس کی زبان کرخت تھی لیکن اس کے ماتحت کام کرنے والے افسر سراغرسانی اور تفتیش میں مہارت حاصل کر لیتے تھے۔ میں نے خود اس سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ سب سے زیادہ کار آمد سبق جو اس سے حاصل کیا وہ یہ تھا کہ مستقل مزاجی سے محنت جاری رکھو۔ ایسی مایوسی کو قبول ہی نہ کرو کہ ناکام ہو جاؤ گے۔ شک ذرا سا بھی ہو' اسے نظرانداز نہ کرو۔ شک باپ پر ہو تو اسے بھی شاملِ تفتیش کرو۔ تمہاری ساری ہمدردی مظلوم کے لئے ہو۔

اب دیکھئے کہ جس تھامسن کو ہم باسٹرڈ یعنی حرامی کہا کرتے تھے وہ کتنا انصاف پسند تھا اور اپنے فرض کو کس طرح اپنے مذہب کا فرض سمجھتا تھا۔ وہ صرف ایک سال سی آئی اے میں رہا تھا۔ اس ایک سال میں ہمیں کُندن کر گیا تھا۔

ایک روز اس نے مجھے اور میرے ایک انگریز ساتھی انسپکٹر ٹینیسن کو اپنے دفتر میں بلایا۔ اس واردات کی تفتیش ہم دونوں نے مل کر کی تھی۔ ایس پی تھامسن نے سامنے کھڑا ہے۔ اس نے ظفر کی طرف اشارہ کیا جو ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔

ظفر کے صفائی کے وکیل نے فوراً یہ نکتہ پیش کر دیا کہ یہ گواہ پاگل لگتی ہے اور اس کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ پبلک پراسیکیوٹر نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ کنول صدمے کے زیرِ اثر ہے' کچھ دلائل دیئے لیکن اس دوران کنول کا جو رویّہ تھا وہ دیکھ کر جج نے فیصلہ کیا کہ اس گواہ کا دماغی معائنہ کرایا جائے۔

یہ ایک اور چکر شروع ہو گیا۔ چار پانچ روز بعد عدالت میں دو سائیکارٹسٹ پیش ہوئے۔ ان میں ایک ہندو اور دوسرا انگریز تھا۔ وہ ڈاکٹر بھی پیش ہُوا جس کے کنول زیرِ علاج رہی تھی۔ ان سب نے متفقہ رائے دی کہ کنول کا دماغی توازن بُری طرح بگڑ چکا ہے۔ جج نے کنول کو گواہوں کی فہرست سے نکال دیا۔

ہمارے لئے یہ کیس ایک چیلنج بن گیا۔ ہمارے ہاتھ میں کنول کی نوکرانی تھی۔ اسے ہم نے پکا کر دیا بلکہ اس کے دماغ میں ہم نے اور بھی بہت کچھ بھر دیا۔ جن کا بیٹا قتل ہُوا تھا' انہوں نے ہمارے ساتھ بہت تعاون کیا۔ اس نوکرانی کو انہوں نے اچھی خاصی رقم دے دی تاکہ وہ ٹھیک ٹھاک گواہی دے دے اور اس نے گواہی بھی ٹھیک

ٹھاک دی۔ ہمارے پاس اور بھی خاصا مواد تھا مثلاً ملزم ان سوالوں کے جواب نہ دے سکا کہ وہ اپنے ہیڈ کوارٹر کا موٹر سائیکل کہاں لے گیا تھا اور اس نے ریوالور سے دو گولیاں کہاں فائر کی تھیں۔ اس کے صفائی کے گواہ بہت کمزور تھے۔

سیشن جج ہندو تھا۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ مقتول کے باپ نے اسے اچھا خاصا نذرانہ پیش کیا تھا کہ ملزم بری نہ ہو سکے۔ ہُوا بھی ایسے ہی کہ ملزم بری نہ ہو سکا۔ سیشن کورٹ سے اسے سزائے موت سنا دی گئی۔ ہائیکورٹ میں انسپکٹر ٹینیسن کو پیغام بھیجا کہ احمد یار خان کو ساتھ لے کر آؤ۔ آپ کی دلچسپی کے لئے بتاتا ہوں کہ ٹینیسن نے میرے پاس آ کر کس طرح مجھے بتایا کہ ایس پی نے بلایا ہے۔

"Hey Malik! He wants us."

"Who?"

"That Bastard!"

میں ہنستا ہُوا اُٹھ کھڑا ہُوا۔ میں ڈرا ہُوا تھا کہ تھامسن نے ہماری کوئی غلطی پکڑ لی ہو گی۔ اس کے دفتر میں داخل ہوئے تو اس نے ہمیں بٹھا کر ایک کاغذ ہماری طرف سرکایا۔ ہم دونوں نے دیکھا۔ یہ ایک مسلمان عورت کی درخواست تھی۔ اس کا جوان بیٹا اینٹوں کے بھٹے کی آگ میں گر کر اور جل کر مر گیا تھا۔ دو مہینے گزر گئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس درخواست پر کسی بڑے افسر کے ریمارکس یا حکم لکھا ہوا نہیں تھا کہ اس درخواست کی انکوائری یا تفتیش کرائمز برانچ کرے۔ باقاعدہ حکم کے بغیر سی آئی اے کوئی کیس اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتی۔

تھامسن نے ہمیں بتایا کہ یہ درخواست اسے براہِ راست ایک معزز شخص نے دی ہے۔ یہ عورت متعلقہ تھانے میں جاتی رہی۔ اسے شک تھا کہ اس کا بیٹا خود بھٹے کی آگ میں نہیں گرا بلکہ اسے گرایا گیا تھا۔ تھانیدار اس عورت کو یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ وہ تفتیش کر چکا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس کا بیٹا اتفاقیہ جلتے ہوئے بھٹے میں گرا تھا۔

جس معزز شخص نے ایس پی تھامسن کو اس عورت کی درخواست دی تھی' اس کا تعلق ہائی کورٹ سے تھا۔ مجھے آج اچھی طرح یاد نہیں کہ وہ ہائی کورٹ میں ریڈر تھا یا ایڈووکیٹ تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست کی معرفت تھامسن سے ملاقات کی تھی۔ اس کا یہ دوست اینگلو انڈین تھا اور پولیس کا ڈی ایس پی تھا۔ اس شخص نے ایس پی تھامسن

کو بتایا تھا کہ وہ بھٹے کے مالک کو ذاتی طور پر جانتا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ بھی اس نوجوان کی موت کو مشکوک سمجھتا ہے۔

تھامسن نے درخواست رکھ لی۔

"میں اس تھانے کے ایس ایچ او کے ساتھ فون پر بات کر چکا ہوں"— ایس پی تھامسن نے ہمیں بتایا— "اس کی باتوں سے مجھے بھی کچھ شک سا ہو گیا ہے۔ تم دونوں باقاعدہ تفتیش کرو۔ یہ نہیں دیکھنا کہ یہ عورت غریب ہے یا امیر ہے اور کون کیا ہے۔ اگر ایس ایچ او نے دانستہ کوتاہی کی ہے یا بغیر تفتیش اسے اتفاقیہ موت لکھ دیا ہے تو اسے گرفتار کر کے مجھے تحریری رپورٹ دو"۔

اس نے حسبِ معمول اور حسبِ عادت بڑی سخت ہدایات دیں جن کی ہمیں ضرورت نہیں تھی۔ میں اور ٹینیسن وہاں سے آ گئے اور تفتیش کا باقاعدہ پلان بنا لیا۔ سب سے پہلے ہم نے متعلقہ تھانے جا کر ایس ایچ او سے پوری معلومات لینی تھیں۔

آج اپنی ڈائری سے یہ کیس نکالا ہے تو وہ ساری فضا میری آنکھوں کے سامنے آ گئی ہے جو ایک انگریز ایس پی نے مجھے دکھائی تھی۔ آج ہم آزاد ہیں۔ ہمارا ملک اسلامی ملک ہے۔ اسلام کے عدل و انصاف کے نظام کی تعریف یورپ کے اُن قانون دانوں نے بھی کی ہے جنہوں نے اپنے ملکوں کے لئے قانون بنائے تھے لیکن ہماری اسلامی مملکت میں عدل و انصاف کی جو مٹی پلید ہو رہی ہے' وہ آپ سب دیکھ رہے ہیں۔ دن دیہاڑے قتل ہوتے ہیں۔ لوگ جلوس نکالتے ہیں' مظاہرے کرتے ہیں' اخباروں میں خبریں چھپتی ہیں۔ گورنر صاحب کہتے ہیں کہ قاتلوں کو دو دنوں میں گرفتار کر لیا جائے گا۔ وزیرِاعلیٰ صاحب حکم دیتے ہیں کہ قاتلوں کو گرفتار کیا جائے لیکن پولیس کوئی کارروائی نہیں کرتی۔ جنرل ضیاء کے دَورِ حکومت میں بعض مقتولوں کے پسماندگان جنرل ضیاء تک بھی پہنچے۔ جنرل صاحب حکم بھی دے دیتے تھے لیکن علاقہ تھانیدار کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی تھی۔ اب تو ہماری پولیس نے پاکستان کو اپنی ریاست بنا لیا ہے۔ اگر آپ کسی کو قتل کرنا چاہتے ہیں تو علاقہ تھانیدار کے ساتھ پہلے سودا طے کر لیں۔

میں آپ کو ایک انگریز کا عدل و انصاف سنا رہا ہوں جس نے دفتری کارروائیوں میں الجھنے سے پہلے حکم دے دیا کہ اس عورت کا شک رفع کر دیا اس کے بیٹے کے قاتل کو

پکڑو۔ ہمارے آج کے پولیس افسر یہ کہانی پڑھیں گے تو کہیں گے کہ یہ تو پولیس کے ضابطے اور قانون کے خلاف ہے کہ کرائمز برانچ کا ایک ایس پی اوپر کے حکم کے بغیر ہی ایک کیس کی تفتیش کا حکم دے دے۔

ماں کے چہرے پر اُداسی

میں اور انسپکٹر ٹینیسن اس علاقے کے تھانے میں گئے جس علاقے میں بھٹہ تھا۔ تھانیدار ایک مسلمان تھا جو انبالہ کا رہنے والا تھا.... سب انسپکٹر صداقت علی خان.... جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو اس نے ہندوستان میں ہی رہنا پسند کیا تھا۔ اس کا سارا خاندان وہیں رہ گیا تھا۔ صداقت علی خان عیش موج کرنے والا آدمی تھا۔ تجربہ کار تھانیدار تھا لیکن چار پیسے مل جاتے تو بچ بچا کر ڈنڈی مار جاتا تھا۔ وہ کسی بھوکے ننگے خاندان کا فرد نہیں تھا۔ اس کے خاندان کی پوزیشن بہت اچھی تھی اور یہ اثر و رسوخ والا خاندان تھا۔

ہمیں اپنے تھانے کے احاطے میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ ہمارے استقبال کو دوڑا آیا اور اپنے دفتر میں لے گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم کیوں آئے ہیں۔

"اس عورت نے تو میرا ناک میں دم کر رکھا ہے"— صداقت علی نے کہا— "وہ بیچاری اپنی جگہ سچّی ہے۔ اس کا جوان بیٹا مارا گیا ہے۔ وہ تو خدا کے خلاف بھی درخواست دے گی۔ میں نے اسے مطمئن کرنے کی بہت کوشش کی ہے لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوپر تک پہنچ گئی ہے اور آپ صاحبان کو زحمت دی ہے"۔

"ماں تو مطمئن نہیں ہو گی"— میں نے کہا— "آپ ہمیں مطمئن کر دیں۔ آپ نے جو تفتیش کی ہے اس کی فائل دکھا دیں اور زبانی بتا دیں کہ یہ کیا معاملہ ہے"۔

وہ فائل لے آیا جس میں اس نے تحقیقات کی کارروائی لکھی تھی۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ فلاں تاریخ فلاں شخص اس کے پاس یہ رپورٹ لے کر آیا کہ اس کا ایک ملازم جلتے ہوئے اینٹوں کے بھٹے میں پاؤں پھسلنے کی وجہ سے گر پڑا اور مر گیا ہے۔ پھر اس نے لکھا تھا کہ وہ موقعہ پر پہنچا اور لاش دیکھی جو ناقابلِ شناخت حد تک جل چکی

تھی۔ پھر اس نے تین آدمیوں کے بیان لئے تھے۔ سب نے کہا کہ متوفی پاؤں پھسل جانے سے آگ میں گر پڑا۔ اس طرح اس تھانیدار نے ضابطے کی کارروائی مکمل کر کے اس حادثے کو اتفاقیہ یا حادثاتی موت قرار دے دیا۔

"خان صاحب!" — میں نے کہا — "آپ نے زبانی جو معلومات اکٹھی کی تھیں وہ ہمیں سنا دیں"۔

پہلی بات یہ معلوم ہوئی کہ متوفی جمیل احمد بیوہ ماں کا بیٹا تھا۔ اس نے اڑھائی تین سال پہلے میٹرک پاس کیا تھا اور اس بھٹے کے مالک کے پاس ملازم ہو گیا تھا۔ بھٹے کا مالک خلیل الرحمان ذرا بڑے پیمانے کا ٹھیکیدار تھا۔ وہ تعمیراتی کام کرتا تھا' گورنمنٹ کنٹریکٹر اور سپلائر بھی تھا اور اس کا یہ بھٹہ بھی تھا جہاں اینٹیں بنتی تھیں۔

میں نے آپ کو اپنی کہانیوں میں کئی بار سنایا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم نے ہندوستانیوں کی قسمت کے دروازے کھول دیئے تھے۔ ایک تو وہ ہندوستانی تھے جو فوج میں بھرتی ہو گئے' دوسرے زراعت پیشہ تھے جو اس طرح خوشحال ہو گئے کہ اناج فوجوں کے لئے حکومت خرید لیتی تھی اور قیمت بھی اچھی دیتی تھی۔ فوجوں کو سامان کی سپلائی کے ٹھیکے لوگوں کو ملنے لگے۔ تعمیراتی کام بھی بہت بڑھ گیا۔ ایک تو سرکاری تعمیرات تھیں اور دوسری تعمیرات لوگوں کی ذاتی تھیں۔ روپیہ پیسہ آ جانے کی وجہ سے لوگوں نے مکان بنانے شروع کر دیئے اور جو زیادہ امیر ہو گئے تھے' انہوں نے کوٹھیاں بنانی شروع کر دیں۔

یہ ٹھیکیدار خلیل الرحمان بھی جنگِ عظیم کا بنایا ہُوا ٹھیکیدار تھا۔ ہم نے سب انسپکٹر صداقت علی خان سے اس ٹھیکیدار کی فیملی بیک گراؤنڈ اور کردار وغیرہ کے متعلق پوچھا تو وہ ہمیں کچھ نہ بتا سکا۔

"کیا متوفی جمیل بھٹے پر ملازم تھا؟" — انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا — "اگر بھٹے کا ملازم تھا تو اس کے ذمے کیا کام تھا؟"

"میں نے یہ نہیں پوچھا تھا" — صداقت علی نے جواب دیا — "میں نے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی البتہ یہ یقین کر لیا تھا کہ وہ بھٹے کا ملازم تھا"۔

"آپ کو ذرا سا بھی شک نہیں ہُوا تھا؟" — انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا اور کہا — "ہو سکتا ہے کسی کے ساتھ مرنے والے کی دشمنی ہو اور اسے دھوکے سے بھٹے کی آگ

میں دھکا دیا گیا ہو"۔

"میں نے فائل میں نہیں لکھا" — اس نے جواب دیا — "لیکن معلوم کیا تھا۔ کوئی دشمنی کا اشارہ نہیں ملا"۔

میں نے نوٹ کیا کہ صدقت علی خان نے یہ جواب دیا تو اس میں وہ خود اعتمادی اور بولنے کے انداز میں پختگی نہیں تھی جو اس کے لہجے اور انداز میں پائی جاتی تھی۔ اس کی زبان کچھ ہلی ہوئی لگتی تھی۔

"صداقت بھائی!" — میں نے کہا — "ہم تفتیش کے لئے آئے ہیں۔ اگر کوئی شک شبے والی بات ہے تو ہمیں بتا دیں یا یہ کہہ دیں کہ آپ نے تفتیش میں اتنی دلچسپی نہیں لی جتنی لینی چاہئے تھی۔ یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ چونکہ وہ ماں ہے اس لئے وہ آپ کو پریشان کرتی رہی ہے"۔

صداقت علی بے چین سا ہو گیا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اسے اپنی غلطی یا کوتاہی کا احساس ہے۔ اگر میرے ساتھ انگریز انسپکٹر نہ ہوتا تو صداقت میرے ساتھ بے تکلفی سے بات کرتا۔ یہ لوگ انگریز افسروں سے مرعوب ہو جایا کرتے تھے۔ بہرحال ابھی کوئی رائے قائم کرنا قبل از وقت تھا۔ انسپکٹر ٹینیسن نے اسے کہا کہ وہ ہمیں اس عورت کے گھر تک پہنچا دے۔ اس کا ایڈریس تو تھا لیکن پرانی دِلّی میں کسی کا مکان تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔

صداقت علی نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو ہمارے ساتھ بھیج دیا۔ معلوم ہُوا کہ صرف یہ ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا جو اس عورت کے گھر سے واقف تھا۔

"ایک کام کرنا خان!" — انسپکٹر ٹینیسن نے صداقت سے کہا — "ٹھیکیدار خلیل الرحمان کو اطلاع دے دو کہ وہ تھانے میں آ جائے۔ ہم واپس تھانے میں آئیں گے"۔

ہیڈ کانسٹیبل نے ہمیں اس عورت کے گھر پہنچا دیا اور ہم نے اسے کہا کہ وہ واپس چلا جائے۔ دروازے پر دستک دی تو چودہ پندرہ سال عمر کا ایک لڑکا باہر آیا۔ میں نے اپنا اور انسپکٹر ٹینیسن کا تعارف کرایا اور لڑکے سے کہا کہ اندر جا کر کہو کہ آپ نے جو درخواست دی تھی ہم اس سلسلے میں آئے ہیں۔

لڑکا فوراً اندر گیا اور دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ ایک ادھیڑ عمر عورت باہر آئی۔ شکل و صورت اور ڈیل ڈول سے پتہ چلتا تھا کہ مڈل کلاس کی معزز عورت ہے۔

ابھی تک اس کے چہرے کی خوبصورتی باقی تھی۔ اس سے پہلے جو لڑکا باہر آیا تھا وہ بھی خوبصورت تھا۔ عورت کے چہرے پر اداسی تھی۔ وہ ہمیں اندر لے گئی۔

یہ مڈل کلاس کا اچھا اور صاف ستھرا گھر تھا۔ عورت نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھایا۔ ہمارے منع کرنے کے باوجود چائے بنا کر لے آئی۔

بیٹا ماں کے خواب میں

سب سے پہلے تو یہ عورت بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی اور اپنے بیٹے کو یاد کرتی رہی۔ اس کے پاس ایک ہی بیٹا رہ گیا تھا جس کی عمر چودہ پندرہ سال تھی۔ ہماری دستک پر یہی لڑکا باہر نکلا تھا۔ اس عورت کے خاوند کو فوت ہوئے پانچ سال گزر گئے تھے۔ اس کا ایک بھائی اسے کچھ پیسے دے دیا کرتا تھا۔ یہ مکان اس کا اپنا تھا۔ جمیل احمد اس کا بڑا بیٹا تھا جسے اس نے دس جماعتیں پڑھا کر اس ٹھیکیدار کے پاس ملازم کرا دیا تھا۔ یہ بیٹا بھی نہ رہا۔ اس عورت نے اپنا نام راشدہ بتایا۔

"آپ یہ بتائیں" — میں نے پوچھا — "آپ کو یہ شک کیسے ہُوا ہے کہ آپ کے بیٹے کو دھکا دے کر آگ میں گرایا گیا تھا اور وہ خود نہیں گرا"۔

"میرا بیٹا جمیل ہر رات خواب میں آتا ہے" — راشدہ نے جذباتی لہجے میں جواب دیا — "ہر رات ایک ہی بات کہتا ہے کہ میرے قاتلوں کو پکڑو، میں خود نہیں گرا تھا"۔

"کیا وہ یہ نہیں بتاتا کہ اسے دھکا کس نے دیا تھا؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں!" — راشدہ نے جواب دیا — "میں پوچھتی ہوں تو بھی نہیں بتاتا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ خود نہیں گرا"۔

یہ تو ماں کے جذبات تھے جن کا اظہار وہ اس طرح کر رہی تھی کہ اس کا بیٹا ہر رات اسے خواب میں ملتا ہے۔ میں نے یا انسپکٹر ٹینیسن نے اسے ایسی بات نہیں کہی کہ یہ اس کا وہم ہے اور اس کے جذبات ہیں۔ میں اُس وقت تک قتل کی بے شمار وارداتوں کی تفتیش کر چکا تھا اور ایسی بہت سی مائیں میرے سامنے آئی تھیں جن کے

جوان بیٹے قتل ہو گئے تھے۔ وہ سب ایسی ہی باتیں کرتی تھیں۔

ہم دونوں پولیس آفیسر اس کے جذبات کا ساتھ دیتے رہے اور ہم نے اسے یہی تاثر دیا کہ وہ جو کچھ بھی کہہ رہی ہے ٹھیک کہہ رہی ہے لیکن ہم حقائق معلوم کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہم قاتل کو پکڑ سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دکھیاری ماں کی باتیں سن کر مجھے یہ خیال آیا تھا کہ اس کے بیٹے کی موت حادثاتی ہے اور یہ اس غم زدگی کے اثرات ہیں کہ بیٹے کی موت کا ذمہ دار کسی نہ کسی کو ٹھہرا رہی ہے، مگر ذرا سا بھی اشارہ نہیں دے رہی کہ اسے کس پر شک ہے۔

ہمارا یہ فرض تھا کہ اس کیس کو ٹالنا نہیں اور پوری محنت کرنی ہے اور زمین کے دُور نیچے تک اتر جانا ہے۔ یہ میرا تجربہ تھا کہ بعض اوقات حادثاتی موت جس کے متعلق ڈاکٹر بھی اور ہر کوئی یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ یہ موت اتفاقیہ یا قدرتی ہے، وہ قتل کی واردات نکلتی ہے، مثلاً کچھ زہر ایسے ہیں جو کسی کو روزانہ دودھ، چائے یا سالن وغیرہ میں تھوڑے تھوڑے دیتے رہو تو وہ دو تین مہینوں بعد کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ مر جاتا ہے۔ اس لڑکے کی موت بھی قتل کی واردات ہو سکتی تھی۔

ہم نے اس سے حقائق معلوم کرنے شروع کئے تو اس ٹھیکیدار کا ذکر آ گیا جس کے پاس جمیل ملازم تھا۔ پتہ چلا کہ جمیل تین سال سے وہاں ملازم تھا۔ میں نے پوچھا کہ وہ بھٹے پر کیا کام کرتا تھا۔

"میرا بیٹا بھٹے پر ملازم نہیں تھا" — راشدہ نے جواب دیا — "وہ ٹھیکیدار کا کلرک تھا یا منشی کہہ لو۔ ٹھیکیدار کے گھر بھی جاتا تھا اور گھر کی کوئی ضرورت ہوتی تو وہ پوری کرتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی اور بھی تھی۔ ٹھیکیدار کی بیٹی کالج میں پڑھتی ہے۔ اس کے لئے باپ نے تانگہ لگوایا ہُوا ہے۔ میرا بیٹا صبح اس لڑکی کے ساتھ کالج تک جاتا تھا اور چھٹی کے وقت کالج سے اُسے گھر لاتا تھا۔ ٹھیکیدار اس کام کی اسے الگ تنخواہ دیتا تھا۔ پانچ چھ دنوں سے وہ بھٹے پر جا رہا تھا۔ کہتا تھا کہ بھٹے کا منشی چھٹی لے کر چلا گیا ہے۔ اس کے آنے تک جمیل نے بھٹے پر حساب کتاب کرنا تھا"۔

"اس کا مطلب یہ ہُوا" — انسپکٹر ٹینیسن نے کہا — "کہ ٹھیکیدار کو آپ کے بیٹے پر بہت ہی اعتماد تھا"۔

"ہاں جی!"— راشدہ نے کہا— "یہ اعتماد کی ہی بات تھی کہ خلیل الرحمان میرے بیٹے کو اپنی لڑکی کے ساتھ بھیجتا تھا۔ اعتماد کی وجہ یہ ہے کہ ٹھیکیدار ہمارا دُور کا رشتہ دار بھی ہے۔ اس جنگ سے پہلے ٹھیکیدار کا صرف بھٹہ تھا جس کی کوئی آمدنی نہیں تھی۔ اتنے مکان بنتے ہی کہاں تھے۔ ہندو اور سکھ مکان بناتے تھے تو ہندوؤں اور سکھوں کے بھٹوں سے اینٹیں لیتے تھے۔ جنگ شروع ہوئی تو خلیل الرحمان کا بھٹہ بھی چل پڑا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے ٹھیکیدار بن گیا۔ آدمی ہوشیار اور چالاک ہے۔ ہر کسی کو خوش رکھنا جانتا ہے۔ اس کا کاروبار بڑی جلدی پھیل گیا۔ دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ اس نے نئی دلّی میں کوٹھی بنا لی۔ میرا خاوند فوت ہو گیا تھا۔ ٹھیکیدار نے میرے ساتھ یہ ہمدردی کی کہ جمیل نے میٹرک پاس کر لی تو ٹھیکیدار نے اسے اپنے پاس رکھ لیا اور اچھی تنخواہ دینے لگا۔ یہ تو آپ کو بتایا ہے کہ فوت ہونے سے پہلے وہ بھٹے پر جاتا تھا کیونکہ وہاں کا منشی چھٹی چلا گیا تھا اور ٹھیکیدار کسی اور پر اعتبار نہیں کرتا تھا۔ جمیل جل کر فوت ہو گیا تو ٹھیکیدار نے مجھے پانچ ہزار روپیہ پیش کیا تھا۔ میں نے یہ رقم یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ میں اپنے بیٹے کی قیمت نہیں لوں گی"۔

"آپ کو ٹھیکیدار پر تو شک نہیں ہو گا"— انسپکٹر ٹیننسن نے کہا۔

"اس پر تو شک نہیں ہونا چاہئے"— راشدہ نے جواب دیا— "لیکن ٹھیکیدار کے خلاف مجھے شکایت ضرور ہے"۔

"وہ کیا؟"

"میں نے پانچ ہزار کی رقم قبول نہ کی"— اس نے کہا— "میں نے اسے کہا کہ مجھے تھانے لے چلے کیونکہ مجھے شک ہے کہ میرے بیٹے کو آگ میں جلایا گیا ہے۔ ٹھیکیدار نے کہا کہ ایسے فضول شک نہ کرو' خواہ مخواہ تھانے میں خراب ہوتی پھرو گی۔ سب کہتے ہیں کہ تمہارا بیٹا پھسل کر گرا تھا۔ میں نے کہا کہ میں خود تھانے چلی جاؤں گی۔ ٹھیکیدار نے پھر مجھے سمجھایا بجھایا اور آٹھ ہزار روپیہ پیش کیا جو میں نے قبول نہ کیا۔ ٹھیکیدار کو غصہ آ گیا اور کہنے لگا کہ تم خود بھی خراب ہونا چاہتی ہو اور مجھے بھی خراب کرو گی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ تم اس ضد سے باز نہ آئیں تو دوسرے بیٹے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ چھوٹے بیٹے کو میٹرک پاس کر لینے

دو میں اسے جمیل کی طرح اپنے پاس رکھ لوں گا"۔

"ایک بات سوچ لیں"— میں نے کہا— "اگر آپ کو ٹھیکیدار پر شک ہے تو ہمیں بتائیں یا صاف کہہ دیں کہ ٹھیکیدار پر آپ کو شک نہیں"۔

"ٹھیکیدار پر شک کی کوئی وجہ نہیں"— راشدہ نے کہا— "اتنے امیر کبیر آدمی کی ہمارے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے' بلکہ اسے تو جمیل پر اتنا اعتماد تھا کہ اپنی جوان بیٹی کو میرے بیٹے کے ساتھ بھیجا کرتا تھا"۔

"یہ بھی دشمنی کی وجہ ہو سکتی ہے"— میں نے کہا— "اس کی لڑکی جوان ہے اور آپ کا بیٹا بھی جوان تھا۔ ہو سکتا ہے ٹھیکیدار نے ان دونوں کو قابلِ اعتراض حالت میں دیکھا ہو یا یہ دیکھا ہو کہ ان دونوں میں کچھ اور ہی قسم کی بے تکلفی ہے"۔

"میں یہ نہیں مان سکتی"— راشدہ نے کہا— "میرا بیٹا اتنا ہوشیار اور چالاک نہیں تھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو ٹھیکیدار مجھ سے گلہ کرتا اور جمیل کو نوکری سے نکال دیتا۔ اسے معلوم تھا کہ ہمارے لئے یہی سزا بہت ہے کہ ہماری روزی بند ہو جائے۔ آپ پولیس کے افسر ہیں' ایسی باتیں باہر سے معلوم کر سکتے ہیں"۔

یہ خاص طور پر ذہن میں رکھیں کہ ٹھیکیدار نے راشدہ کو پانچ ہزار روپیہ پیش کیا تھا پھر یہ رقم آٹھ ہزار کر دی۔ آج کل پانچ یا آٹھ ہزار کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہی' میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں اُس وقت کا ایک ہزار آج کے ایک لاکھ کے برابر تھا۔

راشدہ نے یہ رقم قبول نہ کی اور وہ تھانے چلی گئی۔ تھانیدار نے اسے کہا کہ اسے کوئی شک ہے تو گواہ ساتھ لائے اور اپنا شک ثابت کرے۔ ہم جانتے تھے کہ تھانیدار ایسی بات اس صورت میں کہا کرتے ہیں جب وہ کسی کو ٹالنا چاہتے ہوں۔ راشدہ گواہ کہاں سے لاتی' پھر بھی وہ روتی اور بھٹکتی رہی اور ہر رات خواب میں بیٹے کو دیکھتی رہی۔ اس کے پاس یہی ایک شہادت اور یہی ایک ثبوت تھا کہ اس کا بیٹا خواب میں اسے کہتا تھا کہ وہ آگ میں خود نہیں گرا تھا بلکہ اسے گرایا گیا تھا۔

دو مہینے گزر گئے۔ جمیل کا چالیسواں ہُوا تو ٹھیکیدار نے اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ راشدہ تین چار مرتبہ پھر تھانے گئی۔ اس نے بتایا کہ تھانیدار کبھی تو اسے بڑے پیار اور محبت سے سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ یہ اس کا وہم ہے اور کبھی غصے سے اسے تھانے سے نکال دیتا تھا۔

جس آدمی نے اس کی درخواست ایس پی تھامسن تک پہنچائی تھی وہ اس کے خاوند کا دوست تھا۔ ایک روز یہ دوست راشدہ کے گھر آگیا تو راشدہ نے اسے بتایا کہ کیا شک ہے۔ دوست نے دوستی کا حق ادا کرنے کی خاطر خود ہی درخواست لکھی اور اپنے ڈی ایس پی اینگلو انڈین دوست کو دے دی اور اس ڈی ایس پی نے درخواست تھامسن تک پہنچا دی۔

بھٹے کی آگ

اس غم زدہ ماں سے ہمیں کوئی ایسی بات معلوم نہ ہوئی جس سے کوئی شک واضح ہوتا۔ صرف ایک بات تھی جو کچھ شک پیدا کرتی تھی وہ یہ کہ جمیل ٹھیکیدار کی بیٹی کو کالج لے جاتا اور واپس لاتا تھا۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ جس شخص کو اچانک دولت مل جائے اور اس سے پہلے اس نے کبھی دولت نہ دیکھی ہو تو اس کا اپنا دماغ خراب ہو یا نہ ہو' اس کی اولاد کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ لوئر مڈل یا مڈل کلاس کا خاندان صرف دولت کے زور پر یک لخت اپر کلاس میں شامل ہو جائے تو اس خاندان کی نوجوان لڑکیاں اور لڑکے آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور اپنی اخلاقی حدیں پھلانگ جاتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم کرنا تھا کہ ٹھیکیدار کی یہ بیٹی اخلاقی لحاظ سے کیسی ہے۔

البتہ سوچنے والی بات یہ بھی تھی کہ امیر گھرانے کی لڑکی کو امیر گھرانوں کے لڑکوں کے ساتھ دوستی لگانی چاہئے تھی' جمیل تو اس کا باڈی گارڈ یعنی نوکر تھا۔

میں اور انسپکٹر ٹینیسن اسی مسئلے پر تبادلۂ خیال کرتے تھانے چلے گئے۔ ٹھیکیدار خلیل الرحمان تھانیدار کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ پچاس سال سے کچھ اوپر عمر کا آدمی تھا۔ شکل و صورت سے معزز لگتا تھا۔ وہ جس طرح مجھے اور انسپکٹر ٹینیسن سے ملا' اس سے پتہ چلتا تھا کہ اچھی اور شائستہ سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے والا آدمی ہے۔ میری رائے میں وہ شائستہ اور مہذب آدمی تھا یا پکا استاد تھا اور ہر ڈھنگ کھیلنا جانتا تھا۔ میں نے اور ٹینیسن نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ ٹھیکیدار کو بھٹے پر لے جانا ہے اور وہیں اس سے سوال و جواب کریں گے۔ بھٹہ دیکھنا بھی ضروری تھا۔

ہم نے اسے کہا کہ وہ ہمیں اپنے بھٹے پر لے چلے۔ بھٹہ دِلّی کے مضافات میں تھا۔ تھوڑا عرصہ گزرا' دِلّی سے آئے ہوئے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا تھا کہ جہاں کسی زمانے میں بھٹے اور بنجر علاقے تھے وہ سب کبھی کے آباد ہو چکے ہیں۔ وہاں کوٹھیاں اور نئے نئے نمونوں کے مکان بن گئے ہیں۔

ٹھیکیدار کے بھٹے پر پہنچے تو اسے کہا کہ سب سے پہلے ہمیں وہ جگہ دکھائے جہاں سے جمیل آگ میں گرا تھا۔ اس نے وہ جگہ دکھائی۔ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اینٹوں والا بھٹہ نہیں دیکھا انہیں ذرا واضح طور پر بتا دیا جائے کہ بھٹہ کیسا ہوتا ہے۔ یہ ایک خندق ہوتی ہے جو گولائی میں کھودی' ہوتی ہے لیکن یہ گول دائرے میں نہیں ہوتی بلکہ لمبوتری ہوتی ہے۔ اس کی کم از کم گہرائی دس فٹ ہوتی ہے۔ چوڑائی بھی تقریباً اتنی ہی رکھی جاتی ہے۔ اس خندق میں کچّی اینٹیں ایک خاص ترتیب سے رکھی جاتی ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ ایک ترتیب میں ڈھیر ہوتا ہے۔ ڈھیر کے درمیان ایک خاص فاصلے پر جگہ خالی چھوڑی جاتی ہے۔ ایسی سب جگہوں پر کوئلے' لکڑیاں یا جلنے والی اور اشیاء رکھ کر انہیں آگ لگا دی جاتی ہے پھر اس ساری خندق کو اوپر سے ڈھک دیا جاتا ہے۔ جہاں جہاں آگ جل رہی ہوتی ہے وہاں اوپر لوہے کے ڈھکن رکھ دیئے جاتے ہیں اور ایک جگہ چمنی رکھ کر اِدھر اُدھر سے باندھ دی جاتی ہے۔ اس سے تمام بھٹے کا دھوآں باہر نکلتا ہے۔ جہاں ڈھکن رکھے جاتے ہیں وہاں سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ڈھکن اٹھا کر مزید کوئلے اور لکڑیاں پھینکتے رہتے ہیں۔

میں سنا رہا تھا کہ ٹھیکیدار نے ہمیں وہ جگہ دکھائی جہاں سے جمیل پھسل کر آگ میں گرا تھا۔ میں نے اور ٹینیسن نے بھٹے کا کنارا غور سے دیکھا۔ میں نے ٹینیسن کی طرف اور ٹینیسن نے میری طرف دیکھا۔ وہاں پھسلنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہم دونوں نے ٹھیکیدار کو پتہ نہ چلنے دیا کہ ہمارا ردِّ عمل کیا ہے۔

آپ ایک دس فٹ گہری خندق کو تصور میں لائیں۔ اس میں آگ جل رہی ہے۔ خندق کے ذرا قریب جاؤ تو تپش اتنی زیادہ ہو گی کہ آپ خندق کے کنارے تک جانے کی جراَت نہیں کریں گے۔ بھٹے کی آگ تو خاصی زیادہ ہوتی ہے۔ ٹھیکیدار نے بتایا کہ جمیل کنارے پر چلا گیا تھا۔

''کیا وہ اکیلا تھا؟'' — میں نے پوچھا۔

"نہیں!" — ٹھیکیدار نے جواب دیا — "مزدور بہت ہیں۔ میں نے ان پر ایک میٹ مقرر کر رکھا ہے۔ یہ میٹ ہی انہیں سنبھال سکتا ہے"۔

"کیا اُس وقت آپ بھی یہاں موجود تھے؟" — انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

"نہیں!" — ٹھیکیدار نے جواب دیا — "مجھے یہ باتیں میٹ نے بتائی تھیں"۔

"اور آپ نے ہر بات سچ مان لی" — میں نے کہا اور پوچھا — "تھانے میں آپ نے کیا رپورٹ دی تھی؟"

"یہی کہ میرا ایک ملازم آگ میں گر کر جل گیا ہے" — اس نے جواب دیا۔

"کیا آپ کو ذرا سا بھی شک نہیں ہُوا تھا کہ آپ کے اس ملازم کو کسی نے کسی وجہ سے آگ میں گرایا ہو گا؟" — میں نے پوچھا۔

"آپ کا مطلب ہے کہ کسی کے ساتھ اس کی دشمنی ہو گی" — ٹھیکیدار نے کہا — "اس بے چارے کی کسی کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ اسے اس بھٹے پر آئے چار ہی دن ہوئے تھے"۔

ٹھیکیدار کا پورا بیان تو ہم نے بعد میں لینا تھا' ابھی ہم موقعہ دیکھ رہے تھے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا تھا کہ کوئی عینی شاہد تھا یا نہیں۔ یہ معلوم ہو گیا کہ مزدوروں کا میٹ جمیل کے ساتھ تھا۔ میٹ وہیں تھا۔ ہم نے اسے صرف دیکھا' اس کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ ہم نے یہ دیکھ لیا تھا کہ وہاں پھسلنے والی کوئی جگہ نہیں تھی۔ بھٹے میں کچّی اینٹیں رکھی جا چکی تھیں اور آگ کی جگہوں پر آگ جلا دی گئی تھی۔ یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اتنی زیادہ آگ کے قریب کوئی نہیں جا سکتا۔ کنوئیں میں آدمی جھک کر دیکھ لیتا ہے کیونکہ اس میں آگ نہیں ہوتی' پانی ہوتا ہے۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ مزدور چلے گئے تھے۔ میٹ وہیں تھا اور دو چوکیدار آ گئے تھے۔ ہم نے ٹھیکیدار خلیل الرحمان سے کہا کہ وہ رات نو بجے میٹ کو ساتھ لے کر کرائمز برانچ پہنچ جائے۔

میں اور انسپکٹر ٹینیسن وہاں سے ایک شک لے کر آ گئے۔ ہم دونوں کی متفقہ رائے یہ تھی کہ یہ اتفاقی یا حادثاتی موت نہیں۔

بھیڑوں کا رکھوالا بھیڑیا

ہم دونوں انسپکٹر رات دس بجے اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ ٹھیکیدار اور اس کا میٹ ہمارے انتظار میں بیٹھے تھے۔ ہم نے انہیں نو بجے کا وقت دیا تھا اور ہم ایک گھنٹہ لیٹ پہنچے۔ یہ ہم نے اس لئے کیا تھا کہ یہ ہمارا طریقۂ کار تھا۔ مشتبہوں کو ہم کئی کئی گھنٹے انتظار میں رکھا کرتے تھے تا کہ وہ ذہنی طور پر نڈھال ہو جائیں۔ یہ تو ہم نے ٹھیکیدار پر مہربانی کی تھی کہ ہم صرف ایک گھنٹہ لیٹ آئے تھے۔ پہلے ہم نے ٹھیکیدار کو اپنے پاس بٹھایا۔

ہمارے کچھ تعارفی قسم کے سوالوں کے جواب میں اس نے جمیل کے متعلق وہی باتیں بتائیں جو جمیل کی ماں بتا چکی تھی۔

"جنابِ عالی!" — اس نے کہا — "مجھے اس لڑکے کے مرنے کا اتنا زیادہ غم ہے جس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ بیچارہ یتیم تھا اور چھوٹے بھائی کا اور بیوہ ماں کا سہارا تھا۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس کی ذاتِ باری نے مجھے اتنا دیا ہے کہ میں اس لڑکے کو نوکری پر لگا کر خاصی زیادہ تنخواہ دیتا رہا۔ بڑا شریف اور قابلِ اعتماد لڑکا تھا۔ اس کی موجودگی میں مجھے حساب کتاب اور روپے پیسے کی طرف سے بے فکری رہتی تھی۔ میں اسے اپنی جوان بیٹی کے ساتھ کالج تانگے پر بھیج دیا کرتا تھا۔ یہی لڑکا میری بیٹی کو کالج سے واپس لاتا تھا۔ خدا کی قسم میں اس کی ماں کا سامنا نہیں کر سکتا"۔

اس نے اپنے بیان کا یہ حصہ رونی سی صورت بنا کر ہمیں سنایا۔ ایسے لگتا تھا جیسے ابھی رو پڑے گا۔

"آپ نے اس کی ماں کو پانچ ہزار روپیہ دیا تھا" — میں نے کہا — "یہ رقم اس نے نہیں لی' پھر آپ نے اس میں تین ہزار کا اضافہ کر دیا۔ اس نے یہ رقم بھی نہیں لی پھر آپ نے اسے دھمکی دی کہ تم دوسرے بیٹے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گی.... آپ نے اسے یہ دھمکی کیوں دی تھی؟"

"نہیں جناب!" — اس نے ذرا گھبراہٹ کے لہجے میں کہا — "میں نے اسے ایسی کوئی دھمکی نہیں دی بلکہ میں نے تو یہ کہا تھا کہ تمہارا دوسرا بیٹا میٹرک پاس کر لے

تو میں اسے اپنے ساتھ اتنی تنخواہ پر لگالوں گا جتنی تنخواہ پر جمیل کو لگا رکھا تھا.... اصل بات یہ ہے جناب! بیچاری ماں ہے اور اس کا جوان بیٹا مر گیا ہے۔ اس پر تو پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔ اسے شک ہے کہ اس کے بیٹے کو کسی نے اٹھا کر آگ میں پھینک دیا تھا۔ بار بار تھانے کی طرف دوڑتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ہی اس کا والی اور وارث ہوں۔ اس عورت کو میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ ہو سکتا ہے میں نے اسے تھانے سے روکنے کے لئے کوئی سخت بات کہہ دی ہو جسے اس نے دھمکی سمجھا ہو۔ میں نے خود ہی پولیس کو اطلاع دے کر موقعہ پر بلا لیا تھا۔ سب انسپکٹر صداقت صاحب نے بڑی محنت سے تفتیش کی تھی۔ انہوں نے بھی اپنے ذہن میں یہ شک رکھ کر تفتیش کی تھی کہ کسی نے جمیل کو آگ میں دھکیلا ہو گا۔ جمیل بیچارے کو بھٹے پر آئے ابھی چار ہی دن گزرے تھے۔ یہاں اس کی کسی کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی تھی"۔

"جمیل آپ کے دوسرے کاروبار میں کام کرتا تھا"—انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا— "اسے آپ نے بھٹے پر کیوں بھیج دیا تھا؟"

"یہ ایک عارضی تبدیلی تھی"—اس نے جواب دیا— "بھٹے کا منشی سات آٹھ دنوں کے لئے چھٹی چلا گیا تھا۔ پیچھے جو میرے ملازم ہیں وہ پیسوں میں گڑبڑ کر دیتے ہیں۔ بھٹے کی آمدنی اچھی خاصی ہے۔ بددیانت ملازم جتنے پیسے چاہے مار سکتا ہے۔ یہ منشی جو چھٹی چلا گیا تھا' دیانت دار آدمی ہے۔ میں نے اس کی جگہ جمیل کو بھیج دیا کہ یہ بھی اسی جیسا دیانت دار اور میرے گھر کا اپنا فرد ہے"۔

"کیا یہ منشی پہلے کبھی چھٹی گیا تھا؟"—انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

"شاید.... مجھے.... ہو سکتا ہے"—اس کی زبان ہکلا گئی پھر ذرا سنبھل کر بولا —"یہ میں پوچھ کر بتاؤں گا"۔

اس سوال پر اس کا جو ردِ عمل اس کے چہرے پر اور اس کے انداز میں ظاہر ہُوا' وہ ہمارے لئے ایک واضح اشارہ تھا۔ میں نے ذہن میں رکھ لیا کہ اس منشی کو بھی پوچھ گچھ کے لئے بلانا ہے۔ ہم دونوں انسپکٹروں نے اس پر اس طرح مختلف سوال پھینکنے شروع کر دیئے جیسے تیر برسائے جاتے ہیں۔ میں سوال و جواب کا یہ سلسلہ بیان نہیں کر رہا کیونکہ یہ بیان ہو ہی نہیں سکتا۔ ٹھیکیدار کی یہ حالت ہو گئی کہ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ پہلے کیا کہہ چکا ہے۔ ہم ابھی یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ

جمیل کو اس کے حکم سے آگ میں پھینکا گیا ہے لیکن ہمارا یہ شک پختہ ہو گیا تھا کہ جمیل پاؤں پھسلنے سے آگ میں نہیں گرا بلکہ اسے گرایا گیا تھا۔

"خلیل الرحمان صاحب!"—میں نے کہا— "میں آپ کو ایک برادرانہ مشورہ دیتا ہوں۔ آپ کے پاس صرف یہ وقت ہے کہ آپ سچی بات بتا دیں گے تو آپ کو اس کا صِلہ مل جائے گا۔ ہمیں دوسروں سے سچ بات معلوم ہوئی تو پھر آپ نہیں جانتے کہ آپ کا انجام کیا ہو گا۔ آپ سب کچھ جانتے ہیں۔ یہ بھی جان لیں کہ اس کیس کی تفتیش سی آئی اے کر رہی ہے۔ ابھی تو آپ کے ساتھ باعزت طریقے سے باتیں ہو رہی ہیں۔ کوشش کریں کہ ہم دوسرا طریقہ اختیار کرنے پر مجبور نہ ہو جائیں"۔

"آپ کے دل میں شک کیا ہے جناب؟"—اس نے پوچھا۔

"شک نہیں جناب!"—میں نے کہا— "شک نہیں' یقین.... ہم ایک یقین کو سامنے رکھ کر بات کر رہے ہیں۔ جمیل کو آگ میں گرایا گیا ہے اور اس کا آپ کو اچھی طرح علم ہے"۔

"لیکن حضور!"—اس نے کھسیانے سے لہجے میں کہا— "اس کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہئے"۔

"وجہ آپ بتائیں گے ٹھیکیدار صاحب!"—میں نے کہا— "دولت کا نشہ اتنا بُرا ہے کہ ذہن اور دل سے خدا کو بھی نکال دیتا ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ اس لڑکے نے آپ کی بیٹی کے ساتھ دست درازی کی ہو گی یا آپ کی بیٹی اس لڑکے کے ساتھ قابلِ اعتراض حد تک بے تکلّف ہو گئی ہو گی اور آپ نے ان دونوں کو قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ لیا ہو گا"۔

ٹھیکیدار نے اس بات پر ناچنا کودنا شروع کر دیا۔ وہ کہتا تھا کہ آپ میری بیٹی کو ایسا بدچلن نہ کہیں۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ میں جمیل کے چال چلن کے بارے میں ایسی کوئی بات گوارا نہیں کر سکتا۔

"پھر دوسری بات یہ ہے"—میں نے کہا— "آپ کا میٹ اور کوئی دوسرا آدمی بھٹے سے پیسے مارتے ہوں گے اور جمیل ان کے لئے رکاوٹ بن گیا ہو گا اور ہو سکتا ہے اس نے کسی کو پکڑ بھی لیا ہو اور کہا ہو کہ وہ اس کی رپورٹ آپ کو دے گا۔ جمیل کو

خاموش کرنے کا طریقہ ان لوگوں نے یہ اختیار کیا کہ اسے آگ میں دھکیل دیا"۔

"اس بارے میں مَیں کچھ نہیں کہہ سکتا" — ٹھیکیدار نے کہا — "میں خود بھی جاسوسی کروں گا اور آپ بھی تفتیش کریں"۔

"ٹھیکیدار صاحب!" — میں نے کہا — "آپ سوسائٹی کے معزز فرد ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کی عزت قائم رہے۔ ہم آپ کو کل شام تک مہلت دیتے ہیں۔ اپنا بھلا بُرا سوچ لیں اور آپ کے دل میں کوئی بات ہے تو وہ بتا دیں۔ اب آپ چلے جائیں"۔

دولت کا نشہ، ٹھیکیدار کی بیٹی

ٹھیکیدار کے جانے کے بعد ہم نے اس کے میٹ کو بلایا۔ وہ پینتیس چھتیس سال کا چھریرے بدن کا آدمی تھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ شریف آدمی نہیں۔ اس سے ہم نے پوچھا کہ وہ کب سے اس بھٹے پر کام کرتا ہے۔ خلیل الرحمان کا یہ بھٹہ خاصا پرانا تھا اور یہ میٹ اس بھٹے پر تقریباً دس سالوں سے تھا۔ اس نے اپنا نام سراج الدین بتایا لیکن وہ ساگری کے نام سے مشہور تھا۔

"ایک بات ذہن میں رکھ لو ساگری!" — مَیں نے کہا — "جھوٹ بولو گے تو پس جاؤ گے۔ یہ دولت مند لوگ اپنے جرم اور گناہ اپنے ملازموں کے کھاتے میں ڈال دیا کرتے ہیں۔ تمہارے ٹھیکیدار صاحب بھی کچھ ایسی ہی حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ کوئی خاص بات ہے تو پہلے ہی بتا دو۔ ہمیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا پھر تم ہمارے شکنجے سے نہیں نکل سکو گے.... یہ بتاؤ کہ جمیل کو ٹھیکیدار نے دوسرے کاموں سے ہٹا کر بھٹے پر کیوں لگا دیا تھا؟"

"بھٹے کا منشی چھٹی چلا گیا تھا" — اس نے جواب دیا — "اس کی جگہ جمیل آیا تھا"۔

"منشی کب سے اس بھٹے پر ہے؟"

"چھ سات سالوں سے!" — اس نے جواب دیا۔

"وہ پہلے بھی کبھی چھٹی گیا ہے؟"

"میرا خیال ہے" — اس نے سوچ کر جواب دیا — "تین سال پہلے چھٹی گیا تھا"۔

"کیا اُس وقت بھی ٹھیکیدار نے جمیل کو یا کسی اور کو اس کی جگہ بھٹے پر بھیجا تھا؟"

"نہیں عالی جاہ!" — اس نے جواب دیا — "ایسی کوئی ضرورت نہیں تھی"۔

"بھٹے پر کون پیسے کھاتا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"کوئی بھی نہیں عالی جاہ!" — اس نے جواب دیا — "باقاعدہ کیش میمو بنتے ہیں۔ پیسے مارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔

"پیسے تم مارتے ہو" — میں نے اسے بھڑکانے کے لئے جھوٹ بولا — "اسی لئے ٹھیکیدار نے جمیل کو بھٹے پر بھیجا تھا"۔

"کیا یہ ٹھیکیدار صاحب کہتے ہیں؟" — اس نے پوچھا۔

"ٹھیکیدار صاحب بہت کچھ کہتے ہیں" — میں نے کہا — "ٹھیکیدار نے صرف یہی ایک بات نہیں بتائی۔ وہ تمہاری اور کرتوت بھی بتا رہا ہے۔ میں تمہیں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ان دولت مند ٹھیکیداروں اور جاگیرداروں کی وفاداری بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لئے اپنے وفادار نوکروں اور مزارعوں کو آگے کر دیتے ہیں۔ اگر تم کوئی بات اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہو تو وہ ہمیں بتا دو"۔

میں نے اس کے چہرے پر نمایاں تبدیلی دیکھی۔ میں نے اور ٹینیسن نے اس پر کئی اور سوال پھینکے۔ ہم اس کے جوابوں پر اتنی توجہ نہیں دیتے تھے جتنی توجہ ہم اس کے بدلتے ہوئے انداز اور چہرے کے تاثرات کو دیتے تھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اس شخص کے دل میں کوئی بات ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ یہ شخص استاد ہے اور بغیر شہادت اور ثبوت کے ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ اسے ہم نے کچھ دیر کے لئے دوسرے کمرے میں بھیج دیا اور ہم دونوں انسپکٹر اس کے متعلق آپس میں تبادلۂ خیالات کرنے لگے۔

میں نے انسپکٹر ٹینیسن سے کہا کہ مزدوروں پر جو میٹ مقرر کئے جاتے ہیں وہ پکے جرائم پیشہ اور غنڈے ہوتے ہیں۔ بھٹوں پر کام کرنے والے مزدوروں اور مالکوں کو تو میں بہت ہی اچھی طرح جانتا تھا۔ کچی اینٹیں بنانے کے لئے پورا پورا کنبہ کام کرتا تھا۔

ان میں نوجوان لڑکیاں اور جوان عورتیں بھی ہوتی تھیں۔ میٹ اور مالک ان کو مزدوری سے ہٹا دینے کی دھمکی دے کر اور کام کم کر دینے کا لالچ دے کر انہیں خراب کرتے تھے۔ تھے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ اُس وقت ہی ہوتا تھا' آج کل پاکستان میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی اخباروں میں کسی بھٹے کی یا بھٹے کے مزدوروں کے متعلق کوئی خبر آ جاتی ہے۔ بھٹوں پر مزدوروں کے ساتھ ناانصافی' حقوق کُشی اور ان کی عورتوں کے ساتھ جنسی زیادتی شروع سے ہی ہو رہی ہے۔ ان بھیڑوں کی رکھوالی پر مالک دو تین بھیڑیئے رکھتے ہیں۔ نہ رکھیں تو مزدور قابو میں نہیں رہتے۔

ٹھیکیدار خلیل الرحمان کا یہ میٹ جس کا نام ساگری تھا' ایسے ہی بھیڑیوں میں سے تھا۔ اس نے خود اعتراف نہیں کیا تھا کہ وہ غنڈہ اور بدمعاش ہے' یہ رائے ہماری تھی جو ہم نے اس کی باتوں اور اس کے انداز سے قائم کی تھی۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ وہ اکیلا میٹ ہے یا اس کا کوئی اور ساتھی بھی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ اکیلا ہے۔

میں نے اور انسپکٹر ٹینیسن نے آپس میں تبادلۂ خیال کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اس شخص کو بھٹے پر نہ جانے دیا جائے ورنہ اس کے ڈر سے کوئی مزدور صحیح بات نہیں بتائے گا۔ ہم نے اگلے روز بھٹے پر جانا اور وہاں کے مزدوروں سے تفتیش کرنی تھی۔

ساگری کو دوسرے کمرے سے بلا کر ہم نے پھر اپنے سامنے بٹھا لیا اور اس سے پوچھا کہ جمیل اخلاق اور چال چلن کے لحاظ سے کیسا تھا۔ اس نے جواب دیا کہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جمیل ٹھیکیدار صاحب کے دور کے رشتہ داروں میں سے تھا اس لئے سب اس کی عزت کرتے تھے۔ میں نے اپنے شک کی بناء پر اس سے پوچھا کہ ٹھیکیدار کی بیٹی کے ساتھ جمیل کا کیا چکر چل رہا تھا۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ کوئی چکر تھا بھی یا نہیں' یہ بات اُگلوانے کا ایک انداز تھا۔ میں ساگری کو یہ تاثر دے رہا تھا کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔

"میں اس معاملے میں کچھ بھی نہیں جانتا عالی جاہ!" — ساگری نے جواب دیا — "لڑکا ان کا اپنا تھا۔ ان کے گھر بھی جاتا تھا اور لڑکی کے ساتھ کالج جاتا بھی تھا اور آتا بھی تھا۔ میں نے کبھی کوئی بات نہیں سنی"۔

"اور لڑکی کے متعلق کیا خیال ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"لڑکی پردہ نشین ہے" — اس نے جواب دیا — "برقعے میں کالج جاتی ہے اور میں نے سنا ہے کہ گھر سے باہر نہیں نکلتی.... میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں عالی جاہ! ٹھیکیدار صاحب کے اپنے خاندان کی عورتیں ہی نہیں بلکہ ان کی ساری رشتہ دار عورتیں پردے میں رہتی ہیں اور صحیح معنوں میں شریف عورتیں ہیں۔ ٹھیکیدار صاحب کو اچانک دولت مل گئی۔ انہوں نے تو شراب بھی پینی شروع کر دی اور دوسری عیاشیوں میں پڑ گئے لیکن ان کی عورتیں جیسی پہلے تھیں ویسی ہی اب ہیں"۔

"جمیل جب بھٹے میں گرا اُس وقت تم اس کے ساتھ تھے" — میں نے اس سے پوچھا — "کیا تم نے اسے روکا نہیں تھا کہ آگے نہ جاؤ؟"

"ہاں عالی جاہ!" — اس نے کہا — "میں نے اسے روکا تھا لیکن پیچھے ہٹتے اس کا پاؤں ایسا پھسلا کہ وہ گر پڑا اور جل گیا.... میرا خیال ہے کہ اُسے بھٹے کی آگ دیکھنے کا شوق تھا"۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ بے شمار سوال و جواب کے ذریعے ہم جان چکے تھے کہ یہ شخص پکا بدمعاش ہے' اس کے باوجود ہم نے اس پر سوالوں کی ایک اور بوچھاڑ کر دی۔ یہ واضح ہو گیا کہ یہ شخص استاد غنڈہ ہے۔ اسے ہم نے باقاعدہ گرفتار نہ کیا' ڈیوٹی والے اے ایس آئی سے کہا کہ اسے ہیڈ کوارٹر میں ہی رکھا جائے اور اِدھر اُدھر نہ ہونے دیا جائے۔

اگلے روز صبح آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ہم بھٹے پر چلے گئے۔ ٹھیکیدار کو ہم نے نہیں بتایا تھا کہ ہم وہاں جائیں گے۔ وہاں وہی منشی تھا جو چھٹی چلا گیا تھا اور اس کی جگہ جمیل آیا تھا۔ ہم نے اس کے ساتھ اس طرح باتیں شروع کر دیں جس طرح گپ شپ لگائی جاتی ہے۔ وہ ہمیں جانتا تھا۔ گذشتہ روز اُس نے ہمیں دیکھا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ یہ جواں سال آدمی خود اعتمادی سے بات کرتا ہے اور اس کا انداز کچھ دوستانہ سا ہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ مزدوروں کے میٹ ساگری سے مرعوب ہے۔ ساگری کا ذکر آتا تھا تو وہ جھینپ جاتا اور اپنی کوئی رائے نہیں دیتا تھا۔

"تم پچھلی چھٹی کب گئے تھے؟" — میں نے پوچھا۔

"شاید تین سال ہو گئے ہیں" — اس نے جواب دیا۔

"ان تین سالوں میں تمہیں چھٹی نہیں ملی یا خود ہی نہیں گئے؟"— میں نے پوچھا۔

"میں کہیں دُور کا رہنے والا نہیں"— اُس نے جواب دیا اور ایک ہاتھ لمبا کر کے اشارہ کیا اور بولا— "وہ جو گلی نظر آ رہی ہے' اس میں میرا گھر ہے۔ کبھی کوئی نرمی گرمی ہو جائے تو ایک آدھ دن کے لئے گھر چلا جاتا ہوں"۔

"اب شاید کوئی لمبا کام آ پڑا تھا؟"— میں نے پوچھا۔

"نہیں صاحب!"— اس نے کہا— "ٹھیکیدار صاحب سے ذکر نہ کیجئے گا۔ کوئی کام نہیں تھا۔ ساگری نے ایک روز کہا کہ تم چھٹی لے سکتے ہو پھر لیتے کیوں نہیں؟ ٹھیکیدار نے تمہیں کب انعام دیا ہے یا آئندہ انعام دے گا۔ کچھ دنوں کی چھٹی لو اور آرام کرو' گھومو پھرو"۔

میں اس کے ساتھ چھٹی کے متعلق کسی اور خیال سے یا شاید ویسے ہی بات چھیڑ بیٹھا تھا یا شاید چھٹی حس تھی کہ میں نے اس سے چھٹی کے متعلق پوچھا تھا لیکن اس نے ایسی بات کہہ دی جس نے مجھے اور انسپکٹر ٹینیسن کو چونکا دیا۔ اس نے ہنستے مسکراتے ہوئے کہا کہ اسے چھٹی کی ضرورت نہیں تھی' ساگری اس کے پیچھے پڑ گیا تھا کہ ضرورت نہیں تو بھی وہ چھٹی جائے' یہ اس کا حق ہے اور اپنا حق چھوڑنا نہیں چاہئے۔ اس نے بتایا کہ ساگری نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے ٹھیکیدار سے چھٹی لے دے گا۔ ساگری نے اسے ایک ہفتے کی چھٹی لے بھی دی۔

"میں نے کہا چلو اچھا ہے"— منشی نے کہا— "سیر سپاٹا اور آرام کر کے میں چھٹی گذار آیا لیکن جمیل آگ میں گر کر راکھ ہو گیا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہُوا۔ نہ میں چھٹی جاتا نہ اسے میری جگہ بھٹے پر بھیجا جاتا"۔

وہ تو سادگی میں یہ بات کہہ گیا لیکن میرا ذہن اس انکشاف پر اٹک گیا کہ اسے ساگری نے چھٹی بھجوایا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ منشی کو چھٹی بھجوانا جمیل کے قتل کی سازش کی ایک کڑی تھی۔ اس بہانے جمیل کو بھٹے پر لانا اور اسے آگ میں پھینکنا تھا۔ ہمیں اب اس سوال کے جواب کی ضرورت تھی کہ یہ سازش اور پلاننگ اکیلے ساگری کی تھی یا اس میں ٹھیکیدار خلیل الرحمان بھی شامل تھا۔ منشی نے محسوس

نہیں کیا تھا کہ اس نے کتنی اہم بات کہہ دی ہے۔ میں نے اور ٹینیسن نے اس سے کچھ اور باتیں پوچھیں لیکن اس کی زبان سے ہمیں اپنے سوال کا جواب نہ ملا۔

"تم تو بڑے کام کے آدمی ہو یار!"— میں نے منشی کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا— "میرا خیال ہے کہ یہ بھٹہ تم ہی چلا رہے ہو۔ ساگری تو غنڈہ گردی کے سوا کچھ بھی نہیں کرتا ہو گا"۔

اس طرح میں نے اسے خوب ہوا دی تا کہ وہ کچھ اور اُگل دے۔ انسپکٹر ٹینیسن نے بھی اسے دانشمند اور نہ جانے کیا کیا خطاب دے ڈالے۔

"ایک بات بتاؤ اور لیں!"— میں نے اسے کہا— "جمیل کو مرے دو مہینے ہو گئے ہیں۔ تم چھٹی سے واپس آئے تو تم نے یہاں کے مزدوروں سے پوچھا ہو گا کہ جمیل آگ میں کیسے گرا تھا۔ تم نے ساگری سے بھی پوچھا ہو گا۔ یہاں کے لوگ کیا کہتے ہیں؟"

"سب حیران تھے"— منشی نے جواب دیا— "حیران اس پر کہ وہ آگ میں گرا کیسے! اتنی زیادہ آگ کے قریب کوئی نہیں جا سکتا.... ساگری کہتا تھا کہ جمیل بیوقوف لڑکا تھا"۔

"ایک اور بات اور لیں!"— میں نے کہا— "یہ بات بھی تم ہی بتا سکتے ہو۔ کیا ایسی بات تو نہیں ہوئی تھی کہ جمیل نے یہاں کسی لڑکی پر ہاتھ رکھا ہو اور ساگری اس لڑکی کو اپنی ملکیت سمجھتا ہو"۔

"اب میری ایک بات سن لیں صاحب!"— منشی نے کہا— "پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ کسی نے مجھے ایسا واقعہ نہیں سنایا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ساگری کے بارے میں یہاں کوئی آدمی اپنی زبان نہیں کھولے گا۔ میں بھی اس سے ڈرتا ہوں"۔

"کہاں ہے ساگری؟"— انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

"وہ ابھی آ جائے گا"— منشی نے جواب دیا— "دس ساڑھے دس بجے آیا کرتا ہے"۔

"وہ اب نہیں آئے گا"— انسپکٹر ٹینیسن نے کہا— "وہ گرفتار ہو چکا ہے۔ ہماری حوالات میں بند ہے"۔

منشی نے آنکھیں پھاڑ کر ٹینیسن کے منہ پر نظریں جمادیں۔

"حیران مت ہو ادریس!" — میں نے اسے کہا — "ساگری کو ہم نے گرفتار کر لیا ہے"۔

انسپکٹر ٹینیسن نے مجھے الگ کر کے کہا کہ ساگری کے متعلق اب کسی شک کی گنجائش نہیں رہی کہ وہ اس واردات میں ملوث ہے۔ منشی کو اس نے اسی سازش کے تحت چھٹی بھجوایا تھا۔ ٹینیسن نے کہا کہ منشی ٹھیک کہتا ہے کہ ساگری کی موجودگی میں کوئی مزدور اس کے خلاف بیان نہیں دے گا نہ ہی کوئی کچّی بات بتائے گا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ساگری کو ہتھکڑی لگا کر بھٹے پر لایا جائے تاکہ سب کو یقین ہو جائے کہ ان کا میٹ گرفتار ہو گیا ہے۔ مجھے اُس کی یہ تجویز اچھی لگی لیکن مجھے اچھا نہیں لگتا تھا کہ اسی وقت اپنے آفس جائیں اور اسے ہتھکڑی لگا کر لے آئیں۔

"وہ کہاں کا معزز آدمی ہے ملک!" — ٹینیسن نے کہا — "ہیڈ کانسٹیبل کو بھیجتے ہیں کہ اسے ہتھکڑی لگا کر لے آئے۔ بعد میں اس کے خلاف کوئی شہادت نہ ملی تو چھوڑ دیں گے"۔

ہمارے ساتھ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور ایک کانسٹیبل تھا جو ہماری جیپ کا ڈرائیور بھی تھا۔ میں نے انہیں بلایا اور کہا کہ ساگری کو ہتھکڑی لگا کر لے آئیں۔

مزدوروں کی خوفزدگی

منشی کو جب یقین ہو گیا کہ ان کا غنڈہ میٹ ساگری گرفتار ہو گیا ہے تو اس نے بولنا شروع کر دیا۔

"یہ حادثہ میری غیر حاضری میں ہُوا ہے" — منشی نے کہا — "اگر میں یہاں ہوتا تو مجھے کچھ تو پتہ چل جاتا۔ مجھے اب کچھ سمجھ آ رہی ہے کہ ساگری کیوں میرے پیچھے پڑ گیا تھا کہ چھٹی جاؤ اور پھر خود ہی ٹھیکیدار صاحب سے مجھے چھٹی دلوا دی۔ یقین کریں کہ مجھے ایک ہفتہ چھٹی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ساگری کے متعلق میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ بھٹے کے تمام مزدور اس سے ڈرتے ہیں اور یہ شخص من مانی کرتا ہے"۔

منشی نے یہ بھی بتا دیا کہ یہ دِلّی کے کون سے علاقے میں رہتا ہے اور کس محلّے اور گلی میں اس کا گھر ہے۔

میں نے منشی سے پوچھا کہ ہمیں ایسی باتیں کون بتا سکتا ہے کہ بھٹے میں کچّی اینٹیں رکھی جا چکی تھیں اور آگ بھی جلا دی گئی تو اُس وقت کون کون یہاں تھا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ کچّی اینٹیں بنانے والے مزدور بھٹے سے کچھ دُور اور گہرائی میں ہوتے ہیں.... منشی نے پانچ آدمیوں کے نام لئے۔ میرے کہنے پر اس نے ان آدمیوں کو بلا لیا۔ میں نے ان میں سے ایک کو الگ کر لیا۔

"ہم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں میرے بھائی!" — میں نے کہا — "یہ بتاؤ کہ جب جمیل آگ میں گرا' اُس وقت تم کہاں تھے"۔

اس غریب سے آدمی کا ردِ عمل یہ تھا کہ اس کے چہرے پر بے بسی صاف نظر آنے لگی اور اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر میری طرف یوں دیکھا جیسے رو پڑے گا۔ یہ التجا اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی کہ جناب مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔

"میں نے کہا ہے ڈرو نہیں" — میں نے کہا — "جس سے تم ڈرتے ہو وہ گرفتار ہو چکا ہے۔ ابھی تمہارے سامنے آ جائے گا اور تم جو بھی بات بتاؤ گے وہ کسی کو نہیں بتائی جائے گی"۔

پھر بھی وہ خاموش رہا۔ میں اس پر پولیس والا رعب جھاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ بڑی ہی مشکل سے اس نے بتایا کہ وہ فلاں جگہ کھڑا تھا اور اس نے جمیل کو ساگری کے ساتھ بھٹے کی خندق کے ساتھ ساتھ جاتے دیکھا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ تین اور مزدور وہاں کام کر رہے تھے اور ساگری نے پیچھے مُڑ کر دیکھا اور سب کو ڈانٹ کر کہا تھا کہ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو' اُدھر چلے جاؤ۔ وہ آدمی ہٹے تو فوراً بعد ساگری نے شور مچایا کہ لڑکا آگ میں گر پڑا ہے۔ یہ سب آدمی دوڑے گئے۔

جب یہ مزدور مجھے یہ باتیں بتا رہا تھا تو اس کی زبان رک رک کر چلتی تھی' اور جب اس نے بتایا کہ وہ بھی دوڑا گیا اور جمیل کو آگ میں جلتے دیکھا تو اس مزدور کی زبان رک گئی۔ اس کے آگے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا' ہونٹ کانپنے لگے اور میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ انسپکٹر ٹینیسن نے

مجھے انگریزی میں کہا کہ اس شخص کو بٹھادو اور اسے پانی پلاؤ ورنہ یہ بے ہوش ہو کر گر پڑے گا۔ یہ غریب آدمی اس منظر کو بیان کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا جب جمیل اتنی ہولناک آگ میں جل رہا تھا.... میں نے اسے بیٹھنے کو کہا اور منشی سے کہا کہ اسے پانی پلائے۔ میں نے اسے بہت تسلی دی۔ اس نے پانی پی کر میرے آگے ہاتھ جوڑے۔

"حضورا" — اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "مجھ سے اور کچھ نہ پوچھیں"۔

پھر میں نے ان تینوں آدمیوں کو باری باری الگ کیا اور وہی سوال پوچھے جو اس مزدور سے پوچھے تھے اور ہر ایک کا ردِ عمل وہی تھا جو پہلے مزدور کا تھا۔ انہوں نے بھی بتایا کہ ساگری نے انہیں ڈانٹ کر وہاں سے ہٹا دیا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اس وقت ساگری اور جمیل کس طرح چل رہے تھے، یعنی آگے پیچھے یا ساتھ ساتھ؟.... انہوں نے بتایا کہ جمیل آگ کی طرف تھا اور ساگری اس کی دوسری طرف کے پہلو کے ساتھ چل رہا تھا۔

میں نے ان سے ساگری کے متعلق کچھ اور باتیں پوچھیں تو سب نے گول مول سے جواب دیئے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ ڈر کے مارے کچھ بتانا نہیں چاہتے۔

اتنے میں ٹھیکیدار آگیا اور سیدھا ہمارے پاس آکر اس طرح حرکتیں اور باتیں کرنے لگا جیسے ہمارا لنگوٹیا یار یا بے تکلّف دوست ہو۔

"آپ یہاں سے غائب ہو جائیں" — میں نے کہا۔

"یہاں رہوں تو کوئی حرج تو نہیں!" — اس نے بے تکلّفی سے کہا اور اُس کے ساتھ ہی پوچھا — "میرا وہ آدمی واپس نہیں آیا۔ آپ نے اسے تفتیش کے لئے میرے ساتھ اپنے ہیڈ کوارٹر میں بلایا تھا"۔

"وہ ابھی آجائے گا" — انسپکٹر ٹیننس نے کہا — "آپ یہاں سے فوراً چلے جائیں۔ جب ہمیں ضرورت محسوس ہو گی آپ کو بلا لیں گے.... فوراً چلے جائیں"۔

"ایک بات یاد رکھنا ٹھیکیدار صاحب!" — میں نے ذرا دبدبے سے کہا — "یہاں کے کسی ورکر سے آپ نے یہ نہیں پوچھنا کہ ہم نے اس سے کیا پوچھا ہے اور اس نے کیا جواب دیئے ہیں۔ کسی ورکر کو یہ نہیں بتانا کہ وہ کیا جواب دے اور کس سوال پر خاموش رہے۔ اگر آپ نے کسی ورکر پر اس طرح کا دباؤ یا اثر ڈالا تو ہم آپ کو گرفتار کر

لیں گے"۔

ٹھیکیدار سر جھکائے ہوئے چلا گیا۔

ان تین چار مزدوروں سے ہمیں دو اور آدمیوں کا پتہ چلا کہ وہ بھی یہاں موجود تھے۔ ہم نے انہیں بلایا اور دانستہ وقت ضائع کرنے لگے۔ ہمیں ساگری کا انتظار تھا.... اسے لانے کے لئے جیپ گئی تھی — کچھ دیر بعد اسے لے آئے۔ ہم نے اسے ساتھ لیا اور ویسے ہی ٹہلتے ٹہلتے بھٹے کے اِردگرد گھومنے پھرنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ مزدور کام چھوڑ کر حیرت زدگی کے عالم میں ساگری کو ہتھکڑیوں میں بندھا دیکھ رہے تھے۔ انہیں شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ فرعون بھی گرفتار ہو سکتا ہے۔ پھر ہم نے اسے ایک جگہ بٹھا دیا۔ پھر ہم نے ان دو مزدوروں سے پوچھ گچھ شروع کی۔ انہیں بتایا کہ دیکھ لو تمہارا میٹ ہتھکڑیوں میں بندھا ہُوا ہے اب اس سے نہ ڈرو۔

انہوں نے وہی باتیں بتائیں جو پہلے مزدور بتا چکے تھے۔ ایک مزدور نے تو یہ بھی بتایا کہ اسے یقین تو نہیں لیکن اسے ایسے لگا تھا جیسے ساگری نے لڑکے کو آگ میں دھکیلا ہو۔ وہ یقین اور شک کے درمیان بات کر رہا تھا۔ بہرحال اس کی اس بات سے یہ یقین ہو گیا کہ ساگری جمیل کو آگ کے بہت قریب لے گیا تھا۔

ہمیں کوئی ایسی شہادت تو نہ ملی کہ ساگری نے جمیل کو آگ میں دھکیلا تھا، یہ شک پختہ ہو گیا کہ جمیل کو جلانے میں ساگری کا ہاتھ ہے۔

اس کے بعد ہم نے مختلف مزدوروں سے ساگری کے متعلق پوچھنا شروع کیا تو انہوں نے اس کے سارے اعمال سے پردہ اٹھانا شروع کر دیا۔ وہ تو ایسے لگتا تھا جیسے بھرے بیٹھے ہوں۔ انہوں نے بہت سی باتیں بتائیں۔ کچھ باتیں جو میں پہلے بتا چکا ہوں، ان میں ایک نئی بات کا یہ اضافہ ہُوا کہ وہ ہر مزدور سے پانچ روپے فی مزدور ماہانہ کمیشن لیتا تھا۔ بعض پورے کنبے مزدوری کرتے تھے۔ ان سے بھی پانچ روپے فی کس لیتا تھا، مثلاً ایک کنبے کے پانچ بڑے افراد اور دو بچّے ہیں جو ایک ایک اینٹ اٹھا سکتے ہیں تو وہ بچّوں کے بھی پانچ پانچ روپے اور بڑوں کے بھی پانچ روپے وصول کرتا تھا۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ اس وقت کے پانچ روپے آج کے سو روپے کے برابر تھے۔ مزدوروں کی نوجوان لڑکیوں کو وہ اپنی زر خرید لونڈیاں سمجھتا تھا۔

انسپکٹر ٹیمینسن نے مجھے یاد دلایا کہ گذشتہ رات ساگری سے پوچھا تھا کہ وہ اُس وقت جمیل سے کتنی دُور تھا جب جمیل آگ میں گرا تھا۔ ساگری نے جواب دیا تھا کہ وہ اس سے دُور تھا اور اس نے جمیل کو آگے جانے سے منع کیا تھا اور جمیل پیچھے ہٹنے لگا تو اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ آگ میں جا پڑا' لیکن اب ہر وہ مزدور جس نے انہیں دیکھا تھا' وہ بتا رہا تھا کہ ساگری جمیل کے پہلو کے ساتھ لگا ہُوا جا رہا تھا۔ ایک مزدور نے تو اس شک کا بھی اظہار کر دیا تھا کہ ساگری نے جمیل کو ہلکا سا دھکا دیا تھا۔

ہم نے وہاں سے جو کچھ حاصل کرنا تھا وہ بہت حد تک حاصل کر لیا تھا۔ آدھا دن وہیں گزر گیا تھا۔ ہم نے ساگری کو گاڑی میں بٹھایا اور واپس اپنے ہیڈ کوارٹر میں آ گئے۔ ساگری کو تفتیش کے کمرے میں بٹھا کر کہا کہ وہ اقبال جرم کر لے۔ اُس نے وہی جواب دیا جو ملزم دیا کرتے ہیں کہ وہ بے گناہ ہے اور وہ اقبال جرم کس جرم کا کرے۔ ہم نے اسے حوالات میں بند کر دیا۔ ہم دوسرے طریقے سے اس کی زبان کھلوا سکتے تھے لیکن اس کے متعلق پولیس کی رپورٹ لینا بہتر سمجھا۔

یہ تو پتہ چل گیا تھا کہ وہ کون سے علاقے کا رہنے والا ہے۔ یہ پرانی دِلّی کا علاقہ ہے۔ میں نے اس علاقے کے تھانے کے ایس ایچ او کو فون کیا اور اسے ساگری کا پورا نام اور عرف بتا کر کہا کہ اس کے متعلق مجھے پوری رپورٹ بہت جلدی چاہئے۔

میں نے یہ بھی کہا کہ اسے کوئی جاننے والا آدمی ہو تو اسے بھی میرے پاس بھیج دیا جائے۔

ایک طوائف' جوان اور حسین

ایس ایچ او نے مجھے فون پر ہی بتا دیا تھا کہ یہ شخص تھانے کے ریکارڈ پر ہے اور ایک بار کا سزا یافتہ بھی ہے۔ شام کے بعد آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ایک آدمی مجھے ڈھونڈتا ہُوا میرے گھر پہنچ گیا۔ اس نے مجھے ایک بند لفافہ دیا۔ میں نے کھول کر پڑھا۔ یہ ساگری کی ہسٹری تھی۔ اسے دو سال سزا چاقو زنی کی واردات میں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے لڑائی جھگڑے میں دو بار پکڑا گیا تھا لیکن تھانے والوں نے راضی نامہ کرا دیا تھا۔ چاقو زنی میں ہی ایک بار پکڑا گیا لیکن عدم ثبوت کی بناء پر بری ہو گیا تھا۔ تھانیدار نے اپنی

رائے لکھی تھی کہ پکّا غنڈہ اور بدمعاش ہے اور دلیر بھی ہے۔ پولیس کے ساتھ اس کی دوستی بھی رہی ہے۔

یہ رپورٹ طویل اور بڑی واضح تھی۔ جو آدمی یہ رپورٹ لایا تھا' وہ اس تھانے کا پرانا کانسٹیبل تھا۔ تھانیدار نے اس کانسٹیبل کو خاص طور پر بھیجا تھا کیونکہ اس کانسٹیبل کے ساتھ ساگری کی بڑی گہری یاری تھی۔ اس کانسٹیبل نے خود ہی کہا کہ وہ ساگری کی پوری رپورٹ دے سکتا ہے۔ اس نے ساگری کی زندگی کی پوری کہانی اور اس کے جرائم کی تفصیلات سنا ڈالیں۔ اس نے اجمیری گیٹ کی ایک طوائف کا نام بتایا جس کے ساتھ ساگری کے گہرے تعلقات تھے اور وہ فارغ وقت اسی کے ہاں گذارتا تھا۔

دِلّی میں اجمیری گیٹ کے اندر عصمت فروشی کا مشہور اور بہت بڑا بازار تھا۔ میں نے اس کانسٹیبل سے اس طوائف کا ایڈریس بھی معلوم کر لیا۔ کانسٹیبل کو میں نے واپس بھیج دیا۔

اگلے روز میں اپنے دفتر گیا تو میں نے ٹیمینسن کو ایس ایچ او کی تحریری رپورٹ بھی دکھائی اور کانسٹیبل نے جو باتیں زبانی بتائی تھیں وہ بھی سنائیں۔ ٹیمینسن نے کہا کہ اس طوائف کو ابھی بلایا جائے۔ ہم نے اپنے ایک اے ایس آئی کو بلا کر کہا کہ وہ گاڑی لے جائے' ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بھی ساتھ لے اور اس طوائف کو ساتھ لے آئے۔

یہاں میں آپ کو عادی مجرموں کی نفسیات بتاتا ہوں۔ ان لوگوں کی تفریح یہی ہوتی تھی کہ طوائفوں کے پاس جا کر شراب پیتے تھے اور لُوٹے ہوئے مال سے عیش و عشرت کرتے تھے۔ چھوٹی موٹی وارداتیں تو ان لوگوں کی فطرت میں شامل تھیں اور یہی ان کی زندگی تھی لیکن قتل ایک ایسی واردات ہے جو کوئی بھی انسان ہضم نہیں کر سکتا۔ عموماً دیکھا گیا کہ عادی قاتل بھی قتل کی واردات کر کے اپنی مخصوص طوائف کے پاس جاتے اور شراب کے نشے میں بڑے فخریہ انداز میں طوائف کو بتاتے تھے کہ وہ قتل کی واردات کر آئے ہیں۔ ہم نے اس طوائف کو اسی توقع پر بلایا تھا کہ اس سے کوئی سراغ مل جائے گا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد طوائف آ گئی۔ وہ تقریباً تیس سال عمر کی اچھی خوبصورت طوائف تھی۔ ہم نے اسے بٹھایا۔ اس کی گھبراہٹ اور خوف قدرتی تھا۔ ہم

نے اسے ذہنی طور پر نارمل حالت میں لانے کے لئے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں بلکہ ٹینیسن نے اُس کے حُسن کی تعریف شروع کر دی اور کہا کہ وہ اس کے پاس آنا چاہتا ہے۔ ٹینیسن اردو اچھی خاصی بولتا تھا۔

"میں ایک بات بتا دیتا ہوں"— انسپکٹر ٹینیسن نے اسے کہا— "یہ نہ سمجھنا کہ ہم پولیس والے ہیں اس لئے تمہارے پاس مفت آئیں گے۔ ہم حُسن کی قدر کرنے والے آدمی ہیں۔ تمہیں پوری اُجرت اور بخشش بھی دیں گے"— ٹینیسن مجھ سے مخاطب ہو کر بولا— "کیوں ملک! تمہارا کیا خیال ہے"۔

"میرے خیال پوچھتے ہو؟"— میں نے کہا— "یہ پیشہ ور عورت تو لگتی ہی نہیں۔ یہ کسی بڑے اونچے گھرانے کی کالج میں پڑھنے والی نوجوان لڑکی لگتی ہے.... ہم اس کے گھر جائیں گے"۔

وہ آخر طوائف تھی جس کا سوسائٹی میں نہ کوئی مقام تھا نہ کوئی وقار تھا' ہم نے اسے ہوا دینی شروع کی تو وہ غبارے کی طرح پھولتی ہی چلی گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا کہ ہم نے اسے کیوں بلایا ہے۔

"تمہارا یار پھانسی چڑھ رہا ہے"— میں نے کہا۔

"کون؟"

"ساگری"— میں نے کہا— "اُس رات وہ تمہارے پاس گیا تھا اور اس نے تمہیں بتایا بھی تھا۔ وہ پورا بیان دے چکا ہے۔ تمہیں صرف تصدیق کے لئے بلایا ہے"۔

"ہاں!"— اس نے اس طرح کہا جیسے آہ لی جاتی ہے— "میرے پاس آیا تھا۔ اُس رات وہ بہت زیادہ پی گیا تھا۔ نشے میں واہی تباہی بکتا رہا اور اوٹ پٹانگ باتیں بھی کرتا رہا۔ اس نے کہا کہ آج دولت کمائی ہے۔ ایک لڑکے کو جلا کر راکھ کر دیا ہے' ہے کوئی جو میرے سامنے آئے!.... میں سمجھی کہ ڈھینگیں مار رہا ہے"۔

"نہیں!"— میں نے کہا— "ڈھینگیں نہیں وہ سچ کہہ رہا تھا.... تمہیں اس نے کتنی رقم بتائی تھی؟"

"پانچ ہزار کہتا تھا"— اُس نے جواب دیا— "میں نہیں مانی تھی۔ اتنی زیادہ رقم

کون دیتا ہے"۔

ہو سکتا ہے کچھ لوگ یقین نہ کریں کہ اس طوائف نے فوراً راز اُگل دیا۔ حیرت کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ دیکھیں کہ وہ طوائف تھی اور یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ طوائف اُس کی بھی نہیں ہوتی جس سے وہ ہزار ہا روپیہ کھاتی ہے اور ایسے کہتی ہے کہ وہ بس اسی کی ہے۔ طوائف یا کوئی بھی فاحشہ عورت روپے پیسے اور اپنی عیش و عشرت سے دلچسپی رکھتی ہے۔ اس کی ذات جذبات سے خالی ہوتی ہے اور جو لوگ اسے جذباتی سمجھتے ہیں وہ اس کی ایکٹنگ ہوتی ہے۔ وہ جب چاہے اپنے آنسو نکال لیتی ہے اور جب چاہے قہقہے بکھیرنے لگتی ہے۔ ساگری نے اسے اپنی محبوبہ بنا رکھا تھا اور اس طوائف نے بھی اسے یہی تاثر دے رکھا ہو گا کہ وہ اس کی محبوبہ ہے اور اس پر مرمٹی ہے لیکن اسے دو نئے گاہک اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ دونوں پولیس انسپکٹر تھے اور ان میں ایک انگریز تھا۔ طوائف کو کیا پڑی تھی کہ وہ ساگری کے لئے جھوٹ بولتی۔

طوائف کو ہم نے اس طرح رخصت کیا کہ اس کی گردن تنی ہوئی تھی اور وہ بہت خوش تھی۔ یہ ہماری گواہ تھی۔

آتشِ نمرود اور عشق

طوائف کے جانے کے بعد ہم نے ساگری کو حوالات سے نکلوا کر اپنے سامنے بٹھایا اور اسے کہا کہ وہ اقبالی بیان دے دے۔ ابھی تک وہ انکار پر ڈٹا ہُوا تھا۔ ہم نے ساری شہادت اس کے آگے رکھ دی۔ تھانے میں سے جو رپورٹ آئی تھی' وہ اُس کے آگے رکھی' طوائف کا حوالہ دیا۔

"دیکھ ساگری!"— میں نے کہا— "اگر تم اقبالی بیان نہیں دو گے تو ہمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا نقصان تمہارا ہو گا۔ بیان دے دو گے تو پوری کوشش کریں گے کہ تمہیں کم سے کم سزا ملے۔ اگر پریشان کرو گے تو ہم تمہیں سیدھا پھانسی کے تختے پر پہنچائیں گے.... تم نے کس شخص پر بھروسہ کیا ہے؟ ٹھیکیدار نے بیان دیا ہے کہ تم نے جمیل کو اپنی کسی دشمنی کی بناء پر آگ میں دھکا دیا تھا۔ ٹھیکیدار نے ہمیں گواہ بھی

دیئے ہیں.... اور پھر ایک طوائف پر تم نے بھروسہ کیا جو ابھی ابھی ہمیں بیان دے گئی ہے۔ اگر بیان نہیں دو گے تو ہم تمہیں باعزت طریقے سے تو رکھیں گے نہیں۔ تم جانتے ہی ہو کہ سی آئی اے والے ملزموں سے کس طرح بیان لیا کرتے ہیں"۔

وہ خود جرائم پیشہ تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پولیس کا ٹارچر کیسا ہوتا ہے۔ ہم نے اس کے آگے جو شہادت رکھی تھی' وہ ایسا جال تھا جس سے وہ نکل نہیں سکتا تھا۔ اس نے ٹھیکیدار کو گالیاں دینی شروع کر دیں اور اقبالی بیان دینے پر آ گیا۔ عموماً اقبالی بیان بہت لمبے ہُوا کرتے ہیں۔ ساگری کا بیان بھی خاصا لمبا تھا۔ میں اس کے ضروری حصے سناتا ہوں۔

ساگری ٹھیکیدار کا محافظ تھا اور بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کو کنٹرول کرنا بھی اس کی ڈیوٹی تھی۔ کاروبار کے سلسلے میں ٹھیکیدار کو ضرورت پڑتی کہ فلاں شخص کو ڈرانا دھمکانا ہے یا رکی ہوئی رقم نکلوانی ہے تو وہ ساگری کو استعمال کرتا تھا۔ ایک روز ٹھیکیدار نے اسے کہا کہ جمیل کو زمین کے تختے سے اٹھا دینا ہے۔ ساگری نے وجہ پوچھی تو ٹھیکیدار نے وجہ یہ بتائی کہ اس کی بیٹی جمیل کے ساتھ تانگے پر کالج جایا آیا کرتی تھی۔

ٹھیکیدار خاندانی امیر کبیر نہیں تھا۔ یہ لوگ دلی کے ایک پرانے محلّے میں رہتے تھے اور یہ ایک ہی برادری تھی۔ جمیل اور ٹھیکیدار کی بیٹی بچپن سے اکٹھے کھیلتے تھے۔ لڑکپن تک ان کا پیار ان کی روحوں میں اُتر چکا تھا۔ پھر یہ نوجوانی کی عمر میں داخل ہوئے تو حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ ٹھیکیدار کی قسمت کا دروازہ کھل گیا اور وہ دولت مند ٹھیکیدار بن گیا۔ ادھر جمیل یتیم ہو گیا۔ گھر کی دال روٹی پوری کرنی بھی محال ہو گئی۔

جمیل نے دس جماعتیں پاس کر لیں تو ٹھیکیدار نے اس پر رحم کیا اور ملازم رکھ لیا۔ ٹھیکیدار نے جمیل کو یہ ڈیوٹی بھی دے دی کہ وہ اس کی بیٹی کو تانگے پر کالج چھوڑ آیا کرے اور واپس بھی لے آیا کرے۔ ان دونوں میں پہلے ہی محبت تھی۔ انہیں بڑا اچھا اور جائز موقع مل گیا۔ ٹھیکیدار کی بیٹی نے دولت مندی سے اپنا دماغ خراب نہ ہونے دیا۔ اُس نے یہ سوچا ہی نہیں کہ اس کے مقابلے میں جمیل کی کوئی حیثیت ہی نہیں اور وہ اس کا نوکر ہے۔

شائستہ (ٹھیکیدار کی بیٹی) کے لئے رشتے کا ایک بڑا اچھا پیغام آ گیا۔ لڑکا تعلیم یافتہ اور بڑے امیر تاجروں کا بیٹا تھا۔ ٹھیکیدار نے ہاں کر دی۔ شائستہ نے اپنی ماں کو اعلانیہ

طور پر کہہ دیا کہ وہ اس آدمی کے ساتھ شادی نہیں کرے گی اور اگر اس کے ساتھ زبردستی کی گئی تو وہ نکاح کے وقت کہہ دے گی کہ میں اس شخص کو قبول نہیں کرتی.... شائستہ نے یہ بھی صاف صاف کہہ دیا کہ وہ جمیل کے ساتھ شادی کرے گی۔

اسے ماں نے پھر باپ نے اور بہنوں نے بھی سمجھایا لیکن اس نے کسی کی ایک نہ سنی۔ اس کا ایک ہی بھائی تھا جو ذہنی طور پر معذور تو نہیں تھا' کم عقل اور احمق سا تھا۔ اُس نے شائستہ پر رعب جھاڑا تو شائستہ نے کہا کہ وہ خود کشی کر لے گی۔ یہ طریقہ آزمایا گیا کہ جمیل کو شائستہ کے ساتھ کالج جانے سے روک دیا گیا اور اس احمق بھائی کو اس کے ساتھ تانگے میں جانے کو کہا گیا۔ شائستہ نے کالج جانے سے انکار کر دیا۔

باپ نے سوچا کہ اس کی شادی ہو جانی ہے' آگے پڑھ کر کیا کرے گی۔ اسے کالج جانے سے روک دیا گیا اور شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ شائستہ نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں بند کر لیا اور ساتھ یہ ضِد کہ جمیل کو بلاؤ۔ جمیل اس گھر میں آتا جاتا تھا لیکن اسے روک دیا گیا تھا۔ بیٹی کی حالت دیکھ کر ٹھیکیدار نے جمیل کو اپنے گھر بھیجنا شروع کر دیا۔

باپ کے لئے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔ اس نے ساگری کو بتایا اور کہا کہ جمیل کو اس طرح مارا جائے کہ شائستہ یہ نہ سمجھے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ یہ اتفاقی یا حادثاتی موت لگے۔ ساگری نے دو تین طریقے بتائے جو ٹھیکیدار نے اس وجہ سے مسترد کر دیئے کہ ان سے اغوا اور قتل کا شک ہوتا تھا۔ یہ طریقہ ٹھیکیدار نے سوچا کہ جمیل کو بھٹے کی آگ میں پھینکا جائے۔ ساگری کو یہ طریقہ سب سے زیادہ اچھا لگا۔

"یہ کام تم کرو گے"—— ٹھیکیدار نے ساگری سے کہا۔

"میرے سوا اور کون ہے جو یہ کام کر سکے؟"—— ساگری نے کہا—— "لیکن عالی جاہ! یہ بھی سوچ لیں کہ کسی نے دیکھ لیا تو پھانسی کا تختہ ہی ہے"۔

"پانچ ہزار ساگری!"—— ٹھیکیدار نے کہا—— "کام ہوتے ہی پانچ ہزار روپیہ نقد بصد شکریہ پیش کروں گا۔ میری عزت بچاؤ ساگری!"

"جمیل نہ رہا تو کیا لڑکی آپ کی پسند کی شادی کر لے گی؟"—— ساگری نے پوچھا۔

"مجھے امید ہے کر لے گی"—— ٹھیکیدار نے کہا—— "نہیں کرے گی تو میں اس کا

پتا بھی کاٹ دوں گا"۔

ساگری اور ٹھیکیدار نے جمیل کو بھٹے کی آگ میں پھینکنے کا پلان بنایا۔ ساگری نے کہا کہ بھٹے کے منشی کو چھٹی بھیج دیا جائے اور اس کی جگہ جمیل کو بھٹے پر یہ بتا کر بھیجا جائے کہ منشی کی غیر حاضری میں وہ بھٹے پر کام کرے گا۔

"باقی کام مجھ پر چھوڑ دیں"۔۔۔ ساگری نے کہا۔

پانچ ہزار میں بڑی طاقت تھی۔ ساگری نے بھٹے کے منشی کو جس طرح چھٹی بھجوایا' وہ میں منشی کی زبان سے سنا چکا ہوں۔ جمیل کو بھٹے پر بھیج دیا گیا۔ تین چار دن ساگری نے اس کے ساتھ دوستانہ بے تکلفی پیدا کر لی اور ایک دن بھٹے میں کچی اینٹیں رکھوا کر جہاں جہاں آگ جلانی تھی جلا دی گئی۔

ساگری نے جمیل سے کہا کہ آؤ تمہیں دکھاؤں کہ بھٹے میں کچی اینٹیں کیسے رکھی جاتی ہیں اور آگ کہاں کہاں جلائی جاتی ہے۔ پھر دیکھنا کچی اینٹیں اور آگ کو کس طرح ڈھانپ دیا جاتا ہے۔

جمیل کو موت ساگری کے ساتھ لے گئی۔ ساگری نے وہاں سے ان ورکروں کو جن کا وہاں کچھ نہ کچھ کام تھا' بھگا دیا اور انہیں کوئی اور کام بتا دیا۔ جمیل کو بھٹے کے کنارے کے ساتھ ساتھ لے جاتے ساگری اس کے پہلو کے ساتھ ساتھ رہا۔ آگے آگ کی ایک جگہ آ گئی۔ تپش اتنی زیادہ تھی کہ جمیل کنارے سے دُور ہٹنے لگا۔ ساگری نے اسے ہاتھوں سے آگ میں نہیں دھکیلا بلکہ جمیل کو اپنا کولہا اتنی زور سے مارا کہ جمیل آگ میں جا پڑا۔ وہ جگہ دس فٹ گہری تھی۔ جمیل کی صرف ایک چیخ سنائی دی۔

ساگری نے شور مچایا۔ مزدور اکٹھے ہو گئے۔ جمیل جل کر کوئلہ ہو چکا تھا۔

ٹھیکیدار کو اطلاع دی گئی۔ وہ آیا اور اس نے تھانے اطلاع دی۔ آگ پر پانی پھینکا گیا تھا۔ پانی گھڑوں اور کنستروں میں آنا تھا۔ آگ تو بجھ گئی لیکن یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس میں جل جانے والا کوئی انسان تھا یا کسی درخت کا تنہ تھا۔

ساگری نے اپنے بیان میں کہا کہ علاقہ تھانیدار سب انسپکٹر صداقت علی خان آیا اور رسمی سے بیان لے کر چلا گیا۔

"صداقت علی نے تفتیش تو کی ہو گی!"۔۔۔ میں نے کہا۔

"خاک تفتیش کی تھی"۔۔۔ ساگری نے کہا۔۔۔ "پانچ سو روپیہ لے کر اس نے لکھ دیا تھا کہ گواہوں اور عینی شاہدوں کے بیانات کی روشنی میں متوفی حادثاتی موت مرا ہے۔ ... ہم تو خوش تھے عالی جاہ' کہ معاملہ رفع دفع ہو گیا ہے لیکن جمیل کی ماں کی فریادیں خدا نے سن لیں"۔

ساگری کے بیان سے معلوم ہوتا تھا کہ ٹھیکیدار ساگری جیسے جرائم پیشہ' چرسی اور شرابی کے ساتھ اتنا بے تکلف تھا کہ اپنی بیٹی کی محبت کی اور اپنے گھر کی نازک باتیں بھی اس کے ساتھ کرتا تھا۔

باپ بیٹی عدالت میں

ٹھیکیدار کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

"خلیل الرحمان صاحب!"۔۔۔ میں نے اسے کہا۔۔۔ "آپ کے لئے انکار کی اب ذرا سی بھی گنجائش نہیں رہی۔ کہیں تو ساگری کا اقبالی بیان اور گواہوں کے بیان سنا دوں؟"

اس نے بڑی لمبی آہ لے کر پوچھا۔۔۔ "میرے لئے حکم؟"

"اقبالی بیان دے دو"۔۔۔ میں نے کہا۔

"اور اس بیان میں یہ ضرور شامل ہو"۔۔۔ انسپکٹر ٹیسنین نے کہا۔۔۔ "کہ تم نے سب انسپکٹر صداقت علی خان کو پانچ سو روپیہ دے کر لکھوایا تھا کہ یہ حادثاتی موت ہے۔ ... ہم سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہا۔ کچھ چھپاؤ گے تو ہم یہاں تمہاری ہڈیاں توڑیں گے پھر عدالت میں پیش کریں گے"۔

اس نے اقبالی بیان دے دیا۔ یہ وہی بیان تھا جو ساگری نے دیا تھا۔

"واہ اوئے ٹھیکیدار صاحب!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اپنی بیٹی کی شادی جمیل کے ساتھ کر دیتے تو کیا ہو جاتا۔ جمیل تمہارا رشتہ دار ہی تھا"۔

"یہ تو میری بے عزتی تھی صاحب!"۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ "رشتہ داری تو بعد کی بات ہے' اصل بات یہ تھی کہ وہ میرا نوکر تھا اور غریب تھا"۔

"تمہیں ایک حدیث سناؤں!" — میں نے ٹھیکیدار سے کہا — "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و آلہ نے فرمایا تھا کہ اللہ جمیل ہے اور وہ جمال کو پسند کرتا ہے۔ حقیقت کو جھٹلانے اور دوسروں کو حقیر جاننے کو تکبّر کہتے ہیں جو اللہ کو پسند نہیں.... تمہیں تکبّر کی سزا مل رہی ہے۔ تم نے دولت کو خدا بنا لیا تھا"۔

ٹھیکیدار نے مجھے اور انسپکٹر ٹینیسن کو رشوت پیش کی۔

"مجھے اس کیس سے نکال دو" — اس نے کہا — "جتنی رقم کہو گے فوراً دوں گا"۔

"یتیم کا خون ہضم نہیں ہو سکتا ٹھیکیدار صاحب!" — میں نے کہا — "یہ خون ہمیں تو نہ پلاؤ یار!.... ایک بیوہ ماں کی آہوں کا عذاب دیکھ لو"۔

ہماری تفتیش ختم ہو چکی تھی۔ ٹینیسن نے اُسی وقت ایس پی تھامسن کو جا کر اپنی کامیابی کی خبر سنائی اور اسے کہا کہ سب انسپکٹر صداقت علی خان کو معطل کرانا ہے۔

صرف اقبالی بیان ملزم کو سزا نہیں دلا سکتا۔ اس کے مطابق شہادت اور ثبوت عدالت میں پیش کرنے پڑتے ہیں۔ ساگری نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ وہ فلاں طوائف کے پاس گیا تھا اور شراب کے نشے میں اس نے طوائف کو بتایا تھا.... طوائف بیان میں شامل تھی اس لئے طوائف کو عدالت میں پیش کرنا ضروری تھا۔ اسے اطلاع بھجوا دی کہ اگلے روز ہمارے پاس آ جائے۔

چونکہ یہ قتل ٹھیکیدار کی بیٹی کے باغیانہ رویے کی وجہ سے ہوا تھا' اس لئے اس لڑکی کا بیان بحیثیت گواہ ضروری تھا۔ اسے بھی ہم نے اطلاع بھجوا دی کہ اگلے روز یہاں آ جائے۔

یہ خیال رہے کہ جمیل کے قتل کے بعد ٹھیکیدار نے اپنی بیٹی کی شادی وہیں کر دی تھی جنہوں نے اس لڑکی کا رشتہ مانگا تھا۔

شام گہری ہو گئی تھی۔ ہم نے ٹھیکیدار کو حوالات میں بند کر دیا۔ ہم دونوں انسپکٹروں نے اُس روز کی تفتیش یہیں پر رہنے دی اور اپنے اپنے ٹھکانے کو چل دیئے.... میں نے کہا ہے کہ ہماری تفتیش مکمل ہو گئی تھی لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اس تفتیشی کہانی کا ایک انتہائی جذباتی' عجیب و غریب اور دلوں کو ہلا دینے والا حصہ ابھی باقی ہے۔

اگلے روز ہمارے پاس جو گواہ آئے' ایک تو وہ طوائف تھی جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ وہ ایسی بے تکلّفی سے ہمارے پاس آ کر بیٹھی اور شوخیاں کرنے لگی جیسے ہم نے اسے مجرے کے لئے بلایا ہے اور اسے یہاں وہیں ملیں گی۔ ہم نے اسے بتایا کہ وہ گواہ ہو گی اور عدالت میں بیان دے گی۔ میں نے اس کا بیان لکھ لیا اور اسے فارغ کر دیا۔

دوسری گواہ ٹھیکیدار کی بیٹی شائستہ تھی جو اپنے خاوند کے ساتھ آئی تھی۔ میں اُس وقت طوائف کا بیان لکھ رہا تھا۔ طوائف کو فارغ کر کے شائستہ کو بلایا۔ اس کی بجائے اس کا خاوند ہمارے پاس آ گیا اور اس نے بتایا کہ وہ شائستہ کا خاوند ہے۔

"آپ شائستہ کو ہمارے پاس بھیجیں" — میں نے اسے کہا — "اور آپ بالکل مطمئن رہیں۔ آپ کی بیگم سے ایک دو باتیں پوچھنی ہیں پھر انہیں آپ کے ساتھ ہی بھیج دیں گے"۔

"جی نہیں!" — اس نے کہا — "میرا یہ مطلب نہیں۔ آپ پولیس آفیسر ہیں۔ مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے۔ اپنی بیوی کو آپ کے پاس بھیجنے سے پہلے میں آپ کو ایک دو ضروری باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ پھر آپ اسے الگ بٹھا کر جو چاہیں پوچھیں"۔

میں نے انسپکٹر ٹینیسن کی طرف دیکھا۔ اس نے سر ہلایا کہ اس کی بات سن لی جائے۔ میں نے اسے بٹھایا اور یہ بہتر سمجھا کہ اسے بتا دیا جائے کہ ٹھیکیدار گرفتار ہو چکا ہے تاکہ اس نے جو بھی بات کرنی ہے اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر کرے کہ اب ٹھیکیدار ان کے ساتھ نہیں بلکہ اب وہ ہمارا قیدی ہے۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ ٹھیکیدار صاحب کو ہم نے گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں!" — اس نے چونک کر حیرت زدگی کے لہجے میں کہا — "کیا واقعی؟.... مجھے امید ہے کہ میری بیوی یہ خبر سن کر خوش ہو گی کہ اس کا قاتل باپ پکڑا گیا ہے"۔

"قاتل؟" — انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا — "آپ کو کس نے بتایا ہے کہ ٹھیکیدار قاتل ہے؟"

"میری بیوی کو یہی شک تھا" — اس نے کہا — "میری بیوی سے آپ سب کچھ

پوچھ ہی لیں گے۔ میں آپ کو ایک ایسی بات بتانا چاہتا ہوں جو آپ سن کر شاید حیران ہوں گے.... ٹھیکیدار کی اس بیٹی کے ساتھ میری شادی ہوئی۔ میں بہت خوش تھا کہ ایک بڑی خوبصورت اور ہر لحاظ سے اچھی لڑکی کے ساتھ میری شادی ہوئی ہے لیکن پہلی رات جب میں اس لڑکی شائستہ کے پاس بیٹھا تو اس نے بڑے ہی پیارے انداز سے یہ الفاظ کہے کہ آپ نے مجھے اغوا نہیں کیا نہ ہی آپ نے یا آپ کے والدین نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں کہ مجھے آپ کے ساتھ بیاہ دیا گیا ہے' اس لئے میں آپ کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کروں گی' میں آپ کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ میں نے آپ کو دل سے قبول نہیں کیا لیکن میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔ میرا جسم آپ کا ہے' آپ اسے جس طرح چاہیں استعمال کر سکتے ہیں لیکن جذباتی طور پر میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گی....

"میں نے اُس کی اس بات پر کوئی شدید یا بے ہودہ ردِعمل ظاہر نہ کیا لیکن جناب میں مرد ہوں' میں تو سر سے پاؤں تک ہل گیا۔ بیوی سے پوچھا کہ میں اس کی پسند کا خاوند نہیں یا وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔ اُس نے بلا جھجک کہا کہ آپ نے سنا ہو گا کہ میرے ابا جان کے بھٹے پر ایک نوجوان آدمی آگ میں گر کر جل گیا ہے.... میں نے اسے بتایا کہ میں جانتا ہوں اور میں اس لڑکے کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ میری بیوی نے کہا کہ میں اس لڑکے کو چاہتی تھی اور میں نے اپنے والدین سے کہہ دیا تھا کہ میری شادی اسی کے ساتھ ہو گی۔ میرے باپ نے جب دیکھا کہ میں نہیں مان رہی تو ایک روز خبر آئی کہ یہ لڑکا جس کا نام جمیل تھا بھٹے پر آگ میں گر کر جل گیا ہے۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ اسے آگ میں گرایا گیا ہے۔ بھٹے پر جمیل کا کوئی کام نہیں تھا۔ اسے میری زندگی سے نکالنے کا یہ ظالمانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ پھر میری بیوی نے مجھے یہ بھی کہا کہ آپ یہ نہ سمجھنا کہ جمیل کے ساتھ میرے تعلقات ناجائز تھے۔ میری عصمت محفوظ ہے۔ جمیل کو میری زندگی سے نکالا گیا ہے' اسے کوئی طاقت میرے دل سے نہیں نکال سکتی۔ میں آپ سے باغی نہیں ہوں گی۔ آپ جو کہیں گے میں اسے حکم سمجھ کر اس کی تعمیل کروں گی لیکن جذباتی طور پر میں آپ کے ساتھ نہیں ہوں گی۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ میں ایک زندہ لاش ہوں جس کے ساتھ آپ کھیل سکتے ہیں....

"معلوم نہیں صاحب! کیا بات ہوئی کہ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اس لڑکی کو

پناہ دوں گا اور اسے کھلونا نہیں بناؤں گا اور اپنے ماں باپ کو یا کسی اور کو پتہ نہیں چلنے دوں گا کہ اُس نے میرے ساتھ یہ بات کی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ میں بغیر کسی گلے شکوے کے اسے اپنے ساتھ رکھوں گا' اس کے جسم کو خاوند بن کر استعمال نہیں کروں گا میں اسے اجازت دیتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ کھل کر باتیں کرے' جمیل کی باتیں کرے اور میں وہی کروں گا جو وہ کہے گی.... میں نہیں سمجھ سکتا کہ میرا یہ کہنا ایک نیکی ہے یا بُزدلی لیکن یہ باتیں کہہ کر مجھے روحانی سی تسکین محسوس ہوئی۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے اور اپنی آنکھوں سے لگائے اور پھر وہ بہت روئی۔ وہ رات اسی طرح گزر گئی۔ آج ہماری شادی کو بیس اکیس روز ہو گئے ہیں' میں نے خاوند کی حیثیت سے اس کے جسم کو بیوی کا جسم سمجھ کر استعمال نہیں کیا یعنی جسمانی طور پر ہم ابھی تک میاں بیوی بنے ہی نہیں"۔

"کیا آپ ساری عمر اسی طرح گذار دیں گے؟"— میں نے پوچھا۔

"انسپکٹر صاحب!" — اُس نے خود اعتمادی سے کہا — "میں نے خدا کے نام پر اس لڑکی کو مظلوم سمجھ کر اپنی پناہ میں لے رکھا ہے۔ مجھے خدا کی درگاہ سے پوری امید ہے کہ میری یہ نیکی ضائع نہیں جائے گی۔ اگر میں اسے طلاق دے دوں تو اس کا ظالم باپ اس کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرے گا۔ لڑکی خودکشی بھی کر سکتی ہے۔ اس کا ذہنی توازن بھی بگڑ سکتا ہے۔ اس ذہنی حالت میں یہ گھر سے نکل گئی تو بہت بُرے انجام کو پہنچے گی پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ مجھے اپنا سہارا اور پناہ سمجھ رہی ہے۔ شادی کے بعد ایک بار بھی اپنے ماں باپ کے گھر نہیں گئی۔ اس کے ماں باپ تین چار مرتبہ میرے گھر آئے تو یہ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ وہ جب بھی آ کر چلے جاتے تو میری بیوی کہتی کہ مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے۔ انہیں کہو کہ میرے گھر نہ آیا کریں.... اب میں اپنی بیوی کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں"۔

وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ میں اور انسپکٹر ٹینیسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کچھ دیر دیکھتے ہی رہے۔ میں نے اپنی سروس میں عجیب و غریب کردار دیکھے ہیں لیکن یہ شخص سب سے زیادہ انوکھا اور عجیب تھا۔ ہم دونوں انسپکٹر ابھی ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کر سکے تھے کہ ایک خوبصورت لڑکی' بڑے ہی سمارٹ جسم والی کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کے چہرے پر اُداسی تھی۔ میں نے کرسی کی طرف اشارہ

کر کے اسے کہا کہ وہ بیٹھ جائے۔

"کیا آپ نے واقعی میرے باپ کو گرفتار کر لیا ہے؟" — شائستہ نے اداس سے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں شائستہ!" — میں نے کہا — "کل اسے اور اس کے یار ساگری کو جمیل کو آگ میں پھینک کر قتل کر دینے کے جرم میں گرفتار کر لیا ہے"۔

"اللہ تیرا شکر!" — شائستہ نے آسمان کی طرف دیکھا اور دوپٹہ ہاتھوں میں پھیلا کر کہا — "قاتل آخر پکڑے گئے۔ اب میری روح کو تسکین مل گئی ہے"۔

"کیا تمہیں اپنے والد صاحب کی گرفتاری کا افسوس نہیں؟" — انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

"نہیں!" — شائستہ نے دانت پیس کر کہا — "مجھے اس شخص سے نفرت ہے۔ میں اپنے ہاتھ سے اس شخص کے گلے میں پھانسی کا پھندہ ڈالنا چاہتی ہوں"۔

ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اپنے خاوند کے ساتھ اس کے تعلقات کیسے ہیں اور اس کی ازدواجی زندگی کس طرح گزر رہی ہے' ہم نے اس سے یہ تصدیق کرانی تھی کہ یہ مقتول کو چاہتی تھی اور مقتول کے قتل کا باعث یہی تھا۔ میں نے اور انسپکٹر ٹینیسن نے دو چار سوالات کر کے یہ تصدیق کر لی اور شائستہ سے پوچھا کہ وہ عدالت میں بیان دینے آئے گی؟

"کیوں نہیں آؤں گی" — اُس نے بلند آواز سے کہا — "میں چلّا چلّا کر لوگوں کو سناؤں گی کہ یہ شخص قاتل ہے اور قتل کی وجہ یہ ہے"۔

ہم نے شائستہ اور اس کے خاوند کو رخصت کر دیا لیکن یہ دونوں مجھے جذباتی طور پر ہلا گئے۔

ساگری کا بیان زیرِ دفعہ 164 مجسٹریٹ سے قلمبند کروا کے اسے جوڈیشل لاک اَپ میں بھیج دیا۔ ٹھیکیدار نے مجسٹریٹ کو بیان قلمبند کروانے سے انکار کر دیا تھا۔ دو روز ہماری حوالات میں رہا پھر خود ہی بیان دینے پر آ گیا۔ اس کا بیان لے کر ہم نے جوڈیشل لاک اَپ میں بھیج دیا۔ پھر مقدمہ چلا۔ مقدمہ تو ویسے ہی چلتا رہا جیسے ہر مقدمہ چلا کرتا ہے لیکن شائستہ جب گواہی دینے آئی تو کورٹ پر سناٹا طاری ہو گیا۔ وہ ہاتھ باپ کی

طرف بڑھا بڑھا کر بیان دیتی اور کہتی تھی کہ یہ شخص قاتل ہے۔ دو تین مرتبہ سیشن جج نے اسے کنٹرول کرنے کی کوشش کی لیکن لڑکی اتنی بھڑکی ہوئی تھی کہ اس نے بیان تو ٹھیک دیا لیکن وہ آگ بگولہ بنی ہوئی تھی۔ صفائی کے وکیل کی جرح کے جواب بھی اس نے پوری خوداعتمادی اور جوش و خروش سے دیئے۔ میں بطور نمونہ اس جرح کی ایک جھلک پیش کرتا ہوں جو مجھے آج تک یاد ہے۔

"کیا تم جمیل کو چاہتی تھیں؟" — صفائی کے وکیل نے شائستہ سے پوچھا۔

"ہاں!" — شائستہ نے خوداعتمادی سے جواب دیا — "ہم دونوں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے تھے"۔

"کیا تمہارے اس کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے؟" — وکیل صفائی نے پوچھا۔

"لعنت تمہارے اس مکروہ چہرے پر!" — شائستہ نے جواب دیا۔

کورٹ میں جتنے لوگ تھے وہ سب ہنس پڑے۔ سیشن جج نے اسے کہا کہ وہ بدتمیزی نہ کرے' وکیلوں کو حق حاصل ہے کہ وہ جو سوال چاہیں کر سکتے ہیں۔

"پھر یہ حق مجھے بھی دیں کہ میں جو جواب چاہوں دوں" — شائستہ نے جواب دیا۔

یہ تو خاصی لمبی چوڑی باتیں ہیں میں آپ کو مقدمے کا انجام بتاتا ہوں۔ ٹھیکیدار کو آٹھ سال سزائے قید ہوئی اور ساگری کو سزائے موت دی گئی۔ دونوں نے ہائی کورٹ میں اپیلیں دائر کیں۔ دونوں اپیلیں مسترد ہو گئیں۔

ہمارا ایک کیس ختم ہو گیا اور ہم نے ایس پی تھامسن سے داد و تحسین حاصل کی لیکن ہم نے سب سے زیادہ دعائیں شائستہ سے لیں۔ دو تین مہینوں تک شائستہ اور اس کا خاوند میرے ذہن پر سوار رہے۔

تقریباً ایک سال بعد میں اپنی بیوی اور بچوں کو سیر سپاٹے کے لئے آگرہ لے گیا۔ میری بیوی کو تاج محل بہت ہی پسند تھا۔ دو بار پہلے دیکھ چکی تھی۔ وہاں گئے تو وہاں شائستہ اور اس کا خاوند مل گئے۔ وہ بھی سیر کے لئے آئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ شائستہ کچھ زیادہ ہی خوش و خرم تھی۔ انہوں نے پہلی خبر یہ سنائی کہ ساگری تو پھانسی چڑھ گیا تھا اور ٹھیکیدار کو جیل میں تین مہینوں بعد فالج کا اتنا شدید حملہ ہُوا کہ وہ مر گیا۔

"اس کی لاش گھر آئی تو میں وہاں نہیں گئی تھی"—شائستہ نے کہا—"میرے سسرال کے سب لوگ گئے تھے' میں نہیں گئی.... میرا باپ جب گرفتار ہُوا تھا تو میرا ذہن کچھ کچھ ٹھکانے آگیا تھا۔ جب میرے باپ کو آٹھ سال سزا ہوئی تو میرا ذہن آدھے سے زیادہ بیدار ہو گیا اور جب اس کی موت کی اطلاع ملی تو میں پوری طرح اپنے آپ میں آگئی۔ یہ میرا خاوند سُن رہا ہے' میں نے ان کے پاؤں چھو کر کہا کہ میں اب جذباتی اور روحانی لحاظ سے آپ کی ہوں۔ ان سے پوچھ لیں' میں تو کہتی ہوں کہ یہ ایک فرشتہ تھا جو اللہ نے میری نجات کے لئے اتارا ہے۔ کون سادہ خاوند ہے جو بیوی کی باتیں برداشت کرلے گا جو انہیں میں نے پہلی رات کہی تھیں۔ میں انہیں اس نیکی کا پورا پورا صِلہ دے رہی ہوں"۔

میں نے اُس کے خاوند کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر سکون تھا اور وہ مُسکرا رہا تھا۔

"اب ہم صحیح معنوں میں میاں بیوی ہیں"—شائستہ کے خاوند نے کہا۔

یہ ان کے ساتھ میری آخری ملاقات تھی۔ چند مہینوں بعد پاکستان کے قیام کا اعلان ہو گیا اور میں یومِ آزادی سے کچھ پہلے ہی پاکستان آگیا۔

* * *

حویلی اور سویلی

قتل کی کہانیاں تو میں نے آپ کو بے شمار سنا ڈالی ہیں۔ آپ نے نوٹ کیا ہو گا کہ قتل کی واردات کسی بھی طریقے سے ہو اور اس کے اردگرد حالات اور واقعات جیسے کیسے بھی ہوں' قتل کی ہر کہانی اور اس کی تفتیش ایک ہی جیسی ہوتی ہے اس لئے پڑھنے والے قتل کی کہانیوں سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ قتل کی واردات کی تفتیش مشکل نہیں ہوتی بشرطیکہ تفتیشی افسر اپنے دماغ کو حاضر رکھے اور دیانتداری سے تفتیش کرے۔ صرف یہ پتہ چل جائے کہ قتل کی تحریک کیا تھا یعنی کس وجہ سے وہ آدمی قتل ہُوا تو پھر قاتل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔

اس کے مقابلے میں سَرقہ یا ڈکیتی کی تفتیش بہت ہی مشکل ہوتی ہے۔ سَرقہ یعنی چوری چکاری کے ملزم کو پکڑنے کے لئے تھانیدار کو جادوگر بننا پڑتا ہے۔ انگریزوں کے وقتوں میں اُس تھانیدار کو جلدی ترقی ملتی تھی جو چوری اور ڈکیتی کی زیادہ سے زیادہ وارداتوں کے ملزموں کو پکڑنے میں کامیاب ہوتا تھا۔ قتل کی تفتیشوں میں سو فیصد کامیابیوں پر بھی انگریز افسر اتنے زیادہ خوش نہیں ہوتے تھے جتنی شاباش وہ چوری اور ڈکیتی کی کامیاب تفتیشوں میں دیتے تھے۔ وجہ یہ ہے کہ قتل کی وجوہات کئی ایک ہوتی ہیں۔ مثلاً خاندانی دشمنی' انتقامی قتل' ناجائز تعلقات' جائداد کا جھگڑا وغیرہ لیکن چوری کی وجہ صرف چوری ہوتی ہے اس لئے اس کی تفتیش بہت ہی مشکل ہوتی ہے۔

آج کل تو چوری اور ڈکیتی بلکہ قتل بھی بہت ہی آسان وارداتیں بن گئی ہیں۔ علاقے کے تھانیدار کے ساتھ مُک مُکا کر لو تو جو جی میں آئے کرو۔ کسی کے گھر میں جا گھسو' پستول خواہ نقلی ہی ہو' گھر والوں کو دکھا کر لوٹ مار کر آؤ۔ اگر تھانے والوں کا حصہ نکالنا بھول جاؤ گے تو کسی روز کوئی واردات کئے بغیر ہی پکڑے جاؤ گے اور کئی وارداتوں کا مال آپ کے گھر سے برآمد ہو گا۔

آیئے آپ کو اپنے وقتوں کی چوری کی ایک واردات سناؤں۔ پہلے یہ سن لیں کہ اُس وقت چوری چکاری اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں اِسی پیشے کے آدمی کیا کرتے تھے۔ ایسی واردات ہو جاتی تو سب سے پہلے علاقے کے پیشہ وروں کو پکڑ کر تھانے لایا جاتا اور ان کی "خاطر تواضع" کی جاتی تھی۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ کسی اچھے خاصے باعزت گھرانے کے کسی فرد نے چوری کی واردات کی ہو۔ اگر چوری کا ملزم غیر پیشہ ور اور کسی بھلے گھرانے کا فرد ہوتا تو پھر بہت ہی مشکل پیش آجاتی تھی۔

ایک صبح ایک باپردہ عورت محلے کے دو معززین کے ساتھ تھانے میں آئی۔ اس خاتون نے بتایا کہ اس کا خاوند بسلسلہ کاروبار دو تین دنوں کے لئے باہر گیا ہُوا ہے۔ گذشتہ رات، بنصف شب کے لگ بھگ، یہ خاتون برآمدے میں گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ کسی نے اُسے جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ جگانے والے کے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی اور دوسرے ہاتھ میں چاقو تھا۔ بچے سوئے ہوئے تھے۔ بچوں میں کوئی جوان بیٹا یا بیٹی نہیں تھی۔ ظاہر ہے یہ خاتون بہت ہی خوفزدہ ہو گئی ہو گی۔

"خاموشی سے اٹھو" — ملزم نے کہا — "اور الماری سے تمام زیورات نکال دو۔ شور کرو گی تو چاقو دیکھ لو۔ تمہارے سامنے تمہارے ایک سوئے ہوئے بچے کو ذبح کر دوں گا"۔

یہ خاتون جس کی عمر تیس اور پینتیس سال کے درمیان تھی اور بڑی اچھی شکل و صورت والی گوری چٹی تھی، خوف سے کانپتی ہوئی اٹھی اور اندر کمرے میں چلی گئی۔

"میری ایک بات مانو" — خاتون نے کمرے میں جاکر ملزم سے کہا — "گھر میں جتنی نقد رقم ہے وہ لے جاؤ، زیورات نہ لے جاؤ"۔

"اپنی رقم اپنے پاس رکھو" — ملزم نے کہا — "میں زیورات لینے آیا ہوں"۔

"چلو، یہ مان لو" — خاتون نے ملزم سے کہا — "میری دوستی قبول کر لو۔ دیکھو میں کتنی خوبصورت ہوں۔ جب جی چاہے میرے گھر آجایا کرنا اور جہاں بھی بلاؤ گے میں پہنچ جایا کروں گی"۔

یہاں میں اپنی ایک رائے دینا چاہتا ہوں۔ یہ خاتون جب مجھے واردات کی تفصیل سنا رہی تھی تو اُس وقت وہ میرے پاس اکیلی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ آئے ہوئے

معززین کو باہر بٹھا دیا تھا۔ یہ عورت واقعی خوبصورت تھی۔ اُس نے کالا برقع لے رکھا تھا۔ نقاب اٹھا ہُوا تھا۔ کالے بُرقعے میں اُس کا گورا رنگ اور ہی زیادہ پُرکشش لگ رہا تھا۔ بہرحال میں اسے پردہ نشین اور قابلِ احترام خاتون سمجھتا تھا۔ اگر وہ مجھے یہ بات نہ بتاتی کہ اس نے اپنے زیورات بچانے کے لئے ملزم کو اپنا آپ پیش کر دیا تھا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کے یہ الفاظ جو میں نے اوپر تحریر کئے ہیں، یہ مجھے تفتیش میں کوئی مدد نہیں دے سکتے تھے لیکن اس عورت نے ذرا سی بھی جھینپ اور جھجک کے بغیر، شرم و حیاء کو نظرانداز کر کے یہ الفاظ منہ سے نکالے تو مجھے دھچکا سا لگا۔ فوراً میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ یہ خاتون کوئی شریف عورت نہیں۔ ایسی بات زبان پر لاتے ہوئے اسے ذرا سی جھجک ہونی چاہئے تھی لیکن اس نے یہ الفاظ بڑی بے تکلفی سے کہہ ڈالے۔

ملزم نے اس کی یہ پیشکش بھی ٹھکرا دی اور کہا کہ وہ صرف زیورات لینے آیا ہے۔

"میرے بچوں پر رحم کرو میرے بھائی!" — خاتون نے منت سماجت کی — "یہ زیورات میرے خاوند اور میرے باپ کی عمر بھر کی کمائی ہے"۔

"تم نے مجھے بھائی کہا ہے" — ملزم نے کہا — "میں تمہیں اپنی بڑی بہن کہتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہوں کہ یہ زیورات نہ تمہارے باپ کی کمائی ہے نہ تمہارے خاوند کی۔ یہ سب خود ہی نکال کر میرے حوالے کر دو ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ میں نے تمہیں اپنی بڑی بہن کہا ہے"۔

ملزم نے چاقو کی نوک اس کے بائیں کان کے نیچے گردن کے ساتھ لگا دی اور کہا وہ الماری کے تالے کی چابیاں نہیں دے گی تو وہ تالا توڑ کر مال لے جائے گا۔ پھر وہ اس خاتون کا پیٹ چاک کر کے اس گھر سے نکلے گا۔

خاتون مجبور ہو گئی۔ اس نے چابیوں کا گچھا نکالا اور ملزم کے حوالے کر دیا۔ ملزم نے اسے کہا کہ الماری کی چابی نکالو اور تالا کھولو۔

خاتون نے تالا کھول کر الماری کھول دی۔ ٹین کا بنا ہوا تقریباً ایک فٹ لمبا اور نو دس انچ چوڑا اور تقریباً چھ انچ اونچا سوٹ کیس کی قسم کا ایک ڈبہ الماری میں رکھا ہوا تھا۔ اس پر بڑے ہی خوشنما رنگا رنگ بیل بوٹے پینٹ کئے ہوئے تھے۔ اُسے بھی چھوٹا

سا تالا لگا ہُوا تھا۔ خاتون نے یہ ڈبہ اپنے ہاتھوں اٹھا کر ملزم کے حوالے کر دیا۔ ملزم کے کہنے پر اس نے ڈبہ کھولا۔

الماری کے ساتھ پلنگ بچھا ہُوا تھا۔ ملزم نے زیورات کا ڈبہ پلنگ پر رکھا اور ڈبے میں ہاتھ ڈالا۔ وہ شاید زیورات دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی اور دوسرے ہاتھ میں چاقو تھا۔ ڈبے میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس نے چاقو پلنگ پر رکھ دیا۔ رکھا بھی اس طرف جس طرف عورت کھڑی تھی۔ عورت نے بڑی پُھرتی سے چاقو اٹھا لیا اور ملزم کو مارنے لگی لیکن ملزم زیادہ تیز نکلا۔ اُس نے اس عورت کی اس ہاتھ کی کلائی پکڑ لی جس ہاتھ میں چاقو تھا۔ خاتون جوان تھی۔ اس نے پوری کوشش کی کہ چاقو ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ کچھ دیر کشمکش جاری رہی۔ یہ آخر عورت تھی اور ملزم مرد تھا اور جوان بھی تھا۔

خاتون نے مجھے بتایا کہ اس کا ہاتھ اس طرح ٹیڑھا ہو گیا کہ چاقو کی نوک ملزم کی کلائی پر لگی اور وہاں تھوڑا سا زخم ہو گیا۔ ملزم نے چاقو چھین لیا اور خاتون کا دوپٹہ پھاڑ کر اپنی کلائی پر باندھ لیا کیونکہ وہاں سے خون نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ ملزم نے دوسرا کام یہ کیا کہ خاتون کا دوپٹہ لے کر اس کے ہاتھ دوپٹے سے پیٹھ کے پیچھے کر کے باندھ دیئے۔ دوپٹہ خاصا لمبا تھا۔ ملزم نے دوپٹے کا دوسرا سرا خاتون کے منہ پر اس طرح باندھا کہ آگے سے دوپٹہ اس کے منہ کے اندر چلا گیا تھا۔ اس نے خاتون کے سر کے پیچھے دوپٹے کو گانٹھ دے دی۔

ملزم نے ڈبہ بند کیا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس نے خاتون کے پاؤں نہیں باندھے تھے۔ ملزم باہر نکلا تو خاتون آہستہ آہستہ چلتی باہر نکلی۔ ملزم نے ڈیوڑھی کا اندر والا دروازہ کھولا اور چلا گیا۔ خاتون نے پیٹھ پیچھے بندھے ہوئے ہاتھوں پر زور دیا تو اتفاق سے اس کا ایک ہاتھ آزاد ہو گیا۔ اس نے دوسرا ہاتھ بھی کھول لیا اور منہ سے بھی دوپٹہ کھول دیا۔ پھر اس نے شور مچایا اور محلے کے لوگ آ گئے۔

اُس زمانے میں قصبوں میں سرکاری پہرے کا انتظام ہوتا تھا۔ اس محلے کا چوکیدار بھی پہنچ گیا۔

مال جو چوری ہُوا وہ صرف زیورات تھے جو تمام کے تمام سونے کے تھے۔

ملزم اناڑی تھا

خاتون کی رپورٹ ختم ہو گئی۔ میں نے دونوں معززین کو اندر بلا لیا اور انہیں بتایا کہ میں نے ساری بات سن لی ہے اور اب مجھے ذرا گائیڈ کریں۔ میں نے ایک بات یہ ذہن میں محفوظ کر لی تھی کہ ملزم نے کہا تھا کہ الماری سے زیورات نکال دو۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ملزم کو معلوم تھا کہ زیورات الماری میں رکھے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس واردات میں ایک گھر بھیدی بھی تھا۔ یہ کوئی نوکر ہو سکتا تھا یا نوکرانی۔

دوسری بات یہ نوٹ کی کہ ملزم نے خاتون سے یہ کہا تھا کہ تم میری بڑی بہن ہو۔ خاتون کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہُوا کہ ملزم تیس سال سے کم عمر کا تھا۔

"کیا آپ نے ملزم کو پہچانا نہیں تھا؟" — میں نے خاتون سے پوچھا۔

"نہیں" — خاتون نے جواب دیا — "اس نے سر اور چہرہ منڈاسے میں یعنی پگڑی میں اس طرح چھپا رکھا تھا کہ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں"۔

"کپڑے کیسے تھے؟"

"میں بہت ڈری ہوئی تھی" — خاتون نے جواب دیا — "اور گھبراہٹ اتنی زیادہ تھی کہ میں ملزم کے کپڑے اور ان کا رنگ اچھی طرح نہ دیکھ سکی۔ میرا خیال ہے کہ قمیض سفید تھی اور اس پر ہلکے رنگ کی دھاریاں تھیں اور نیچے غالباً پاجامہ تھا.... میں اس لئے بھی اسے اور اس کے کپڑوں کو اچھی طرح نہ دیکھ سکی کہ اس نے زیادہ دیر ٹارچ کی روشنی میرے منہ پر رکھی تھی"۔

"ٹارچ کا سائز کیا تھا؟" — میں نے پوچھا — "چھوٹی تھی' درمیانے سائز کی تھی یا لمبے سائز کی؟.... آپ نے چھوٹی بڑی ٹارچیں اکثر دیکھی ہوں گی"۔

"میں بتاتی ہوں" — خاتون نے کہا — "ٹارچ بالکل چھوٹی نہیں تھی اور بہت لمبی بھی نہیں تھی۔ میں نے بتایا ہے کہ ٹارچ کی روشنی میری آنکھوں میں پڑ رہی تھی اس لئے میں کوئی چیز اچھی طرح دیکھ نہیں سکتی تھی۔ میں یہ اندازہ ٹارچ کے شیشے سے

کر رہی ہوں۔ شیشہ درمیانے سائز کا تھا اور خاص بات یہ کہ ٹارچ کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اس کا بلب صاف نظر آ رہا تھا"۔

اگر اس خاتون نے ہر بات صحیح بتائی ہے تو میری رائے یہ تھی کہ یہ کوئی پیشہ ور ملزم نہیں بلکہ کوئی اناڑی اور نو آموز ہے جسے استاد نے ٹریننگ نہیں دی۔ اگر وہ پکّا جرائم پیشہ ہوتا تو چاقو پلنگ پر نہ رکھتا' پھر وہ اس عورت کے صرف ہاتھ نہ باندھتا بلکہ پاؤں بھی باندھ دیتا۔ خاتون نے مجھے اور بھی بہت سی باتیں بتائی تھیں جو تمام کی تمام سنانی ضروری نہیں۔ ایسی کچھ اور باتوں سے بھی میری یہی رائے پکّی ہوتی جا رہی تھی کہ ملزم اناڑی اور کچّا ہے۔

"آپ نے کہا ہے کہ ملزم ڈیوڑھی کا اندر والا دروازہ کھول کر چلا گیا" — میں نے پوچھا — "کیا یہ دروازہ پہلے ہی کھلا ہوا تھا یعنی اس کی زنجیر یا چٹخنی چڑھی ہوئی تھی یا نہیں؟"

"ہاں ہاں!" — خاتون نے جواب دیا — "ملزم جب کمرے سے پھر برآمدے اور پھر صحن میں سے گزر گیا تو میں برآمدے میں آ گئی۔ میں نے دیکھا کہ ملزم نے دروازے کی زنجیر کھولی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ملزم کے جانے سے پہلے اندر سے زنجیر چڑھی ہوئی تھی۔ یہ ملزم نے کھولی اور زنجیر گرنے یعنی لٹکنے کی آواز مجھے صاف سنائی دی تھی۔ باہر اندھیرا تھا۔ میں صرف آوازیں سن سکتی تھی۔ ملزم نے جب ڈیوڑھی کا باہر والا دروازہ کھولا تو بھی مجھے زنجیر گرنے کی آواز آئی تھی"۔

"چھت پر جانے کے لئے سیڑھیاں بھی ہوں گی!" — میں نے پوچھا۔

"ہاں جی!" — خاتون نے بتایا — "صحن میں سے سیڑھیاں اوپر جاتی ہیں۔ ان کا ایک دروازہ نیچے ہے اور ایک اوپر۔ میں نے رات ملزم کے چلے جانے کے بعد اور اب آپ کے پاس آنے سے پہلے اچھی طرح دیکھا تھا۔ سیڑھیوں کے نیچے والے دروازے کی زنجیر چڑھی ہوئی تھی۔ یہ کھول کر اوپر گئی۔ اوپر والے دروازے کی زنجیر بھی چڑھی ہوئی تھی"۔

یہ تو میں نے اس خاتون کے گھر جا کر دیکھنا تھا کہ ملزم مکان میں داخل کس طرح ہوا' خاتون کی باتوں سے یہ پتہ چلتا تھا کہ ملزم نہ ڈیوڑھی کی طرف سے آیا نہ چھت کی طرف سے۔

"کسی پر آپ کا شک ہے؟"

"ایک شک ہے" — خاتون نے جواب دیا — "میری ایک سوتیلی بیٹی ہے۔ تقریباً ایک سال ہوا اس کی شادی کر دی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ یہ زیورات میری ماں کے ہیں"۔

"کیا اس نے اس ایک سال کے عرصے میں کبھی ایسی بات کی تھی کہ وہ اپنے زیورات کسی نہ کسی طرح وصول کر لے گی؟" — میں نے پوچھا۔

"شادی کے بعد وہ یہاں آئی ہی نہیں" — خاتون نے جواب دیا۔

"کہیں ملاقات ہوئی ہو گی!"

"نہیں" — خاتون نے جواب دیا — "ملاقات بھی نہیں ہوئی"۔

"آپ کی سوتیلی بیٹی نے کسی عورت سے یا کہیں اور ایسی بات کہی ہو گی کہ اسے زیورات نہ ملے تو وہ کسی اور طریقے سے لے لے گی" — میں نے کہا — "یا کیا آپ اسے اتنی چالاک اور ہوشیار سمجھتی ہیں کہ یہ زیورات اُس نے چوری کروائے ہیں؟... میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ کسی پر شک کرنے یا الزام عائد کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لیں کیونکہ آپ جس پر بھی شک کریں گی اسے ہم تھانے بلائیں گے اور تفتیش کے دوران ہم اس کے ساتھ بدتمیزی اور بے ہُودہ سلوک بھی کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کا مشتبہ بے گناہ نکلا تو پھر وہ آپ کے خلاف اور ہمارے خلاف ہتک عزت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ یہ نہ کرے تو میرے اعلیٰ افسروں کو درخواست دے سکتا ہے۔ پھر یہ نہ آپ کے لئے اچھا ہو گا نہ میرے لئے۔ آپ نے مجھے گمراہ نہیں کرنا۔ اس طرح تفتیش غلط راستے پر چل پڑتی ہے اور اصل ملزم کو پکڑنا ناممکن ہو جاتا ہے"۔

"میں نے صرف شک ظاہر کیا ہے" — خاتون نے کہا — "میں یقین کے ساتھ بات نہیں کر رہی۔ آپ نے پوچھا ہے کہ اس نے کسی عورت سے ایسی بات کی ہو گی۔ نہیں' اس نے کسی عورت کے ساتھ ایسی بات نہیں کی نہ مجھ تک کسی اور کی زبانی اس کی ایسی دھمکی پہنچی ہے۔ میں آپ کے اس سوال کا جواب بھی ٹھیک طرح نہیں دے سکتی کہ وہ اتنی چالاک اور ہوشیار ہے کہ نہیں کہ چوری کی واردات کروائے۔ اس گھر میں وہ جتنا عرصہ رہی' بالکل چپ چاپ اور سیدھی سادی رہی"۔

اس خاتون سے کچھ اور باتیں پوچھیں اور اسے باہر بھیج دیا۔ میرے پاس اس کے محلے کے دو معززین بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے کچھ معلومات لینی تھیں۔

خاوند پارسا، عورت شوقین مزاج

"اس محترمہ نے اپنی سوتیلی بیٹی پر شک کیا ہے" — میں نے کہا — "میں نے اسے بلاوجہ کسی پر شک کرنے سے ڈرایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس شک کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ اس کے شک کو پیشِ نظر رکھنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے اس عورت نے دشمنی کی بنا پر اپنی سوتیلی بیٹی پر شک کیا ہو۔ یہ تو میں جان گیا ہوں کہ سوتیلی بیٹی کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے نہیں۔ اس نے خود بتایا ہے کہ جب سے سوتیلی بیٹی کی شادی ہوئی ہے وہ ایک بار بھی اِدھر یعنی اپنے گھر نہیں آئی۔ لڑکی کو اپنے باپ سے ملنے کے لئے تو آنا چاہئے تھا۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ یہ لڑکی کیسی ہے اور اس کا باپ کیسا آدمی ہے؟.... مجھے پکا شک ہے کہ یہ واردات اس لڑکی نے نہیں کروائی لیکن تفتیش کرنا اور ہر طرف سے تسلی کر لینا میرا فرض ہے"۔

دونوں معززین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ ملک صاحب کو ہر ایک بات بتا دی جائے۔

یہ ایک بڑا قصبہ تھا جو اب ایک شہر بن گیا ہے۔ اس قصبے کے لوگوں میں تعلیم آ گئی تھی۔ وہاں تین ہائی سکول بھی تھے۔ مسلمان تعلیم حاصل کرنے سے ذرا گریز کرتے تھے پھر بھی مہذب لوگ تھے۔ اچھے بُرے کی پہچان رکھتے تھے۔ یہ دونوں معززین جو میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے، کبھی کبھی تھانے آتے تھے اور مجھ سے ملتے تھے۔ ان کے آنے کا مقصد تھانیدار سے سلام دعا لینا ہی تھا۔ یہ پولیس کے طور طریقوں سے واقف تھے۔

"اس گھر کا بھی عجیب قصہ ہے ملک صاحب!" — ان میں سے ایک نے کہا — "جس لڑکی پر اس خاتون نے شک کیا ہے یہ چھوٹی سی تھی تو اس کی ماں مر گئی۔ کچھ عرصے بعد باپ نے دوسری شادی کر لی۔ یہ لڑکی جوانی کی عمر کو پہنچ رہی تھی تو باپ مر

گیا۔ تھوڑے عرصے بعد ماں نے دوسری شادی کر لی۔ اس طرح باپ بھی سوتیلا اور ماں بھی سوتیلی ہو گئی....

"یہ ایک مظلوم اور بدقسمت لڑکی ہے۔ سوتیلی ماں نے اس کے ساتھ بہت بُرا سلوک روا رکھا۔ اس کی حالت نوکرانیوں سے بدتر تھی۔ جب باپ بھی سوتیلا ہو گیا تو باپ نے بھی اس لڑکی کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہ کیا۔ لڑکی پوری طرح جوان ہو گئی تو اس کی یہ سوتیلی ماں مر گئی۔ اس کے سوتیلے باپ نے اس عورت کے ساتھ شادی کر لی"۔

"اس شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟"

"چار سال ہونے کو ہیں" — اس نے جواب دیا — "یہ خاتون بیوہ ہو گئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم دونوں ان کے محلے دار ہیں۔ اس لڑکی کے سگے ماں باپ بہت اچھے لوگ تھے۔ لڑکی کی بدقسمتی یہ رہی کہ اس کا کوئی چچا تایا یا ماموں نہیں جو اس کے سر پر ہاتھ رکھ لیتا۔ ہمارے گھروں کی عورتوں نے ہمیں بتایا تھا کہ اس لڑکی کے سگے ماں باپ نے بچپن سے ہی اس کے لئے جہیز بنانا شروع کر دیا تھا۔ وہ عقلمند تھے۔ انہوں نے زیادہ تر سونے کا زیور بنایا تھا۔ اب دیکھئے کہ یہ اتنی بڑی حویلی جو اس لڑکی کو ملنی چاہئے تھی اس پر غیروں کا قبضہ ہو گیا۔ زیورات کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اس خاتون نے لڑکی کو شادی کے وقت کچھ دیا تھا یا نہیں۔ میں صرف اس حویلی کے حالات اور وہ انقلابات سنا رہا ہوں جو ہماری آنکھوں کے سامنے پیدا ہوئے"۔

"اس لڑکی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟" — میں نے پوچھا — "اور اس کا خاوند کیسا آدمی ہے؟"

"لڑکی کے متعلق ہم نے کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں سنی" — اس نے جواب دیا۔

"وہ لڑکی ٹھیک ہے ملک صاحب!" — دوسرے آدمی نے کہا — "اکثر ایسے ہوتا ہے کہ جن لڑکیوں پر بچپن سے ہی ظلم و ستم شروع ہو جائے اور ان کی ساری زندگی اسی طرح غلاموں اور زر خرید لونڈیوں کی طرح گزرے ان کے چال چلن ٹھیک نہیں رہتے۔ آپ ماشاء اللہ دانشمند اور جہاندیدہ ہیں۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جس

مظلومیت اور جن بُرے حالات میں یہ لڑکی جوان ہوئی ہے' ایسے حالات ایمان کو بھی قائم نہیں رہنے دیتے۔ اس لڑکی کو آوارہ ہو جانا چاہئے تھا لیکن اسے ایسی چُپ لگ گئی کہ کوئی بلاتا تھا تو بولتی تھی ورنہ گھر کے کام دھندوں میں ہی لگی رہتی تھی"۔

"میری بیوی تو اس لڑکی کی بہت ہی تعریفیں کرتی ہے" ــــ اس کا ساتھی بولا ــــ "میری بیوی کہتی ہے کہ اس نے اس لڑکی کو نماز پڑھتے بھی دیکھا ہے اور اس کے چہرے پر ایک اداسی کا ہی تاثر رہتا ہے۔ میں نہیں مانتا کہ اس لڑکی نے چوری کروائی ہو"۔

"یہ تو میں بھی نہیں مانتا" ــــ میں نے کہا ــــ "اگر اس لڑکی نے ہی چوری کروانی ہوتی تو ایک سال انتظار نہ کرتی.... اس کا خاوند کیسا آدمی ہے؟"

"اچھا آدمی ہے" ــــ ان میں سے ایک نے کہا ــــ "چار بھائی ہیں۔ اس شخص نے شادی کی اور اپنے ماں باپ سے الگ ہو گیا۔ کاروباری آدمی ہے۔ انبالہ کی ایک پرائیویٹ کمپنی کا کمیشن ایجنٹ اور ٹورنگ سیلز مین ہے۔ اس کے ماں باپ یہاں اس کی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وجہ یہ بتاتے تھے کہ لڑکی نے اچھے ماحول میں پرورش نہیں پائی اور اس میں کھُٹن زیادہ ہے لیکن لڑکا اتنا اچھا ہے کہ وہ کہتا تھا کہ میں اس لڑکی کو ظلم و تشدد سے نجات دلانا چاہتا ہوں حالانکہ جوانی کی عمر میں ہے لیکن بڑی عمر کے آدمیوں کی طرح ہر کسی کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوتا ہے اور رکھ رکھاؤ والا آدمی ہے"۔

"اب اس خاتون کے متعلق کچھ بتائیں" ــــ میں نے کہا۔

ان دونوں معززین نے پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ ان میں سے ایک کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور دوسرا سنجیدہ ہو گیا۔ انہوں نے اشاروں اشاروں میں طے کر لیا کہ یہ بات بھی بتا دی جائے۔

"ٹھیک عورت نہیں ملک صاحب!" ــــ ان میں سے ایک نے کہا ــــ "اس کا خاوند بڑا ہی سیدھا آدمی ہے۔ یہ ذرا شوقین مزاج تھی۔ خاوند نے چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھی ہوئی تھی اور زاہد اور پارسا تھا۔ اس عورت نے ایک آدمی کے ساتھ درپردہ تعلق پیدا کر رکھا تھا۔ اب اسے جو خاوند ملا ہے وہ اس سے چودہ پندرہ سال بڑا ہے۔ اس عورت کو آپ نے دیکھا ہے۔ چونتیس پینتیس سال عمر ہو گئی ہے لیکن چوبیس پچیس

سال کی لگتی ہے۔ اس کے خاوند کا کاروبار ایسا ہے کہ مہینے میں دو تین دن باہر رہتا ہے۔ آج کل بھی وہ اپنے دَورے پر نکلا ہُوا ہے"۔

"اس عورت نے اپنی سوتیلی بیٹی کے ساتھ بہت ہی بُرا سلوک کیا ہے" ــــ دوسرا بولا ــــ "یہ دراصل نہیں چاہتی تھی کہ اس کی موجودگی میں کوئی جوان لڑکی اس گھر میں رہے۔ اس لڑکی کو کوئی قبول نہیں کر رہا تھا ورنہ یہ چار سال پہلے اس حویلی میں آتے ہی اس لڑکی کو چلتا کرتی"۔

میں نے اپنے ذہن میں ایک واضح نقشہ بنا لیا۔ ان دونوں اشخاص کی باتوں سے مجھے یہ شک بھی ہونے لگا تھا کہ اس عورت نے خود ہی زیورات اُڑا کر اپنے ماں باپ کے گھر پہنچا دیئے ہوں اور ڈرامہ یہ کھیلا جو اس نے مجھے سنایا تھا۔ اس ڈرامے میں اس کے آشنا کا ہاتھ بھی ہو سکتا تھا۔ ابھی تو میں نے اس مکان کو دیکھنا تھا۔ میں نے اس عورت کو بلایا اور اسے کہا کہ مجھے زیورات کی تفصیل لکھوا دے۔

محرّر ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر اس کے پاس بٹھا دیا۔

جب ضروری کاغذی کارروائی مکمل ہو گئی تو میں ان لوگوں کے ساتھ واردات والا مکان دیکھنے کے لئے چل پڑا۔

شیشے کے ٹکڑے اور نیم کا پیڑ

میں ان کے محلے میں داخل ہُوا۔ وہ ایک خاصی کشادہ گلی تھی۔ واردات والا مکان گلی کے کونے پر تھا۔ چار مکان ایک دوسرے سے ملحق تھے۔ ان کی چھتیں ملی ہوئی تھیں۔ دو مکانوں پر فصیل تھی جو آسانی سے پھلانگی جا سکتی تھی۔ اس عورت کا مکان سب سے آخر میں تھا اور یہ خاصا کشادہ مکان تھا جسے حویلی کہا جاتا تھا۔ میں نے باہر سے دیکھا۔ حویلی کی ساخت ایسی تھی کہ دیوار پھاند کر اندر جانا ناممکن تھا۔ ممکن اس صورت میں تھا کہ دروازہ کھلا ملتا۔

میں اندر گیا۔ ڈیوڑھی کا بیرونی پھر اندرونی دروازہ دیکھا۔ ان کی زنجیریں ایسی تھیں کہ باہر سے نہیں کھل سکتی تھیں۔ باریک سی تار بھی دونوں کواڑوں کے درمیان

سے اندر نہیں جاسکتی تھی۔ اندر جاکر برآمدے میں وہ جگہ دیکھی جہاں یہ عورت سوئی ہوئی تھی۔ پھر اندر جاکر وہ الماری دیکھی جہاں سے زیورات کا ڈبہ نکالا گیا تھا۔ باہر آکر سیڑھیوں کا دروازہ دیکھا۔ اس کی کنڈی بھی مضبوط تھی۔ اُوپر والا دروازہ دیکھا۔ اُس کی کنڈی بھی باہر سے نہیں کھولی جاسکتی تھی۔

اس مکان کی تین چھتیں تھیں۔ میں نے اپنے ساتھ کسی محلّے دار کو چھتوں پر نہ آنے دیا کیونکہ میرا شک یہ تھا کہ ملزم چھتوں کے ذریعے آیا ہو گا۔ اس حویلی کا صحن خاصا کشادہ تھا۔ صحن کے تقریباً وسط میں نیم کا ایک پرانا پیڑ تھا۔ آج کل لوگ کوٹھیوں کی طرز کے مکان بناتے ہیں۔ ہمارے وقتوں میں قصبوں میں لوگ یہ خیال رکھتے تھے کہ صحن کشادہ رکھا جائے اور صحن میں ایک دو درخت ضرور ہوں۔

اس حویلی کے صحن میں نیم کا جو پیڑ تھا وہ بہت ہی پرانا تھا۔ اس کا ایک خاصا موٹا ٹہن ایک طرف منڈیر پر جاکر چھت تک چلا گیا تھا۔ میری عقل نے کام کیا۔ خیال آیا کہ ملزم اس ٹہن سے نیچے گیا تھا۔ میں ٹہن تک گیا تو دو قدم دور ہی رُک گیا۔ چھت کی لپائی پرانی ہو گئی تھی اس لئے اس پر دھول آ گئی تھی۔ ٹہن کے قریب چھت پر صاف نشان تھے کہ یہاں کوئی کھڑا رہا ہے اور پھر یہاں سے ٹہن پر چڑھا ہے۔ کھرا واضح نہیں تھا۔ میرے ساتھ ایک کانسٹیبل تھا۔ اسے دوڑایا کہ کھوجی کو ساتھ لے آئے۔

میں نے ٹہن کا نظری جائزہ لیا۔ ٹہن اتنا مضبوط تھا جو ایک نہیں بلکہ دو آدمیوں کا بوجھ آسانی سے سہار سکتا تھا۔ یہ ٹہن آگے جاکر جہاں درخت سے ملتا تھا وہاں یہ گول نہیں بلکہ چپٹا اور پرچ یا پلیٹ کی طرح درمیان سے ذرا گہرا ہو گیا تھا۔ چھت سے مجھے نظر آیا کہ وہاں کوئی چیز چمک رہی ہے۔

میرے ساتھ ایک ہیڈ کانسٹیبل بھی آیا تھا۔ اسے کہا کہ وہ نیچے جاکر اپنے جوتے اتارے اور تنے کی طرف سے درخت پر چڑھے اور دیکھے کہ وہ کیا چیز چمک رہی ہے۔

ہیڈ کانسٹیبل نیچے گیا۔ درخت پر چڑھا اور میری بتائی ہوئی جگہ تک پہنچا۔ وہیں سے اُس نے بتایا کہ شیشے کے تین چار ٹکڑے ہیں۔ مجھے فوراً یاد آیا کہ اس عورت نے کہا تھا کہ ملزم کے ہاتھ میں جو ٹارچ تھی اس کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ میرے دل نے کہا کہ ٹارچ کا شیشہ یہیں ٹوٹا تھا۔ اُس وقت میں تصور میں لایا کہ شیشہ کس طرح ٹوٹا ہو گا۔ ملزم

ٹارچ ہاتھ میں لئے اس ٹہن پر بیٹھ کر سرکتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ اُس وقت ٹارچ یقیناً بجھی ہوئی ہو گی اور اس نے ہاتھ میں اس طرح پکڑی ہوئی ہو گی کہ شیشہ آگے کی طرف ہو گا۔ شیشہ سامنے والے عمودی ٹہن یا تنے سے جا لگا اور ٹوٹ گیا اور اس کے ٹکڑے وہیں رہ گئے جہاں ٹہن کی گولائی ختم ہو گئی تھی۔

وہاں سے نیچے جانا ایک نوجوان آدمی کے لئے کوئی مشکل نہیں تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ملزم اِدھر سے ہی اُترا ہے۔

وہاں سے میں ہٹا اور چھت کو کھوجیوں کی طرح جھک کر دیکھتے ہوئے فصیل تک چلا گیا جو ساتھ والے مکان کی مشترک فصیل تھی۔ چونکہ ایک مہینے سے زیادہ عرصے سے بارش نہیں برسی تھی اس لئے فصیل کے اوپر گرد پڑی ہوئی تھی۔ ایک جگہ سے صاف پتہ چلتا تھا کہ کوئی آدمی اس فصیل کے اوپر سے ادھر آیا یا اُدھر گیا ہے۔ میں فصیل کے اوپر سے ساتھ والی چھت پر چلا گیا۔ اس چھت کی لپائی بھی پرانی تھی۔ کوئی کھُرا واضح تو نہیں تھا لیکن صاف پتہ چلتا تھا کہ یہاں سے کوئی گزرا ہے۔ اس چھت کے آخر میں پھر فصیل تھی۔ اس کے اوپر بھی کسی کے گزرنے کے نشان بڑے صاف تھے۔

میں نے چاروں مکانوں کی چھتیں دیکھ لیں۔ یہ یقین ہو گیا کہ ملزم چھتوں کے راستے سے آیا ہے۔ اُس وقت ذہن میں یہی ایک شبہ آتا تھا کہ ملزم کا تعلق اس حویلی کے ساتھ ملے ہوئے تین مکانوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہے۔

میں نے حویلی کا پچھواڑہ بھی دیکھا۔ اُدھر سے کسی کے آنے کا امکان نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد کھوجی دوڑا آیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں نے کیا کچھ دیکھ لیا ہے اور وہ اب اپنی نظر سے دیکھے۔ میں نیچے آ گیا۔ نمبردار' ذیلدار اور چوکیدار بھی آ گئے تھے۔ میں اسی مکان کی بیٹھک میں بیٹھ گیا۔ پہلے نمبردار کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ یہ ساتھ والے جو تین گھر ہیں' کیا ان میں کوئی ایسا آدمی ہے جس نے یہ واردات کی ہو؟

''کون کسی کی قسم کھا سکتا ہے حضور!'' ___ نمبردار نے جواب دیا ___ ''ساتھ والے دو گھروں میں کوئی ایسا جوان لڑکا ہے ہی نہیں جو ایسی سنگین واردات کرے۔ تیسرا گھر بھی ایسا ہی ہے۔ وہاں ایک جوان لڑکا ہے جس کی عمر سترہ اٹھارہ سال ہے لیکن میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ اس قسم کا لڑکا نہیں۔ ویسے بھی یہ تینوں گھر بڑے ہی شریف لوگوں کے ہیں''۔

نمبردار سے بھی میں نے وہی باتیں پوچھیں جو میں نے اس خاتون کے ساتھ تھانے جانے والے دو معززین سے پوچھی تھیں۔ نمبردار نے تقریباً وہی جواب دیئے جو انہوں نے دیئے تھے۔ اس نے بھی اس لڑکی کو مظلوم اور شریف کہا اور جس کے ہاں چوری ہوئی تھی اس کے اخلاق اور چال چلن کو اچھا نہ کہا۔

"جناب ملک صاحب!"— نمبردار نے کہا— "خاوند زیادہ عمر کا ہے اور عورت جوان ہے۔ وہ خاوند کو جس طرح نچائے وہ اسی طرح ناچتا ہے۔ آخری فیصلہ تو آپ نے ہی دینا ہے' میری عقل یہ کہتی ہے کہ سیڑھیوں کے دروازے بند رہے' ڈیوڑھی کے اندر والا اور باہر والا دروازہ بھی بند رہا اور چور اندر جا کر زیورات کا ڈبہ اٹھا لایا۔ چور اندر گیا کس طرح؟"

میں نے محلے کے چار معززین کو اکیلے اکیلے بلا کر یہی باتیں پوچھیں۔ سب کے جواب ایک ہی جیسے تھے۔

اتنے میں کھوجی آگیا۔ اس نے بتایا کہ ملزم ننگے پاؤں آیا تھا اور وہ چوتھے گھر کی چھت سے اِدھر آیا تھا۔ کھوجی نے یہ تصدیق بھی کی کہ ملزم نیم کے درخت سے ہی اُترا تھا۔

میں اُسی وقت اٹھا اور چوتھے مکان کو دیکھنے کے لئے چلا گیا۔ اس مکان کے ایک طرف جہاں ایک دیوار ختم ہوتی تھی تھوڑی تھوڑی اینٹیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ ان اینٹوں کے ذریعے اس مکان پر چڑھا جا سکتا تھا۔ میں نے اس گھر کے افراد کے متعلق نمبردار کے علاوہ دوسرے معززین سے بھی پوچھا۔ سب نے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ اس گھر پر شک کیا ہی نہیں جا سکتا۔

یہ ضروری نہیں ہوتا کہ تین چار آدمیوں نے کہہ دیا کہ فلاں شخص شریف ہے یا بدچلن ہے تو شریف پر شُبہ نہ کیا جائے اور بدچلن کو دھر لیا جائے۔ انسانی فطرت کے لئے کوئی قسم نہیں کھائی جا سکتی۔ علمِ نفسیات کے ڈاکٹر اور پولیس والے بہتر جانتے ہیں کہ کبھی کوئی بدمعاش ایسی نیکی کر گزرتا ہے کہ لوگ حیران رہ جاتے ہیں اور کبھی کوئی شریف آدمی ایسا گھناؤنا جرم کر گزرتا ہے کہ لوگوں کو یقین ہی نہیں آتا۔

میں نے پوچھا کہ اس گھر پر شک کیوں نہیں کیا جا سکتا؟

"ایک بلپ ہے جو مسلم ہائی سکول میں فارسی پڑھاتا ہے"— مجھے بتایا گیا— "شریف اور مرا مِٹا ہُوا سا آدمی ہے۔ اس کے بچے چھوٹے ہیں۔ ایک لڑکا بڑا ہے جس کی عمر سولہ سترہ سال ہے۔ ابھی ابھی اس نے دسویں پاس کی ہے۔ چپ چاپ سا لڑکا ہے۔ باپ اسے آگے پڑھانا چاہتا ہے۔ لڑکا ذہین اور محنتی ہے"۔

میں نے موقعۂ واردات کی تفتیش کو یہیں تک رہنے دیا اور تھانے چلا گیا۔ مجھے اس کے سوا کوئی سراغ نہیں ملا تھا کہ چور تین مکانوں کی چھتوں سے گزرتا نیم کے درخت کے ذریعے واردات والے مکان میں اُترا تھا.... عموماً ایس ایچ او اس قسم کے کیس اپنے جونیئر سب انسپکٹر یا اے ایس آئی کو دے دیا کرتے تھے لیکن میں اس واردات کو کچھ پیچیدہ سمجھ رہا تھا اس لئے اس کی تفتیش خود ہی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری سروس ابھی زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ یہ میرا دوسرا تھانہ تھا۔ مجھے تفتیش اور سراغرسانی میں تجربہ حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔

سکول ماسٹر کا لڑکا اور نصرت

میں نے مخبروں کو بلوایا اور انہیں کہا کہ اس واردات کے متعلق رپورٹ دیں۔ مخبروں کو معلوم تھا کہ رپورٹ کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ ان مخبروں میں تین چھوٹی موٹی وارداتیں کرنے والے بھی تھے۔ میں نے "معزز" مخبروں کو بھی بلوانا تھا۔ اکثر اوقات یہ بن بلائے بھی آجایا کرتے تھے۔ جب کوئی واردات ہوتی تھی تو یہ "معززین" نمبر بنانے کے لئے اکیلے اکیلے تھانے آجایا کرتے اور اپنی اپنی رپورٹ دیا کرتے تھے۔ ان سے راز کی کوئی نہ کوئی کارآمد بات معلوم ہو جاتی تھی۔

میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ صرافہ بازار جائے اور سب کو بتا دے کہ ایک گھر سے زیورات چوری ہو گئے ہیں' محتاط رہیں اور کوئی زیورات بیچنے آئے تو اسے دکان میں بٹھا کر تھانے اطلاع دے دیں۔

اُس زمانے میں سنار زیورات خریدنے سے گھبراتے تھے۔ جب تک انہیں بیچنے والے پر اعتبار نہیں ہوتا وہ زیورات نہیں خریدتے تھے۔ اگر خرید لیتے تو بالکل صحیح

کاغذات تیار کرتے تھے۔ آج کل چوری کے مال کی خرید و فروخت کھلے عام ہوتی ہے۔ کاریں غائب کر دی جاتی ہیں لیکن انگریزوں کے وقتوں میں چوری کا مال خریدنے والوں کو بخشا نہیں جاتا تھا۔ بڑے شہروں میں مال غائب ہو جاتا تھا لیکن قصبوں اور دیہات میں چوری کے مال کو کوئی دکاندار ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔

میں نے مسروقہ زیورات کی تفصیل بھی ہیڈ کانسٹیبل کو لکھ دی تھی تاکہ وہ صرافہ بازار میں سب کو بتا دے۔

وہ دن گزر گیا اور رات بھی گزر گئی۔ اگلے دن مخبر رپورٹیں لانے لگے۔ سب وہی باتیں سناتے تھے جو مجھے پہلے ہی اس محلّے کے معززین اور نمبردار وغیرہ سے معلوم ہو چکی تھیں۔

"مجھے ایک بات بتاؤ" — میں نے یہ سوال ہر ایک سے کیا — "اس سوتیلی بیٹی کے متعلق کیا رائے ہے جس پر اس خاتون نے شک کا اظہار کیا ہے؟"

تقریباً سب نے اسے شریف اور مظلوم لڑکی کہا۔ اس کا نام نصرت بتایا گیا۔ ایک مخبر نے فالتو بات یہ بتائی کہ چوتھے گھر کا لڑکا یعنی مسلم ہائی سکول میں فارسی پڑھانے والے ماسٹر کا بیٹا نصرت کے گھر جاتا ہے اور یہ بھی بتایا گیا کہ نصرت کا خاوند اس لڑکے کو اپنا دوست سمجھتا ہے۔ ان تمام مخبروں نے چوری والے گھر کی خاتون کو اچھی عورت نہ کہا۔ وہ تو صاف کہتے تھے کہ بوڑھے خاوند کو دھوکا دے رہی ہے۔ ایک مخبر نے یہاں تک کہا کہ حیرت والی بات نہیں ہو گی اگر اس عورت نے خود ہی زیورات ادھر اُدھر کر دیئے ہوں۔

دن کے پچھلے پہر اس عورت کا خاوند آ گیا۔ وہ خاصا پریشان تھا جو اسے ہونا چاہئے تھا۔ وہ ایک ہی رونا رو رہا تھا کہ اس کا بیڑہ ہی غرق ہو گیا ہے۔ میں اسے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن یہ اس کے گھر کے معاملات تھے جن کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے تھا۔ عمر کے لحاظ سے اتنا بوڑھا آدمی تو نہیں تھا لیکن صاف پتہ چلتا تھا کہ اس جوان عورت نے اسے جسمانی لحاظ سے بہت بوڑھا کر دیا ہے۔

"مجھے ایک بات بتائیں" — میں نے کہا — "یہ سوال آپ کو اچھا تو نہیں لگے گا اور شاید آپ اس کا صحیح جواب بھی نہ دینا چاہیں لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میں نے چور کو پکڑنا ہے جو میری ڈیوٹی ہے اور آپ کا فائدہ بھی اسی میں ہے کہ مجھے ہر بات سو

فیصد صحیح بتائیں ورنہ آپ کا گیا ہُوا مال واپس نہیں آئے گا"۔

اس نے کہا کہ اس سے انتہائی گھٹیا بات پوچھی جائے گی تو وہ بلا جھجک پوری بات بتائے گا۔

"کیا آپ کو اپنی بیوی پر کُلی اعتماد ہے؟" — میں نے پوچھا۔

وہ گہری سوچ میں چلا گیا اور میں اسے دیکھتا رہا۔

"میں پورے یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا" — اس نے کہا — "اور میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ عورت اچھی قسم کی گھریلو عورتوں جیسی ہے۔ خاصی چالاک اور ہوشیار ہے اور میرے ساتھ اس کا رویّہ بہت ہی اچھا ہے.... آپ نے یہ بات کس شک کی بنا پر پوچھی ہے؟"

"میں آپ کے ساتھ صاف بات کرتا ہوں" — میں نے کہا — "اگر میں یہ کہوں کہ زیورات آپ کی بیوی نے خود ہی غائب کر دیئے ہیں تو آپ کیا کہیں گے؟.... میں آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کو ٹالنا اور ٹرخانا نہیں چاہتا' میرے دل میں آپ کی ہمدردی ہے۔ میں آپ کا مال واپس لانے کے لئے اپنی جان کو بھی بازی پر لگا دوں گا"۔

"اس کی ماں اچھی خاصی تیز طرار عورت ہے" — اس نے کہا — "اس کا باپ بھی کوئی شریف آدمی نہیں لیکن اس سے پہلے اس نے گھر کی کوئی چیز یا پیسے غائب نہیں کئے۔ میرا جواب یہ سمجھ لیں کہ میں اپنی بیوی کی وکالت نہیں کروں گا۔ آپ اپنی تفتیش کریں اور میرے گھر کی عزت کا کوئی خیال نہ کریں"۔

"اب اس واردات کے ایک اور پہلو کی طرف آئیں" — میں نے پوچھا — "ان زیورات میں آپ کا اپنا بنایا ہوا زیور کتنا تھا؟"

"بہت تھوڑا" — اس نے جواب دیا — "ان زیورات کی کہانی بھی ایک عجیب اتفاق ہے۔ موت نے اس حویلی میں اپنا ایسا کھیل کھیلا جو کم ہی کبھی دیکھنے میں آیا ہو گا"۔

میرے کہنے پر اس نے موت کا یہ کھیل پوری تفصیل سے سنا دیا۔ یہ وہی کہانی تھی جو میں دوسروں کی زبانی سنا چکا ہوں۔

"پھر اس کا مطلب یہ ہُوا" — میں نے کہا — "کہ یہ زیورات آپ کے نہیں تھے اور نہ ہی یہ حویلی آپ کی ہے"۔

"بات تو یہی بنتی ہے" — اس نے کہا۔

"آپ معزز اور پڑھے لکھے آدمی ہیں" — میں نے کہا — "آپ نے ایک لڑکی کا حق مارا ہُوا ہے۔ میں یہ ساری باتیں پہلے سن چکا ہوں۔ کیا آپ نے کبھی بھی نہیں سوچا کہ ایک مظلوم اور یتیم لڑکی کا حق آپ نے مار رکھا ہے؟..... مجھے یہ بھی معلوم ہُوا ہے کہ آپ کی بیوی نے نصرت کے ساتھ بہت بُرا سلوک روا رکھا تھا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس یتیم لڑکی نے آپ کی بیوی سے اپنی ماں اور اپنے زیورات کا مطالبہ کیا تھا؟"

"جی ہاں!" — اس نے فوراً ہی جواب دیا — "مجھ سے نہیں بلکہ میری بیوی سے اس نے اپنے زیورات مانگے تھے"۔

"آپ کی بیوی نے زیورات دینے سے انکار کر دیا تھا" — "میں نے کہا — "ظاہر ہے کہ آپ بھی اس انکار میں شامل تھے"۔

"نہیں!" — اس نے جواب دیا — "مجھے تقریباً ایک سال بعد پتہ چلا تھا کہ نصرت نے میری بیوی سے زیورات مانگے تھے اور میری بیوی نے انکار کر دیا تھا"۔

"پھر آپ یہ زیورات اس لڑکی کو دے دیتے" — میں نے کہا۔

اس شخص نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ کچھ بے چین سا ہو گیا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا تو پھر اس نے اپنا جھکا ہُوا سر اٹھایا۔

"آپ نہیں جانتے صاحب!" — اس نے مایوسی کے لہجے میں کہا — "اگر میں زیورات اپنی مرضی سے لڑکی کو دے دیتا تو میری بیوی میری جان کو آ جاتی۔ گھر میں چین اور سکون نہ رہنے دیتی"۔

میں سمجھ گیا کہ یہ شخص اپنی بیوی کے ہاتھوں مجبور ہے۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ زیورات اس لڑکی کے تھے اور اسے کیوں نہ دیئے گئے۔ میں تو چوری کی تفتیش کر رہا تھا' البتہ ایک شک میرے ذہن میں تھا' میں یہ شک صاف کرنا چاہتا تھا۔

"کیا آپ نے یہ سوچا ہے کہ یہ چوری اس لڑکی نے کروائی ہو گی؟" — میں نے پوچھا۔

"میں آپ سے یہی بات کرنا چاہتا تھا" — اُس نے کہا — "مجھے یہ شک ہے"۔

"کیا آپ کو اس لڑکی کی طرف سے یا اس کے خاوند کی طرف سے کبھی ایسی دھمکی ملی تھی؟" — میں نے پوچھا۔

"بہت پہلے کی بات ہے" — اس نے کہا — "اس لڑکی کے خاوند نے مجھے کہا تھا کہ میں اس کی بیوی کے زیورات دے دوں۔ میں نے اسے کہا تھا کہ دے دوں گا"۔

"کیا پھر کبھی نصرت کے خاوند نے آپ سے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں!" — اس نے جواب دیا۔

"پھر یہ شک آپ کو کیوں ہُوا ہے؟"

"میری ایک بات پر غور کریں" — اس نے کہا — "میں نے اور میری بیوی نے یہ ذہن سے نکال دیا تھا کہ اب یہ لڑکی زیورات کا مطالبہ کرے گی کیونکہ ایک سال گزر گیا ہے۔ اب میں اپنے کاروباری دورے سے واپس آیا تو پتہ چلا کہ زیورات چوری ہو گئے ہیں۔ محلے کے کچھ آدمی اظہارِ ہمدردی اور اظہارِ افسوس کے لئے میرے پاس آئے تو ان سے معلوم ہوا کہ چور چھت کی طرف سے آیا تھا اور اس کے آنے کے نشانات میری حویلی کے ساتھ والے تین گھروں کی چھتوں پر صاف نظر آتے تھے۔ میں نے تینوں گھروں کے افراد پر نظر ڈالی تو ساتھ والے دو گھروں پر مجھے ذرا سا بھی شک نہ ہُوا کیونکہ وہاں کوئی ایک بھی ایسا آدمی نہیں جس نے یہ واردات کی ہو۔ آخری گھر پر مجھے ایک شک ہُوا اور یہ شک ماسٹر کے بیٹے پر ہے"۔

"محلّے کے تمام معزّزین نے کچھ اور ہی رائے دی ہے" — میں نے کہا — "سب کہتے ہیں کہ وہ گھرانہ بھی شریف اور مرا مرا سا ہے اور یہ لڑکا بالکل چُپ چاپ اور بڑے صحیح کردار والا ہے"۔

"میں نے اسے بدمعاش نہیں کہا جناب!" — اُس نے کہا — "مجھے صرف اس لئے شک ہوتا ہے کہ یہ لڑکا نصرت کے خاوند کا دوست ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ چھ سات مہینوں سے وہ نصرت کے گھر شاید روزانہ جاتا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ نصرت کے خاوند کی غیر حاضری میں بھی وہاں جاتا ہے۔ یہ میں بھی جانتا ہوں

کہ اور ان کے محلّے میں رہنے والے دو آدمیوں نے بھی مجھے بتایا ہے۔ شک کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ چور چھتوں سے آیا تھا۔ میں نے بہت سوچا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ چور وہی لڑکا ہے"۔

باجی اور جذباتی چور

اس شخص کو تو میں نے رخصت کر دیا لیکن میرے ذہن میں یہ لڑکا اٹک گیا۔ چوری والے گھر کی خاتون تھانے رپورٹ دینے آئی تھی تو اس نے کچھ باتیں ایسی کہی تھیں جن پر میں نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو اس خاتون کے خاوند کے پیچھے دوڑایا۔ وہ ابھی ابھی تھانے سے نکلا تھا۔ میں نے کانسٹیبل کو اس شخص کے لئے یہ پیغام دیا کہ اسے کہے کہ اپنی بیوی کو ساتھ لے آئے۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی بیوی کو لے کر آ گیا۔ میں نے اس سے وہی باتیں پوچھیں جو وہ پہلے بتا گئی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ملزم نے اسے کہا تھا کہ الماری سے زیورات نکال دو' پھر اس خاتون نے اسے رقم پیش کی تھی۔ ملزم نے کہا تھا کہ اپنی رقم اپنے پاس رکھو' میں زیورات لینے آیا ہوں۔

خاتون نے ملزم سے کہا تھا کہ یہ زیورات میرے خاوند اور میرے باپ کی عمر بھر کی کمائی ہے۔ ملزم نے اسے کہا تھا کہ یہ زیورات نہ تمہارے باپ کی کمائی ہے نہ تمہارے خاوند کی۔

یہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ اس خوبصورت عورت نے ملزم کو اپنی عصمت پیش کی تھی جو ملزم نے قبول نہیں کی تھی اور کہا تھا کہ میں صرف زیورات لینے آیا ہوں۔

میں نے ملزم کی ان باتوں پر غور کیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ملزم صرف زیورات لینے آیا تھا۔ اگر وہ پیشہ ور چور ہوتا تو وہ اس عورت سے رقم بھی لے لیتا' اس کی آبرو ریزی بھی کرتا اور پھر زیورات بھی لے جاتا۔ اب مجھے یہ شہادت بھی مل گئی تھی کہ ماسٹر کا لڑکا نصرت کے گھر میں جاتا تھا۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ یہ لڑکا نصرت کے خاوند کا ہی

دوست نہیں تھا بلکہ نصرت کے ساتھ بھی اس کی دوستی تھی۔ چونکہ نصرت کا خاوند کچھ دنوں کے لئے اپنے کاروباری دَورے کے لئے باہر چلا جاتا تھا تو بھی یہ لڑکا نصرت کے گھر جاتا تھا۔

میں نے اس خاتون اور اس کے خاوند کو چھُٹی دے دی اور خود سوچنے بیٹھ گیا۔ سوچ سوچ کر میرا ذہن نصرت اور اس لڑکے پر اٹک جاتا تھا۔ ایک خیال آیا۔ نصرت اپنے خاوند کے ساتھ جہاں رہتی تھی وہ الگ محلّہ تھا۔ اس محلے کا چوکیدار الگ تھا۔ میں نے اسے بلایا۔

چوکیدار نے آتے آتے ایک گھنٹہ لگا دیا۔ اسے واردات کی رات اور اندازاً وقت بتا کر کہا کہ یاد کرے کہ نصرت کے گھر والی گلی میں اس نے کسی کو دیکھا ہو گا....

اُس چوکیدار نے بتایا کہ اس وقت اس نے واردات والے محلّے کی طرف سے شور سنا تھا اور ذرا آگے اس طرف چلا گیا تھا۔ فوراً ہی واپس آ گیا۔ نصرت والی گلی کے سرے پر آیا تو اس نے گلی کی بتّی کی روشنی میں ایک آدمی کو نصرت کے گھر سے یا ساتھ والے گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔ وہ کھیتوں کی طرف چلا گیا تھا۔ اسے چوکیدار پہچان نہیں سکا تھا۔

میں نے اب یہ سوچنا شروع کر دیا کہ نصرت سے بات کروں یا اس لڑکے سے۔ سوچ سوچ کر میں نے لڑکے کو بلانا بہتر سمجھا۔ ایک کانسٹیبل کو گھر سمجھا کر کہا کہ ماسٹر کے بڑے بیٹے کو ساتھ لے آئے۔

لڑکا آیا تو باپ بھی اس کے ساتھ تھا۔ باپ کی پریشانی قابلِ فہم اور قدرتی تھی۔ میں نے اسے جھوٹی سچّی تسلیاں دے کر رخصت کر دیا۔ اسے کہا کہ اس کا بیٹا ملزم نہیں' اس سے کچھ پوچھنا ہے۔

لڑکا میرے پاس اکیلا رہ گیا۔ میں نے اس کے ساتھ پیار اور شفقت سے باتیں کیں اور اسے کہا کہ وہ گھبرائے بالکل نہیں۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے اپنی طرف کئے اور اس کی قمیض کی دونوں آستینوں کے بٹن کھول کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی دونوں آستینیں اوپر کیں تو مجھے وہ نشانی نظر آ گئی جو میں دیکھنا چاہتا تھا ——اس کے ایک بازو کی کلائی پر عام کپڑے کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"یہ کیا ہُوا ہے؟"——میں نے پوچھا۔

"کیل لگ گئی ہے"——اُس نے گھبراہٹ کے لہجے میں جواب دیا۔

"پٹی کھول دو"—میں نے کہا۔

وہ سترہ سال کا نو عمر لڑکا تھا اور لڑکا بھی شریف گھرانے کا تھا۔ پیشہ ور ہوتا تو اتنی جلدی نہ گھبراتا۔ یہ شریف گھرانے کا لڑکا ایسا گھبرایا کہ اس سے پٹی کی گانٹھ نہیں کھل رہی تھی۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ لاش کی طرح سفید اور بے نور ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی پٹی کھولی اور دیکھا۔ زخم کیل کا نہیں بلکہ ذرا لمبوترا کٹ تھا جس کی لمبائی ایک انچ سے ذرا زیادہ ہو گی۔

"عدنان یارا"—میں نے اسے کہا—"یہ زخم کیل کا نہیں.... میں جانتا ہوں یہ زخم کیسا ہے اور کہاں آیا تھا۔ گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں گرفتار نہیں ہونے دوں گا۔ اگر تم میری بات نہیں مانو گے تو تمہارے لئے مشکل پیدا ہو جائے گی' پھر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا"۔

اس پر خاموشی طاری ہو گئی تھی اور زبان نے جیسے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

"تمہاری ٹارچ کا شیشہ کہاں ٹوٹا تھا؟"—میں نے پوچھا۔

اس نے بدک کر سر اٹھایا اور میری طرف دیکھا۔

"تم آدھی رات کے بعد نصرت کے گھر سے نکلے تھے تو اس محلے کے چوکیدار نے تمہیں دیکھ لیا تھا"—میں نے کہا—"وہ تمہیں پہچانتا ہے"۔

اس پر تو غشی طاری ہونے لگی تھی۔ بول ہی نہیں رہا تھا۔

"تم نے یہ چوری نصرت کی خاطر کی ہے"—میں نے کہا—"لیکن اب تمہیں اس کی عزت کا ذرا سا بھی خیال نہیں۔ تم نہیں بولو گے تو میں اسے تھانے بلا لوں گا پھر تمہارے ساتھ میرا سلوک بہت بُرا ہو گا"۔

میں نے کچھ اور باتیں کیں تو وہ بولنے پر آ گیا۔ وہ جب بولا تو میں نے محسوس کیا کہ لڑکا جذباتی ہے اور ذہین بھی ہے۔

"یہاں مجھے چاقو لگا تھا"—اس نے کہا—"آپ نصرت باجی کا ذکر نہ کریں۔ میں اس کے لئے اور اس کے خاوند جاوید بھائی جان کے لئے اس سے بھی بڑی قربانی دے سکتا ہوں۔ جاوید بھائی جان کو معلوم نہیں کہ میں نے باجی کا سارا زیور ان حرام خوروں کے گھر سے لا کر اسے دے دیا ہے۔ جاوید بھائی جان باہر گئے ہوئے ہیں"۔

"کیا تم سے یہ واردات نصرت نے کروائی ہے؟"—میں نے پوچھا۔

"نہیں!"—اس نے جواب دیا—"میں نے خود کی ہے' اور یہ میں نے نیکی کا کام کیا ہے۔ جس کا حق مارا گیا تھا اُس کا حق دلا دیا ہے۔ آپ اسے چوری کہیں۔ میں خدا کے آگے شرمسار نہیں"۔

"شاباش!"—یقین کریں کہ میرے منہ سے بے اختیار داد نکلی۔

"آپ کو تو اتنا سا ہی بیان چاہئے کہ یہ چوری میں نے کی ہے"—اس نے کہا—"لیکن اس دنیا میں کوئی ایسا قانون نہیں جو اصل چوروں کو پکڑے"۔

ایسی کئی اور باتیں تھیں جو اس نے کیں اور کچھ باتیں میں نے کیں۔ میری تفتیش ختم ہو گئی تھی۔ میرا ملزم میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اب اس کی باتیں سننے میں کوئی ہرج نہیں تھا' بلکہ اس نے میرے لئے دلچسپی پیدا کر دی تھی کہ اس کی پوری بات سنوں۔ اس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ زیورات نصرت کے گھر میں ہیں۔

میں نے اسے کہا کہ اس کے دل میں جو کچھ بھی ہے وہ کہے اور بتائے کہ اس نے یہ واردات کیوں اور کس طرح کی ہے۔

حق بحقدار رسید

میں اس کا پورا بیان تو سنا نہیں سکتا۔ یہ بہت لمبا تھا۔ میں اختصار سے سناتا ہوں۔ اس کا باپ غصیلے مزاج والا تھا۔ گھر میں ہر کسی کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کے لہجے میں بات کرتا تھا۔ اپنی بیوی کے ساتھ اس کا سلوک بہت ہی بُرا تھا۔ اس کے ساتھ لڑائی جھگڑا اس کا روز مرّہ کا شغل تھا۔ بیوی بیمار رہنے لگی تھی اور ماسٹر صاحب بچّے بھی پیدا کرتے چلے جا رہے تھے۔ گھر میں سکون اور پیار کا نام و نشان نہیں تھا۔

عدنان پہلا بچہ تھا۔ پہلا ہونے کی وجہ اسے پیار ملتا رہا۔ جب اور بچّے پیدا ہوئے تو پیار بٹ گیا پھر پیار کی جگہ باپ کی پھٹکار شروع ہو گئی۔ عدنان کو ماں کے ساتھ پیار تھا اس لئے اس کے باپ کا جو ظالمانہ برتاؤ اس کی ماں کے ساتھ تھا وہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔

یہ خیال رکھیں کہ عدنان نے اپنے بیان میں اپنا نفسیاتی تجزیہ پیش نہیں کیا تھا۔ وہ نفسیات کے عمل اور ردِّعمل سے ناواقف تھا۔ وہ شاید نفسیات کے صرف لفظ سے

واقف تھا۔ وہ تو اپنے گھر کے حالات اور ماحول سنا رہا تھا جس میں اس نے اپنی عمر کے سترہ سال گذارے تھے۔ میں اس کی نفسیاتی محرومیوں اور خامیوں کو سمجھ رہا تھا۔ وہ پیار کا پیاسا تھا اور پیار کی خاطر ہر قربانی دینے کو تیار تھا۔

نصرت کے خاوند جاوید کی اس نے بہت تعریف کی۔ تفتیش کے دوران معززین ور مخبروں نے بھی جاوید کا ذکر کیا تھا۔ سب نے جاوید کے کردار اور اخلاق کی تعریف کی تھی۔ عدنان نے بتایا کہ ایک سال پہلے اس کی جاوید کے ساتھ سلام دعا ہوئی تو وہ جاوید کا گرویدہ ہو گیا۔ جاوید سے اسے پیار مل گیا تھا۔

ایک روز (واردات سے تقریباً تین ماہ پہلے) جاوید نے اسے کہا کہ وہ میٹرک پاس کر چکا ہے اور وہ فارغ ہے' وہ اس کے گھر آ جایا کرے اور اُس کی بیوی کو اُردو اور انگریزی پڑھا دیا کرے۔

"نصرت باجی پانچویں تک سکول میں پڑھی تھی"— عدنان نے بیان دیتے ہوئے کہا— "اپنے ماں باپ مر گئے تو سوتیلوں نے اسے سکول سے اٹھا کر گھر کی نوکرانی بنا لیا۔ وہ جوان ہوئی تو جاوید بھائی جان نے اس کے ساتھ شادی کر لی اور تھوڑے عرصے بعد محسوس کیا کہ نصرت باجی کو کچھ پڑھ لکھ لینا چاہئے۔ انہوں نے مجھے کہا اور میری فیس بھی مقرر کر دی۔ میں نے ان کے گھر جانا شروع کر دیا.....

"میں یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ میاں بیوی مجھے اپنا نوکر سمجھیں گے اور میرے ساتھ نوکروں جیسا ہی سلوک ہو گا لیکن انہوں نے مجھے اپنے گھر کا فرد بنا لیا اور مجھے وہ پیار دیا جو میں سمجھتا تھا کہ میرے لئے دنیا میں رہا ہی نہیں۔ میں نے کہا کہ میں پڑھانے کی فیس نہیں لوں گا لیکن وہ مجھے زبردستی پیسے دے دیتے تھے۔ نصرت باجی تو پیار کے لحاظ سے میری بڑی بہن بھی بن گئی اور ماں بھی۔ میں تو یہ سوچتا رہتا تھا کہ ان کی میں کیا خدمت کروں....

"نصرت باجی اپنے ماں باپ کو یاد کر کے رویا کرتی تھی اور اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس کی ماں کا بہت سارا زیور تھا جس پر اس کی سوتیلی ماں نے قبضہ کر لیا ہے اور مانگنے کے باوجود نہیں دیا۔ باجی یہ بھی کہتی تھی کہ اتنی بڑی حویلی پر بھی انہی کا قبضہ ہو گیا ہے۔ باجی مجھے اپنے بچپن کی باتیں سنایا کرتی تھی"۔

مختصر یہ کہ نصرت نے اپنی ماں کے زیورات کا کئی بار ذکر کیا۔ وہ ان زیورات کو ان کی قیمت کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی ماں کی نشانی کے طور پر اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ مطلب یہ کہ ان زیورات کے متعلق وہ بہت جذباتی تھی۔ ایک روز عدنان نے اس سے پوچھا کہ زیورات کہاں رکھے ہوتے ہیں۔ نصرت نے اسے بتایا کہ ایک الماری ہے جسے تالا لگا رہتا ہے۔ اس میں ٹین کے ایک ڈبے میں زیورات رکھے ہوئے ہیں۔

عدنان تو یہی سوچتا رہتا تھا کہ اپنی باجی کو پیار کی کیا قیمت دے۔ اس نے سوچا کہ وہ زیورات وہاں سے چوری کر کے لے آئے تو یہ چوری نہیں ہو گی کیونکہ یہ زیورات ان کے نہیں جنہوں نے ان پر قبضہ جما رکھا ہے۔ میں آج بھی حیران ہوں کہ اس سیدھے سادے اور اچھے بھلے شریف لڑکے نے نصرت کے بتائے بغیر چوری کی واردات کا بڑا اچھا پلان بنا لیا۔

اس گھر سے وہ واقف تھا۔ بہت پہلے دو چار مرتبہ اس گھر کے اندر گیا تھا۔ آخر ایک رات اس نے بڑی کامیابی سے یہ واردات کر ڈالی۔ یہ اس نے ویسے ہی کی جیسے میں نے سنائی ہے۔ چونکہ وہ اپنے آپ کو چور نہیں سمجھتا تھا اس لئے اس نے اس خاتون کا کوئی لالچ اور کوئی پیشکش قبول نہ کی۔ اس نے یہی کہا کہ میں صرف زیورات لینے آیا ہوں۔ اس نے اس خاتون سے یہ بھی کہا کہ یہ زیورات اس کے باپ اور اس کے خاوند کی کمائی کے نہیں.... اسے معلوم نہیں کہ اپنے انہی الفاظ پر وہ پکڑا جائے گا۔

عدنان کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس عورت کا خاوند کہیں باہر چلا گیا ہے۔ اُدھر جاوید بھی باہر گیا ہُوا تھا۔ عدنان زیورات کا ڈبہ لے آیا اور نصرت کے دروازے پر جا دستک دی۔ نصرت نے دروازہ کھولا تو عدنان کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ عدنان نے اسے زیورات کا ڈبہ دیا تو وہ اور زیادہ پریشان ہوئی۔ یہ تو چوری کی سنگین واردات تھی۔

عدنان اپنے گھر چلا گیا۔ وہ ایک طرف کی دیوار کی باہر نکلی ہوئی اینٹوں کے ذریعے اپنی چھت پر گیا اور نیچے اُتر گیا۔ سب سوئے ہوئے تھے۔ وہ اس صورتِ حال کے لئے بھی تیار تھا کہ باپ کی آنکھ کھل گئی تو وہ اسے مارے پیٹے گا لیکن گھر میں کسی کو پتہ ہی نہ چلا حالانکہ گلی میں محلّے کے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے کیونکہ اس عورت نے شور مچایا تھا۔

اس لڑکے نے اقبالِ جرم تو کر دیا لیکن میں ایک اور ہی سوچ میں پڑ گیا۔ یہ

واردات بہرحال چوری کی واردات تھی۔ چوری ہو جانے والا مال خواہ جس کسی کا تھا' مال چوری ہُوا تھا۔ میں اس ملزم کو چھوڑ نہیں سکتا تھا لیکن ملزم کی باتیں سنیں تو مجھے اس عورت پر اور اس کے خاوند پر بہت غصہ آیا جنہوں نے ایک یتیم لڑکی کے زیورات بھی دبالئے تھے اور اس کی حویلی پر بھی قبضہ کئے بیٹھے تھے۔

یہ قتل کی واردات نہیں تھی۔ یہ ڈاکہ زنی اور نقب زنی کی واردات نہیں تھی۔ چوری کی واردات تھی جسے میں دبا سکتا تھا۔ میرے پاس کچھ اختیارات تھے۔ میں نے ایک کارروائی سوچ لی اور اس کا پہلا قدم یہ اٹھایا کہ عدنان کو کچھ باتیں سمجھا کر اسے اس کے باپ کے ساتھ گھر بھیج دیا۔ اسے کہا کہ وہ کسی کو نہ بتائے کہ وہ چوری میں پکڑا گیا ہے۔

میں رات کو پرائیویٹ کپڑوں میں نصرت کے گھر چلا گیا۔ بڑا اچھا اتفاق ہُوا کہ کچھ ہی دیر پہلے جاوید واپس آگیا تھا۔ وہ مجھے جانتا تھا۔ میں اس کے قصبے کا تھانیدار تھا۔ نصرت کو پتہ چلا کہ میں تھانیدار ہوں تو ان دونوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ چوری کا مال ان کے گھر پڑا ہُوا تھا۔ میں نے جونہی پوچھا کہ عدنان زیورات کا ڈبہ یہاں رکھ گیا ہے' نصرت دوسرے کمرے سے ڈبہ اٹھا لائی اور میرے آگے رکھ دیا۔ وہ اپنی وکالت میں بولنے لگی۔ جاوید بھی اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے لگا۔

"تم دونوں اتنے زیادہ گھبرا کیوں گئے ہو؟" — میں نے کہا — "تھانیدار چوری کا مال برآمد کرنے کے لئے اس طرح تو نہیں آیا کرتے جس طرح میں بغیر وردی آیا ہوں۔ میں تمہارے پاس چوری چھپے آیا ہوں۔ عدنان مجھے سارا قصہ سنا چکا ہے" — "میں نے نصرت سے پوچھا — "کیا سارے زیورات تمہارے ہیں؟"

"صرف تین چھوٹی چھوٹی چیزیں ان لوگوں کی ہیں" — اُس نے جواب دیا — "باقی سب میری امی کا زیور ہے"۔

آج کے نرخ کے مطابق یہ زیورات چار لاکھ روپے سے کچھ زیادہ مالیت کے تھے۔

امی سے بات چلی تو نصرت نے اپنی زندگی کی داستان سنا ڈالی۔ امی کے مرنے کے بعد اس کی مظلومیت کی کہانی شروع ہوئی اور جاوید کے ساتھ شادی پر ختم ہوئی۔ نصرت بہت روئی۔ اُس نے کہا کہ میں اپنی حویلی کو دیکھتی ہوں تو یوں لگتا ہے کہ میری امی اور

آبا جان اندر موجود ہوں گے مگر خیال آتا ہے کہ اس حویلی میں تو غیر آباد ہو گئے ہیں تو سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔

پھر اس نے بتایا کہ عدنان آدھی رات کو آیا اور اسے زیورات کا ڈبہ دیا اور یہ بھی بتایا کہ اس نے یہ چوری کس طرح کی ہے۔ نصرت پر تو خوف طاری ہو گیا۔ جاوید واپس آیا تو اس نے سب سے پہلے اسے عدنان کی یہ واردات سنائی۔ جاوید کو میں نے دیکھا۔ حقیقت پسند اور عقلمند تھا۔ اس نے نصرت سے کہا کہ وہ تھانے جائے گا اور مجھے بتائے گا کہ زیورات اس کے گھر ہیں لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ عدنان گرفتار ہو جائے۔

میں نے عدنان کے بیان کی تصدیق کرنی تھی جو میں نے کر لی۔ میں جاوید کے کردار سے بہت ہی متاثر ہُوا۔

"میں عدنان کو گرفتار نہیں کر رہا" — میں نے انہیں کہا — "میں یہ زیورات اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ کل تم دونوں صبح نو بجے تھانے آجانا۔ ذرا سا بھی نہیں ڈرنا۔ تمہارے زیورات تمہیں مل جائیں گے۔ شاید تمہاری حویلی بھی تمہیں مل جائے"۔

وہ دونوں آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔ آج جبھے یہ واردات یاد آئی تو میں خود حیران ہو رہا ہوں کہ میں نے یہ فیصلہ کیا اور پھر اس کے مطابق کارروائی بھی کی تھی۔ میں ان دونوں کو حیران اور پریشان چھوڑ کر اور زیورات کا ڈبہ اٹھا کر اپنے گھر لے آیا۔ اگلی صبح تھانے گیا اور ان لوگوں کو پیغام بھیجے کہ نو بجے تک تھانے پہنچ جائیں — وہ عورت اور اس کا خاوند جن کے گھر چوری ہوئی تھی' نمبردار اور دو صاحبِ حیثیت اور بوڑھے معززین!

نو بجے سے کچھ پہلے ہی سب آگئے۔ جاوید اور نصرت بھی آگئے۔ میں نے سب کو اپنے دفتر میں بٹھا کر دروازہ بند کر دیا۔ میں ان میاں بیوی سے مخاطب ہُوا جن کے گھر چوری ہوئی تھی۔

"کیا یہ زیورات آپ کے ہیں؟" — میں نے پوچھا اور ساتھ ہی کہا — "آپ معزز انسان ہیں۔ میں توقع رکھوں گا کہ آپ جھوٹ نہیں بولیں گے..... اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ ایک یتیم لڑکی کی حویلی پر قابض ہیں۔ آپ نے اس یتیم لڑکی کی شادی اس طرح کی تھی جیسے گھر سے نکالا تھا اور اس کے زیورات پر قبضہ کر لیا....

اب میرے سوال کا جواب دیں"۔

یہ شخص اپنی بیوی سے اتنا دبا ہُوا تھا کہ اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ بیوی پر خاموشی طاری تھی۔ مجھے ان دونوں پر بہت ہی غصہ تھا۔

"محترمہ!" — میں نے اس کی بیوی سے کہا — "اپنے اس خاوند کو اجازت دے دو کہ یہ سچی بات بتادے۔ کیوں اسے ذلیل و خوار کرتی ہو۔ تم ہی بتادو کہ یہ زیورات تمہارے ہیں؟"

"نہیں جی!" — اس عورت نے دبی آواز میں کہا — "ان میں دو تین چیزیں میری ہیں، باقی سب نصرت کی ہیں"۔

میں نے ڈبہ کھول کر میز پر اُلٹا دیا اور اسے کہا کہ اپنی چیزیں اٹھالے۔ اس نے زیورات میں سے اپنی تین چیزیں الگ کرلیں۔ مجھے یہ یاد ہے کہ ایک تو جھمکوں کی جوڑی تھی اور ایک انگوٹھی تھی، تیسری چیز مجھے یاد نہیں۔ وہ بھی کوئی چھوٹی سی چیز تھی۔ میں نے نصرت کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گئی کہ میں اس سے تصدیق چاہتا ہوں۔ اس نے سر کے اشارے سے بتایا کہ یہ چیزیں اس عورت کی ہیں۔ پھر میں سب سے مخاطب ہُوا۔ میرے زیادہ تر مخاطب دونوں معمّر معزّزین تھے اور نمبردار۔

"آپ میرے بزرگ ہیں" — میں نے کہا اور نصرت کی طرف اشارہ کرکے میں یوں بولا — "اس لڑکی کے گھر کے حالات آپ جانتے ہوں گے"۔

"ہاں جناب!" — ایک بزرگ نے کہا — "یہ بچّی تو ہمارے ہاتھوں میں جنی اور پلی ہے۔ اس کا باپ بڑا ہی نیک اور معزز انسان تھا"۔

"پھر مجھے زیادہ لمبی چوڑی بات کرنے کی ضرورت نہیں" — میں نے کہا — "اس لڑکی کے ساتھ سوتیلوں نے جو سلوک کیا وہ بھی آپ جانتے ہیں" — سب نے تائید میں سرہلائے۔ میں نے کہا — "اللہ نے اس کی سنی اور جاوید نے اس کے ساتھ شادی کرلی لیکن اس کا حق ان صاحب نے اور ان کی اس بیگم صاحبہ نے دبالیا۔ میں آپ کو نہیں بتانا چاہتا کہ یہ زیورات کس طرح چوری ہوئے اور کس نے کئے۔ میرا کام یہیں پر ختم ہوگیا تھا کہ میں نے چور کو پکڑلیا اور مال برآمد کرلیا۔ اب چور کو عدالت میں پیش کرنا تھا لیکن یہ سوچو کہ ہم سب مسلمان ہیں اور ہم ہندوؤں سکھوں میں رہتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ غیر مسلم قوموں میں ہماری بے عزتی ہو۔ یہ قتل یا ڈاکے کی

واردات نہیں۔ معمولی سی چوری کا کیس ہے جسے میں دبا سکتا ہوں۔ کیس کو دبانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ مال کسی اور کا ہے اور یہ حق اُس کو ملنا چاہئے۔ میرے پاس ایسے اختیارات ہیں کہ میں راضی نامہ کراکے اس کیس کو یہیں پر ختم کردوں"۔

"ہاں جناب!" — ایک بزرگ بولے — "یہ جس کا مال ہے اسی کو ملنا چاہئے"۔

دوسرے بزرگ اور نمبردار نے بھی میری تائید پُرزور طریقے سے کی۔

"کیوں جناب!" — میں نے اس خاتون کے خاوند سے پوچھا — "آپ کا کیا خیال ہے؟ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کی حق تلفی کررہا ہوں تو مجھے بتادیں۔ ملزم میرے ہاتھ میں ہے۔ میں اسے گرفتار کرکے باقاعدہ مقدمہ چلاؤں گا اور اسے سزا دلاؤں گا لیکن یہ سوچ لیں کہ کورٹ میں آپ کو اچھی خاصی ذلّت کا سامنا کرنا پڑے گا"۔

"نہیں جناب!" — اس نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا — "میں یہ زیورات نصرت بیٹی کے حوالے کرتا ہوں۔ یہ مال میرا نہیں"۔

"بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی" — میں نے کہا — "آپ کے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ آپ کا اپنا مکان ہے۔ اب آپ جس حویلی میں رہتے ہیں وہ اس یتیم لڑکی کی ہے۔ میں آپ کو مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں کہ اس حویلی کی رجسٹری اس لڑکی کے نام کردیں کیونکہ یہ اس کے باپ دادا کی جائداد ہے اور یہ اس کی ملکیت ہے۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں اس علاقے کا تھانیدار ہوں۔ علاقے میں امن وامان قائم رکھنے کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ آج ان زیورات پر ایک واردات ہوئی ہے تو کل اس حویلی پر آپ یا آپ کی بیگم صاحبہ قتل بھی ہوسکتے ہیں۔ ویسے بھی نصرت مقدمہ کرکے آپ سے حویلی لے سکتی ہے لیکن بہتر یہ ہوگا کہ آپ خود ہی حویلی اسے دے دیں"۔

دونوں بزرگوں نے اور نمبردار نے بھی میری تائید کی۔ میں محسوس کررہا تھا کہ میں اپنے اختیارات سے کچھ تجاوز کررہا ہوں لیکن اُس وقت ایک مظلوم لڑکی کو دیکھ کر اور پھر عدنان کے جذبۂ ایثار کو دیکھ کر مجھ پر کچھ اور ہی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔

میں نے اس عورت کے خاوند کی طرف سے ایک تحریر لکھی جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ وہ چوری کی رپورٹ واپس لینا چاہتا ہے کیونکہ یہ رپورٹ ایک غلط فہمی پر مبنی

تھی۔ اس پر اس کے اور اس کی بیوی کے دستخط کروائے' دونوں معززین اور نمبردار کے بھی دستخط بطور گواہان کروالئے اور زیورات نصرت کے حوالے کر دیئے۔ اس تحریر میں ایسا کوئی ذکر نہیں کہ کیا کہ یہ زیورات نصرت کے تھے یا کسی اور کے۔

اس کیس کو میں نے یہیں پر ختم کر دیا اور میں پھر اس شخص پر زور دینے لگا کہ وہ حویلی نصرت کے نام کر دے اور وہ تمام سامان اور فرنیچر وغیرہ جو حویلی میں پہلے رکھا تھا وہ حویلی میں رہنے دے۔ اس نے پر زور وعدہ کیا کہ وہ ایسے ہی کرے گا۔

ان سب کو میں نے رخصت کر دیا۔ تقریباً ایک مہینے بعد جاوید تھانے میں میرے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ نصرت کو حویلی کی رجسٹری مل گئی ہے اور وہ دونوں حویلی میں شفٹ ہو گئے ہیں۔

"ملک صاحب!" — جاوید نے کہا — "میں تو سمجھتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ نے مجھے ایک نیکی کا اجر دیا ہے۔ نصرت کا رشتہ کوئی گھر قبول نہیں کر رہا تھا حالانکہ آپ نے دیکھا ہے کہ یہ کتنی اچھی شکل و صورت کی لڑکی ہے۔ لڑکوں والے کہتے تھے کہ سوتیلوں نے اسے گھر کی نوکرانی بنا کر رکھا ہُوا ہے اور اس کی عقل ماری گئی ہے۔ جب اس کی یہ سوتیلی ماں آئی تو لڑکوں والوں نے اِدھر سے بالکل ہی منہ پھیر لیا اور لڑکی کو اس طرح بدنام کر دیا کہ یہ سوتیلی ماں جس طرح خود بدچلن ہے اسی طرح اس نے سوتیلی بیٹی کو بھی بنا دینا ہے۔ مجھے پتہ چلا تو خدا کی قسم! صرف نیکی کے جذبے سے اور اس لڑکی کی مظلومیت کو دیکھ کر میں نے اپنے والدین کو ناراض کیا اور نصرت کے ساتھ شادی کر لی۔ میں تو کہتا ہوں کہ نصرت بجائے خود میرے لئے اللہ کا بہت بڑا انعام ہے۔ میرے گھر والوں نے تو مجھے نافرمانی پر گھر سے ہی نکال دیا تھا لیکن خداوند تعالیٰ نے مجھے اتنی بڑی حویلی دے دی"۔

مجھے معلوم نہیں کہ میں نے نیکی کی تھی یا کیا کیا تھا۔

* * *

سزا ملی تو کیسے ملی!

گو میری تفتیش کی یہ کہانی حسب معمول پرانی ہے لیکن اس میں جو مسئلہ اس خوفناک واردات کا باعث بنا وہ پرانا نہیں بلکہ ہمارے آج کے معاشرے میں تو اس مسئلے کو ہر روز زندہ رکھا جا رہا ہے۔ ہم لوگ عبرت حاصل کرنے والوں میں سے نہیں۔ یہی ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اپنی انا کے پجاری بنے ہوئے ہیں۔ یہ ایک واردات سننے کے بعد وعظ اور لیکچر سننے کی ضرورت باقی نہیں رہنی چاہئے۔ میں نے یہ واقعہ اپنی ڈائریوں میں خاص طور پر ریکارڈ کر لیا تھا۔

یہ دِلّی کا اُن دنوں کا واقعہ ہے جب میں سی آئی اے میں ہوتا تھا۔ پرانی دِلّی میں ایک عورت قتل ہو گئی تھی۔ اسے قتل ہوئے چار دن گزر گئے تھے۔ تھانے میں اس کی تفتیش ہو رہی تھی لیکن کیس سی آئی اے کو دے دیا گیا۔ سی آئی اے کو تفتیش کے لئے جو کیس دیئے جاتے ہیں' ان کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ یہ ساری وجوہات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ قتل کے اس کیس کو سی آئی اے کے حوالے کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا سوائے اس کے کہ مقتولہ کا خاوند ہوم ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ کے عہدے پر لگا ہُوا تھا۔ اس محکمے سے ہمیں احکام ملا کرتے تھے۔ مقتولہ کے خاوند کا خیال تھا کہ تھانے والے تفتیش میں کوتاہی کریں گے۔ بہرحال وجہ کچھ بھی تھی' یہ تفتیش ہمارے سپرد کر دی گئی۔ میرے ساتھ ایک اینگلو انڈین سب انسپکٹر لگا دیا گیا جس کا نام فرانسس تھا۔

ہم متعلقہ تھانے میں گئے' ایف آئی آر دیکھی' کیس کی فائل دیکھی اور تھانیدار سے جو معلومات لینی تھیں وہ لے لیں اور ہم نے اس طرح تفتیش شروع کر دی جیسے ہمیں اس کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں۔ قتل کے روز تھانے میں رپورٹ دینے کے لئے مقتولہ کا خاوند گیا تھا اور اس کے ساتھ اس کا ایک بیٹا تھا جس کی عمر اٹھارہ سال تھی

اور اس کا نام عبید تھا۔

ہم نے ان دونوں کو طلب کیا۔ قتل کی واردات دن کے گیارہ بجے کے لگ بھگ ہوئی تھی۔ اُس وقت مقتولہ کا خاوند اپنے دفتر گیا ہُوا تھا۔ گھر میں اس کا یہ نوجوان بیٹا عبید موجود تھا۔ دوسرے بیٹے کی عمر سات سال تھی۔ وہ سکول گیا ہُوا تھا۔ تیسرا بیٹا جس کی عمر چار سال تھی، چھت پر کھیل رہا تھا۔ میں نے سب سے پہلے عبید کا بیان لیا۔

عبید سیکنڈ ایئر کا سٹوڈنٹ تھا۔ اُس صبح وہ کالج گیا تھا لیکن ایک ہی گھنٹے بعد واپس آ گیا تھا کیونکہ اس کے سر میں اتنا شدید درد تھا جو اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ گھر آتے ہی سر درد کی گولی لے کر ایک کمرے میں سو گیا۔ یہ پرانے زمانے کی حویلی تھی۔ صحن خاصا کشادہ تھا۔ ایک طرف ایک بڑا کمرہ اور اس کے پہلوؤں میں چھوٹے کمرے تھے جنہیں اُس زمانے میں کوٹھڑیاں کہا جاتا تھا۔ ان کے بالمقابل دو اور کمرے تھے۔ صحن کے ایک پہلو میں دو اور کمرے تھے۔ ان کے بالمقابل ڈیوڑھی اور اس کے ساتھ ایک اور کمرہ تھا۔ یہ حویلی ان کی اپنی ملکیت تھی۔

عبید نے بتایا کہ وہ جب گھر آیا تو ماں کو کام کاج کرتے دیکھا۔ ماں نے ہی اسے ایک کمرے میں سونے کے لئے بھیج دیا تھا۔ ایک دھماکے سے عبید کی آنکھ کھل گئی۔ اُس دور میں لوگ صرف پٹاخوں اور شادی کے موقعوں پر چلنے والے گولوں کے دھماکوں سے واقف تھے۔ وہ رائفلوں، کلاشنکوفوں اور پستولوں کے دھماکوں سے ناآشنا تھے۔ آج کل تو شہروں میں دھماکے ہی ہوتے رہتے ہیں۔ پتنگ بازی کے ساتھ کلاشنکوفیں فائر ہوتی ہیں۔ شادی کے موقعے پر بھی کلاشنکوفیں اور ریوالور فائر ہوتے ہیں۔ اوچھے امیرزادے گلیوں میں سے گزرتے فائرنگ کرتے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص باہر ایسے اسلحہ کا دھماکہ سنے تو وہ باہر نکل کر دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا کہ یہ کس نے کس پر فائر کیا ہے یا یہ ہوائی فائر تھا۔ عبید نے دھماکہ سنا تو اس کی آنکھ کھُل گئی اور اس نے سوچا کہ یہ پٹاخے یا گولے کا دھماکہ نہیں۔ دھماکے کی آواز ذرا دبی سی تھی۔ یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ دھماکہ اُس کی حویلی کے اندر ہُوا ہے۔

وہ اس طرح پلنگ سے اٹھا جیسے کوئی ایمرجنسی نہیں۔ وہ کمرے سے نکلا اور سامنے دیکھا۔ بڑے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ ایک کواڑ ذرا سا کھُلا ہوا تھا۔ وہ کچھ حیران ہُوا کہ بڑے کمرے کا دروازہ دن کے وقت کبھی یوں بند نہیں ہُوا تھا۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ

ماں شاید باہر نکل گئی ہو۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا صحن سے گزرا اور بڑے کمرے میں چلا گیا۔ اُس نے امّی امّی پکارا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ بائیں والی کوٹھڑی کا بھی ایک کواڑ ذرا سا کھُلا ہوا تھا۔ کواڑ پورا کھول کر اندر دیکھا۔ اس کی ماں فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ عبید دوڑ کر ماں تک پہنچا۔

اس نے پہلے تو ماں کو پکارا، ہلایا لیکن وہ تو مر چکی تھی۔ اس نے کوٹھڑی کی بتّی جلا کر دیکھا۔ ماں کی دائیں آنکھ کے قریب ذرا دائیں اور کچھ اوپر ایک چھوٹا سا سوراخ تھا اور خون سر کے پچھلی طرف سے نکل رہا تھا۔ عبید کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ اس کی ماں کو کوئی گولی مار گیا ہے اور اس نے جو دھماکہ سنا تھا وہ اسی گولی کا تھا۔ عبید نے دھماکے کی جو آواز سنی تھی وہ دبی دبی تھی اور یہ اس لئے کمزور آواز تھی کہ قاتل نے کوٹھڑی کا دروازہ بند کر دیا تھا اور اس کمرے کا بھی دروازہ بند کر دیا تھا جس کے پہلو میں یہ کوٹھری تھی۔ بڑے کمرے کی صحن والی طرف دو کھڑکیاں تھیں جن کے کواڑ سردیوں کی وجہ سے بند رہتے تھے۔

عبید کو تو چکر آنے لگے۔ گھر سے باہر نکل کر اس نے شور شرابہ کیا جس سے محلّے والے اکٹھے ہو گئے۔ کچھ نے اندر جا کر اس کی ماں کی لاش دیکھی۔ اسی محلّے میں ایک ہندو تاجر کی حویلی تھی۔ اس کے گھر میں ٹیلی فون تھا۔ عبید دوڑا گیا اور وہاں سے اپنے باپ کو اطلاع دی۔ باپ فوراً پہنچ گیا اور پھر باپ بیٹا تھانے گئے اور رپورٹ لکھوائی۔

پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا اور مقتولہ دفن ہو چکی تھی اور اس کی رسم قل بھی ہو گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں موت کا باعث گولی لکھا گیا تھا۔ گولی دائیں طرف کی آنکھ کے قریب لگی اور کھوپڑی میں پچھلی طرف سے نکلی۔ تھانیدار نے یہ گولی برآمد کر لی تھی اور ایکسپرٹ سے یہ رپورٹ بھی لے لی تھی کہ گولی پوائنٹ تھری ایٹ ریوالور کی ہے۔ فائر دو تین قدم دُور سے کیا گیا تھا اور پیچھے جو دیوار تھی وہ تین چار گز دور تھی۔ گولی کھوپڑی میں سے گزر کر پیچھے دیوار کو لگی تھی اور وہیں گر پڑی تھی۔

تھانے دار نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ گھر میں چوری چکاری نہیں ہوئی تھی۔ مقتولہ کے کانوں میں سونے کے وزنی جُھمکے تھے اور اس کی ایک انگلی میں انگوٹھی تھی۔ جس کوٹھری میں اسے گولی ماری گئی تھی، سارے ٹرنک اور سوٹ کیس وغیرہ اسی میں پڑے ہوئے تھے۔ زیورات ان ہی میں سے ایک میں رکھے ہوئے تھے۔ مقتولہ کے خاوند نے

دیکھ لیا تھا کہ زیورات وہیں پڑے ہیں۔ ساتھ والے بڑے کمرے میں سامنے ایک تپائی پر مقتولہ کا پرس رکھا تھا جس میں پیسے پڑے ہوئے تھے۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ قاتل لُوٹنے کی نیّت سے نہیں آیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں خاص طور پر لکھا گیا تھا کہ مقتولہ کے ساتھ سوائے اس گولی کے اور کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوئی۔ قاتل اُس وقت اس گھر میں آیا جب گھر میں کوئی مرد نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت گھر میں کوئی نہیں ہوتا۔ یہ انتقامی قتل معلوم ہوتا تھا۔ اُس دَور کے مطابق یہ بڑی ہی دلیرانہ واردات تھی۔ آج کل تو تمام وارداتیں دن کے وقت ہوتی ہیں جن میں فائرنگ ضرور ہی ہوتی ہے۔ اڑوس پڑوس کے لوگ دبک جاتے ہیں اور کوئی واردات کا عینی شاہد ہو تو وہ بھی چُپ رہتا ہے۔

دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی تھیں۔ ایک یہ کہ قاتل غیر معمولی طور پر دلیر ہے اور دوسری یہ کہ قاتل کے اندر انتقامی جذبہ اتنا شدید تھا کہ اس نے پرواہ ہی نہ کی کہ دن دیہاڑے کسی کے گھر میں داخل ہو کر گولی مار کر نکل جانا بہت مشکل اور خطرناک ہے اور پکڑے جانے کا امکان موجود ہے۔ انتقام کے جذبے نے قاتل کی عقل پر پردہ ڈال دیا تھا۔

ہم نے مقتولہ کے خاوند سے پوچھا کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی ہو گی۔ اس نے کہا کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں اور نہ اسے کسی پر شک ہے۔ خاندانی دشمنی بھی کسی کے ساتھ نہیں تھی۔ اس کا بیٹا کالج میں پڑھتا تھا۔ خیال آیا کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی ہو گی۔ پتہ چلا کہ اس کے دوست تو ہیں، دشمن کوئی بھی نہیں۔ وہاں جائداد کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

میں اور فرانسس تھانے جا بیٹھے۔ تھانیدار نے ہمیں ایک کمرہ خالی کرا دیا۔ ہم نے تھانیدار سے راہنمائی لے کر تین چار معززین کو تھانے بلوایا اور تھانیدار سے کہا کہ وہ ہمیں وہ باتیں بتائے جو اس نے اپنے مخبروں سے معلوم کی تھیں۔ تھانیدار سے پوچھا کہ عورت کی عمر اور شکل و صورت وغیرہ کیسی تھی۔ اس نے بتایا کہ عورت کی عمر چالیس سال سے ایک آدھ سال زیادہ ہو گی اور وہ گورے رنگ کی خوبصورت عورت تھی۔ مخبروں نے اسے بتایا تھا کہ وہ زندہ دل اور ہنس مکھ عورت تھی اور محلّے کے گھروں

میں اس کا آنا جانا تھا اس لئے عورتوں میں خاصی مقبول تھی۔ تھانیدار نے یہ بھی کہا کہ وہ ہنسی مذاق کرنے والی زندہ دل عورت تھی، شاید یہی وجہ تھی کہ وہ چالیس سال کی لگتی نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر اور جسم میں جوانی کا عروج تھا۔

معززین تھوڑے تھوڑے وقفے سے آنے لگے اور چار آدمی آ گئے۔ ہم نے ہر ایک کو الگ بٹھا کر مقتولہ اور اس کے گھر کے حالات معلوم کئے۔ یہ بھی پوچھا کہ اس کا زیادہ تر آنا جانا کس کے گھر تھا اور کیا کوئی باہر کا آدمی اس گھر میں آتا جاتا تھا۔ ہم دراصل ذہن میں ایک اور شک رکھ کر ان افراد سے تفتیش کر رہے تھے۔ شک تھا کہ دشمنی کوئی نہیں تھی، قتل چوری یا ڈکیتی کی خاطر نہیں ہوا تھا اور جائداد کا بھی کوئی جھگڑا نہیں تھا اور مقتولہ لڑائی جھگڑا کرنے والی عورت بھی نہیں تھی تو قتل کی ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ اس کے کسی کے ساتھ ناجائز مراسم ہوں گے اور اس نے کسی ایک سے تعلق توڑ کر کسی دوسرے کے ساتھ تعلق پیدا کر لیا ہو گا۔ اس کا پہلا دوست رقابت برداشت نہیں کر سکا ہو گا اور اس نے مقتولہ کو مال بھی بہت کھلایا ہو گا اور اس شخص نے رقابت کی دیوانگی میں اس عورت کو ہی صاف کر دیا۔

ہم نے شام تک ان معززین سے الگ الگ پوچھ گچھ کی اور آخر میں ان سب کو اکٹھے بٹھا کر گفتگو کی۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہ کہا کہ مقتولہ کا چال چلن مشکوک تھا یا اس گھر میں کوئی شخص بے تکلفی سے آتا جاتا تھا۔ مقتولہ پردہ نہیں کرتی تھی حالانکہ اُس دور میں مسلمان عورتیں پردے کی پابندی سختی سے کیا کرتی تھیں اور برقعے میں باہر نکلا کرتی تھیں۔ مقتولہ چادر سر پر لے کر باہر نکلتی تھی۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ وہ عموماً کریم کلر کی چادر اوڑھتی یا بالکل سیاہ رنگ کی۔ ان دونوں میں اس کا حُسن اور ہی نکھر آتا تھا۔ وہ محلے کے ہر گھر کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ رہتی تھی۔ اس کا ہنسی مذاق اور اس کی زندہ دلی تو سارے محلے میں مشہور تھی لیکن عورتوں کی حد تک۔ یوں نہیں کہ محلے کے مردوں کے ساتھ بھی ہنسی مذاق کرتی۔

یہ سب حضرات حیران تھے کہ یہ عورت کیوں قتل ہوئی۔ ان سب کا خیال دریائے جمنا کے پار شاہدرہ جاتا تھا۔ وہ اس لئے کہ مقتولہ شاہدرہ کی رہنے والی تھی۔

دوسری بات ہمارے لئے یہ نئی اور کسی حد تک کار آمد تھی کہ موجودہ خاوند مقتولہ کا دوسرا خاوند تھا۔ مقتولہ نوجوانی میں ہی طلاق لے کر گھر جا بیٹھی تھی۔ اُس وقت اُس کا ایک بچّہ تھا جس کی عمر تقریباً تین سال تھی۔ یہ وہی بچّہ تھا جو اب اٹھارہ سال کا نوجوان بن گیا تھا اور میں اس کا بیان لے چکا تھا۔ وہ عبید تھا..... میں نے شاہدرہ کا نام لیا ہے۔ دلّی کا شاہدرہ لاہور جیسے شاہدرہ کی طرح ہے۔ یہاں دونوں کے درمیان راوی بہتا ہے اور وہاں دلّی اور شاہدرہ کے درمیان دریائے جمنا بہتا ہے۔

سب انسپکٹر فرانسس نے مشورہ دیا کہ پہلے مقتولہ کے دلّی کے حالات اور پھر شاہدرہ میں اس کے گھر کے حالات وغیرہ معلوم کرلئے جائیں۔ ہم نے مقتولہ کے خاوند اور اس کے بیٹے سے اور کچھ بھی نہ پوچھا اور انہیں یہ کہہ کر چھُٹی دے دی کہ وہ ہر وقت شہر میں موجود رہیں اور شہر سے باہر کہیں نہ جائیں۔ اگلے روز صبح ہی صبح میں اور فرانسس شاہدرہ تھانے میں چلے گئے۔ یہاں میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ ہمیں خودکُشی کا بھی شک ہُوا تھا لیکن اس کے خاوند نے اور بیٹے عبید نے قسمیں کھا کھا کر کہا تھا کہ ان کے گھر میں ریوالور ہے ہی نہیں۔ ہم نے ان کی بات مان لی تھی کیونکہ اس زمانے میں کوئی بہت بڑا آدمی یا کوئی نامی گرامی بدمعاش ہی بلا لائسنس اسلحہ اپنے گھر رکھتا تھا۔ مقتولہ کے خاوند جیسے آدمی ایسی جرأت اور حماقت نہیں کیا کرتے تھے۔ اس شخص کو میں نے دیکھ لیا تھا۔ اچھا معزز آدمی تھا۔

شاہدرہ تھانے کے ایس ایچ او کو ہم نے اپنے آنے کا مقصد بتایا۔ اس نے کہا کہ وہ سن چکا ہے کہ شاہدرہ کی ایک عورت دلی میں قتل ہو گئی ہے۔ ہم نے اسے کہا کہ ہم مقتولہ کے یا اس کے گھر کے حالات معلوم کرنے آئے ہیں اور ہمیں ایسے آدمی چاہئیں جو اندر اور باہر کی ہر ایک بات بتا سکیں۔ وہ پرانا تھانیدار تھا۔ ایسی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ ہم اسے سمجھاتے کہ وہ ہماری ضرورت کس طرح پوری کر سکتا ہے۔ اس نے اسی وقت اپنے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور اسے تین چار نام دے کر کہا کہ انہیں کہو کہ فوراً تھانے پہنچ جائیں۔

میں ایسی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا کہ جو آدمی تھانے آئے ان میں سے ہر ایک نے کیا کیا بتایا۔ بات کو مختصر کرنے کے لئے میں بتاتا ہوں کہ چار ویسے ہی معززین کچھ دیر بعد ہمارے پاس آ گئے جیسے ہم نے دلّی میں بلائے تھے۔ یہ میں پہلی کہانیوں میں واضح کر

چکا ہوں کہ میں یا پولیس جن لوگوں کو معزز کہتی ہے، وہ ہوتے تو معزز ہی ہیں لیکن پولیس کے مخبر ہوتے ہیں اور تھانیدار کو اور دیگر سرکاری افسروں کو خوش کرنے کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ ہر دَور میں اور ہر وقت پولیس کے ہاتھ میں ایسے آدمی رہتے چلے آئے ہیں۔ ایک آدمی بوڑھا ہو کر مرجاتا ہے تو اس کا کوئی بیٹا پولیس کے ساتھ تعلق پیدا کرلیتا ہے اور اس طرح یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ ان کے علاوہ جرائم پیشہ افراد اور غنڈے بدمعاش پولیس کے قابلِ اعتماد مخبر ہوتے ہیں۔

خاصا وقت صرف کر کے ان لوگوں سے ہمیں جو کچھ معلوم ہُوا وہ یہ تھا کہ مقتولہ کے والدین کا گھرانہ عزت دار اور شریف گھرانہ تھا۔ وہ مڈل کلاس کے لوگ تھے۔ دشمنی تو دُور کی بات ہے، ان کی کسی کے ساتھ ہلکی سی چپقلش بھی نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی مقتولہ بیٹی کی شادی اپنے جیسے ایک گھرانے میں کی۔ مقتولہ کا پہلا خاوند صحیح معنوں میں بھلا مانس تھا۔ اُس زمانے میں ہر مسلمان نماز اور روزے کی پابندی لازمی طور پر کرتا تھا۔ مقتولہ کا خاوند اس پابندی سے ذرا آگے نکل گیا تھا۔ وہ اس طرح کہ اس نے داڑھی رکھی ہوئی تھی جو مولویوں کی طرح لمبی نہیں تھی بلکہ تراشی ہوئی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ وہ اپنے گھر میں پردے اور دیگر اسلامی احکام کی پابندی کراتا تھا۔

مقتولہ اچھے اخلاق کی لڑکی تھی۔ اس میں دو باتیں ایسی تھیں جو خاوند کو پسند نہیں تھیں۔ ایک یہ کہ لڑکی برقع نہیں لیتی تھی اور دوسری بات یہ کہ وہ ہنس مُکھ اور کھل کر بات کرنے کی عادی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ مردوں کے ساتھ ذرا سی بھی بے تکلّف نہیں ہوتی تھی لیکن عورتوں کے ساتھ اس کی بے تکلّفی ایسی تھی جیسے وہ نو دس سال کی بچّی ہو۔ بیاہ شادیوں پر مدعو ہو تو وہ ڈھولکی پر ناچ بھی لیتی تھی۔

ان معززین نے وثوق کے ساتھ بات کرتے ہوئے بتایا کہ لڑکی چال چلن کے لحاظ سے بالکل صاف اور پاک تھی۔ مقتولہ کی عادات والی لڑکیاں عموماً بدنام ہو جایا کرتی ہیں کیونکہ معاشرے میں دل پھینک عاشق بھی موجود ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایسی بے تکلف طبیعت والی لڑکی بڑی جلدی ہاتھ آ جائے گی لیکن انہیں مایوسی ہوتی ہے۔ مقتولہ ایسی لڑکی تھی کہ اس کی طرف انگلی اٹھا کر کوئی بات نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ اتنی سی بات ضرور ہوتی تھی کہ بڑی خوبصورت لڑکی تھی اور نوجوان اسے رک رک کر دیکھتے تھے۔ ایسی

صورتِ حال میں یعنی جب وہ گلی میں سے گزر رہی ہوتی تو اس کا ماتھا چادر سے ڈھکا ہُوا ہوتا، نظریں نیچی ہوتیں اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں ہوتی تھی۔

ان وجوہات کی بناء پر مقتولہ کی خاوند کے ساتھ نبھ نہ سکی۔ وہ اسے پردے میں بٹھانا چاہتا تھا اور کہتا تھا کہ برقعے کے بغیر باہر نہ نکلے لیکن مقتولہ اپنی فطرت سے مجبور تھی۔ اسے ماں باپ نے بھی کہا کہ وہ خاوند کی بات مانے اور اپنی ازدواجی زندگی میں بدمزگی پیدا نہ ہونے دے۔ یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ اس لڑکی نے اپنے آپ کو خاوند کی پابندیوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی تھی یا نہیں۔ بظاہر اس نے اپنے آپ کو ذرا سا بھی نہ بدلا۔

ان کا ایک بچّہ پیدا ہُوا۔ میاں بیوی میں ناچاقی پیدا ہونے لگی جس نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ محلّے والوں کو بھی پتہ چل گیا کہ میاں بیوی کے درمیان ایک خلیج آ گئی ہے جو بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا نتیجہ آخر طلاق کی صورت میں سامنے آیا۔ اُس وقت بچّے کی عمر تین سال ہونے کو تھی۔ مقتولہ کے والدین نے بڑی شرافت سے طلاق قبول کر لی۔

ماں نے راز دے دیا

مقتولہ کی دوسری شادی سال ڈیڑھ سال بعد ہوئی تھی۔ اس کے بعد بھی مقتولہ نے اپنی عادات کو بدلنے کی کوشش نہ کی لیکن لوگوں کی ہمدردیاں مقتولہ کے ساتھ تھیں اور لوگ مقتولہ کے خاوند کے خلاف اس قسم کی باتیں کرتے تھے کہ مولوی ٹائپ آدمی ہے اور ایک زندہ دل اور شریف لڑکی کو قید میں رکھ کر اسے اپنی زر خرید لونڈی بنانا چاہتا ہے۔ بھائی اتنے چھوٹے تھے کہ وہ ابھی بہن کے معاملات میں دخل اندازی کرنے کے قابل نہیں تھے۔

طلاق کے بعد لڑکی ٹھیک ٹھاک رہی۔ ٹھیک ٹھاک کا مطلب یہ ہے کہ اس نے کوئی نازیبا یا غیر شریفانہ حرکت نہ کی، البتہ اس نے اپنی زندہ دلی کو قائم رکھا۔ ان معززین نے بتایا کہ انہیں ان کی بیویوں اور بیٹیوں وغیرہ سے پتہ چلا کہ مقتولہ کی عادات میں ایک

تبدیلی ضرور آئی۔ وہ یہ تھی کہ تنہائی میں بیٹھتی تو رونے لگتی تھی۔ کبھی اپنے بچّے کو سینے سے لگا کر روتی تھی۔

اس نے تقریباً ایک سال ٹھیک شرافت میں گذارا اور اس کے بعد کچھ سرگوشیاں ہونے لگیں کہ اس نے درپردہ ایک جواں سال امیرزادے کو دوست بنا لیا ہے۔ وہ ایک صوبیدار میجر کا بیٹا تھا جو دِلّی کسی کالج میں پڑھ رہا تھا۔ یہ لوگ شاہدرہ کے ہی رہنے والے تھے۔ باپ نے صرف اس کی تعلیم کی خاطر اس کی ماں کو یعنی اپنی پوری فیملی کو شاہدرہ چھوڑ رکھا تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ مقتولہ کے گھرانے کی دور کی رشتہ داری تھی اس لئے ان کا آپس کا آنا جانا بھی تھا۔ مقتولہ کے گھرانے کی کچھ زرعی اراضی بھی تھی۔ ان کے کھیت صوبیدار میجر کے کھیتوں کے ساتھ ملتے تھے۔ مقتولہ اپنے کھیتوں کو دیکھنے کے بہانے وہاں چلی جاتی اور اُدھر سے صوبیدار میجر کا بیٹا آ جاتا تھا۔ ان دونوں کو کئی بار اکٹھے دیکھا گیا تھا۔ میرے پوچھنے پر ان معزّزین نے متفقہ طور پر جواب دیا کہ ان کی شادی ہو سکتی تھی لیکن لڑکا لڑکی سے کچھ چھوٹا تھا اور لڑکی کا یہ نقص تو نمایاں تھا کہ اس کو طلاق ملی ہوئی ہے اور اس کا ایک بچّہ بھی ہے۔

معزّزین نے یہ بھی کہا کہ یہ گواہی تو کوئی بھی اعتماد کے ساتھ نہیں دے سکتا کہ اس نے ان دونوں کو کبھی نازیبا حالت میں یا قابلِ اعتراض حرکتیں کرتے دیکھا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ان دونوں کی دوستی کوئی ڈھکی چھُپی بات نہیں رہی اور ان کے آپس کے تعلقات صاف ستھرے ہو ہی نہیں سکتے۔ باتیں کرنے والے اس پہلو کو سامنے رکھ کر بات کرتے تھے کہ لڑکی آزاد خیال ہے اور کسی سے ڈرتی نہیں۔

ان لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ مقتولہ کے پہلے خاوند نے عدالت میں صرف اس حکم کے لئے دعویٰ دائر کیا تھا کہ اسے کبھی کبھی اپنے بچّے سے ملنے دیا جائے۔ مقتولہ کے باپ نے مقدمہ نہیں لڑا تھا۔ اس نے عدالت میں بیان دے دیا تھا کہ یہ شخص اپنے بچّے سے جب چاہے مل سکتا ہے۔ عدالت نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ باپ مہینے میں ایک روز بچّے کے پاس آ سکتا ہے اور اگر وہ چاہے تو بچّے کو صرف ایک دن کے لئے اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے۔

عدالت کے اس فیصلے کے بعد کسی مہینے تو باپ اس گھر میں آتا اور بچہ اسے دے کر الگ کمرے میں بٹھا دیا جاتا تھا اور کسی مہینے وہ بچہ اپنے ساتھ لے جاتا اور شام سے

پہلے پہلے مقتولہ کے حوالے کر جاتا تھا۔ بچے کے لئے وہ ہربار ایک آدھ کھلونا' کوئی کپڑا یا کوئی تحفہ ضرور لاتا تھا۔ بعد میں جب مقتولہ کی دوسری شادی ہو گئی اور پہلے خاوند نے بھی شادی کرلی تو بھی باپ بیٹے کی ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ بیٹا اب بھی باپ کے پاس آتا تھا۔

اس کے بعد ہم نے مقتولہ کے باپ کو اور اس کی ماں کو بلوایا۔ ماں کو الگ بٹھا کر پہلے باپ کو اپنے سامنے بٹھایا اور اس سے پوچھا کہ بیٹی کے قتل کا اسے کس پر شبہ ہے۔
اس نے فوراً جواب دیا کہ اسے کسی پر بھی شبہ نہیں۔ یہ پوچھنا تو بیکار تھا کہ اپنے پہلے داماد کے متعلق اس کا کیا خیال ہے کیونکہ پہلے داماد نے اس کی بیٹی کو پندرہ سال پہلے طلاق دی تھی۔ میں نے ایسی وارداتیں بھی دیکھی تھیں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور جب اس کی بیوی نے کسی اور کے ساتھ شادی کرلی یا کسی کے ساتھ تعلقات پیدا کرلئے تو سابقہ خاوند نے اسے قتل کر دیا لیکن ایسا واقعہ کبھی نہیں سنا تھا یا دیکھا تھا کہ طلاق کو چودہ پندرہ سال ہو گئے اور سابقہ خاوند نے سابقہ بیوی کو قتل کر دیا ہو۔

مقتولہ کے باپ نے جو بیان دیا اور ہم نے اس سے جو کچھ پوچھا' وہ معززین کے بیان کی تصدیق تھی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ باپ اپنی بیٹی کے خلاف بات کرتا پھر بھی میں نے اس سے پوچھا کہ اس کی بیٹی پر شک کیا جاتا تھا کہ فلاں صوبیدار میجر کے بیٹے کے ساتھ اس کی بیٹی کی درپردہ دوستی تھی' یہ شک کہاں تک صحیح تھا۔
"بہت پرانی بات ہو گئی ہے صاحب!" — مقتولہ کے باپ نے جواب دیا — "وہ وقت مجھے کیوں یاد دلاتے ہیں؟" — اس معزز اور تعلیم یافتہ باپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دو چار سیکنڈ خاموش رہا پھر بولا — "اُس وقت میری بیٹی نوجوانی کی عمر میں تھی اور صوبیدار میجر کا یہ بیٹا ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میری بیٹی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی اور میں نے دو چار مرتبہ الگ کمرے میں انہیں اکٹھے بیٹھے دیکھا تھا۔ باہر کی باتیں بھی میرے کانوں میں پڑی تھیں اور میں نے بیٹی سے کہا تھا کہ لوگ باتیں کرتے ہیں اس لئے وہ محتاط رہے۔ میری خواہش' دعا اور کوشش یہ تھی کہ بیٹی کی شادی ہو جائے۔ پھر خدا نے کرم کیا کہ ایک شریف آدمی مل گیا۔ اس کے بعد میں نے بیٹی کے متعلق کوئی بات نہیں سنی"۔

اپنے پہلے داماد کے متعلق اس نے کوئی بُری بات نہ کہی۔ اس نے کہا کہ وہ شریف اور اچھا آدمی تھا لیکن میری بیٹی نے اسے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ ہم نے اس سے نہ قبول کرنے کی وجہ پوچھی اور یہ بھی کہا کہ وہ کسی اور کو چاہتی ہو گی۔ اس نے کہا کہ اس کی بیٹی کی اپنی کوئی پسند نہیں تھی نہ اس نے کبھی ماں کو ایسی بات کہی تھی۔ پہلے خاوند کو پسند نہ کرنے کی وجہ باپ نے بھی وہی بتائی کہ خاوند اسے پردے میں بیٹھنے اور نماز وغیرہ کا پابند بنانا چاہتا تھا اور میری بیٹی یہ پابندیاں قبول نہیں کرتی تھی۔
مقتولہ کی ماں کو بلایا۔ وہ روتی زیادہ اور بات کم کرتی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ ہم نے اس کی بیٹی کے قاتل کو پکڑنا ہے اور اسے پھانسی کی سزا دلانی ہے لیکن جب تک وہ ہمارے ساتھ تعاون نہیں کرے گی' ہم قاتل کو پکڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ میں تھی کہ تمہارا اچھا بھلا خاوند ہے جو تمہاری قدر بھی کرتا ہے اور اس کے دل میں تمہاری محبت بھی ہے' کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے پتہ چل جائے.... بیٹی مجھے تسلیاں دیتی تھی کہ خاوند کو پتہ نہیں چل سکتا کیونکہ وہ ایسے وقت اس شخص کو ملتی ہے جب خاوند آفس گیا ہُوا ہوتا ہے۔ مجھے شک ہے کہ میری بیٹی اسے کسی اور جگہ ملتی تھی"۔
"ذرا سوچ کر بتائیں" — میں نے اس خاتون سے پوچھا — "کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ کے اس داماد کو آپ کی بیٹی کے اس دوست کے متعلق پتہ چل گیا ہو اور اس نے آپ کی بیٹی کو اس دوستی سے باز رہنے کو کہا ہو' ان کا آپس میں لڑائی جھگڑا ہُوا ہو اور آپ کے داماد نے آپ کی بیٹی کو قتل کر دیا ہو"۔
"میں ایسی بات زبان پر لانے سے ڈرتی ہوں" — اُس نے کہا — "میرا یہ داماد ایسا لگتا تو نہیں۔ اگر میرے داماد کو میری بیٹی کی ان ملاقاتوں کا پتہ چل جاتا اور بات لڑائی جھگڑے تک پہنچ جاتی تو داماد مجھے یا میرے خاوند کو ضرور بتاتا کہ بات یہاں تک پہنچ گئی ہے اور آپ اپنی بیٹی کو سمجھالیں یا اسے اپنے پاس ہی رکھیں.... یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ میرا یہ داماد بڑا شریف اور ٹھنڈے مزاج کا آدمی ہے"۔
"کیا آپ کی بیٹی نے آپ سے کبھی یہ ذکر کیا تھا کہ اس کے گھر میں ریوالور ہے؟" — میں نے پوچھا۔
"نہیں!" — اس نے جواب دیا — "میری بیٹی کے قتل سے دو روز پہلے بھی داماد ہمارے ہاں آیا تھا۔ وہ پہلے کی طرح خوش و خرم تھا اور میری بیٹی کے ساتھ اس کے

رویّے اور بول چال میں کوئی ذرا سی بھی تبدیلی نہیں تھی۔ میں بچّی تو نہیں۔ میرے داماد کے دل میں اگر یہ ارادہ ہوتا کہ وہ میری بیٹی کو قتل کرے گا تو اس کے انداز اور اس نے اسے یہ تسلّی بھی دی کہ اپنی بیٹی کے متعلق وہ راز کی کوئی بات بتائے گی تو اس بات کو لوگوں میں مشہور نہیں کیا جائے گا بلکہ یہ بات دل میں رکھ کر ہم قاتل تک پہنچیں گے اور اس طرح مقتولہ، اس کے والدین اور اس کے خاندان کی کوئی بے عزتی نہیں ہو گی۔

وہ ماں تھی اور اس کے جذبات کا خون ہو گیا تھا۔ مائیں اپنی بیٹیوں کو اپنے گھروں میں اپنے خاوندوں کے ساتھ ہنسی خوشی بستا رستا دیکھ کر بہت خوش ہُوا کرتی ہیں مگر یہاں اس کی اپنے گھر میں آباد بیٹی جو تین بیٹوں کی ماں تھی، کسی ظالم کے ہاتھوں قتل ہو گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ دوسری شادی سے کچھ مہینے پہلے مقتولہ نے صوبیدار میجر کے بیٹے کے ساتھ دوستانہ لگا لیا تھا۔ ماں مقتولہ سے کہتی رہی کہ وہ بدنام ہونا شروع ہو گئی ہے تو بیٹی نہ مانی اور ماں کو یہ تسلّیاں دیتی رہی کہ لوگ بکواس کرتے ہیں، بدنامی والی کوئی بات نہیں۔ ماں آخر عورت تھی، وہ سمجھتی تھی کہ بیٹی ایک خاوند کے ساتھ کچھ برس گزار چکی ہے اور وہ طلاق کے بعد ایک تشنگی محسوس کرتی ہے۔ اس کے لئے اس نے ایک دوست بنا لیا تھا۔

ماں نے جب یوں کھل کر باتیں شروع کر دیں تو میں نے اس کے جذبات کو سمجھتے ہوئے جذباتی سہارا دیا اور اس کے ذہن اور دل پر قبضہ کر کے ایسی فضا پیدا کر دی کہ یہ خاتون مجھے اپنا غمخوار اور ہمدرد سمجھنے لگی۔ اس نے یہاں تک بتا دیا کہ صوبیدار میجر کا بیٹا اب تین بچوں کا باپ ہے اور اس کی مقتولہ کے ساتھ اب تک دوستی چل رہی تھی۔ یہ شخص مقتولہ سے ملنے دِلّی بھی چلا جایا کرتا تھا۔

"میں نے بیٹی کو منع کیا تھا"— مقتولہ کی ماں نے کہا — "میں اسے اکثر کہتی رہتی کے چہرے پر اس کی ذرا سی جھلک تو ہونی چاہئے تھی۔ وہ میں نے نہیں دیکھی"۔

میرے ساتھی سب انسپکٹر فرانسس نے بھی اس عورت سے کئی ایک سوال پوچھے تھے اور جب اس نے دیکھا کہ یہ خاتون اپنے داماد کے خلاف ذرا سا بھی شک نہیں کر رہی تو فرانسس نے مجھے انگریزی میں کہا کہ ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ مقتولہ کا خاوند بے گناہ ہے۔ ایک مقولہ ہے کہ جس کی چوری ہوئی ہو وہ ہر کسی کو چور سمجھتا ہے۔ یہاں تو

ان لوگوں کی بیٹی قتل ہو گئی تھی۔ اس ماں کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ ہم اس کے داماد کو پولیس والا رگڑا دیں، ہو سکتا ہے کہ اُسی نے ہماری بیٹی کو قتل کیا ہو لیکن یہاں ماں اپنے داماد کی وکالت کر رہی تھی۔ میں نے فرانسس کی اس رائے سے اتفاق تو کیا لیکن یہ بھی کہا کہ یار، تم جانتے ہو کہ قتل اور خودکُشی ایک لمحے کے پاگل پن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مقتولہ کا خاوند شریف اور ٹھنڈے مزاج والا ہی سہی لیکن وہ کوئی فرشتہ تو نہیں تھا۔

وہ وقت مجھے آج تک یاد ہے جب میں شاہدرہ تھانے میں ایک الگ کمرے میں بیٹھا اس خاتون کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ ہم نے اسے باہر بھیجا اور اس کے خاوند کو پھر بلایا۔ اب کے فرانسس نے مقتولہ کے باپ سے وہی بات کہی جو میں نے مقتولہ کی ماں سے کہی تھی۔ یعنی یہ کہ اس کے داماد نے کبھی اس کی بیٹی کی شکایت کی تھی۔

"کبھی نہیں صاحب!"— باپ نے جواب دیا — "اس واردات سے دو روز پہلے داماد میری بیٹی اور بچوں کو ساتھ لے کر ہمارے ہاں آیا تھا۔ مٹھائی کا ڈبہ بھی لایا تھا اور میں نے اس کے رویّے یا کسی اور بات میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھی نہ مجھے یہ شک ہُوا کہ اسے ہماری بیٹی کے خلاف کوئی شکایت ہے"۔

اوچھا نوجوان

مقتولہ کے ماں باپ سے ہمیں اور تو کچھ نہ ملا، البتہ یہ سراغ مل گیا کہ مقتولہ کے اس عمر میں بھی بلکہ قتل تک ایک غیر آدمی کے ساتھ تعلقات تھے اور یہ آدمی اسے ملنے بھی جایا کرتا تھا۔ یہ سراغ ہمیں کسی اور سے نہیں بلکہ مقتولہ کی اپنی ماں نے دیا تھا اور یہ ثبوت تھا کہ یہ بات غلط نہیں۔ مقتولہ کے والدین کو ہم نے جانے کی اجازت دے دی اور میں اور فرانسس آپس میں اس مسئلے پر گفتگو کرنے لگے۔ فرانسس عقل والا پولیس آفیسر تھا اور سراغرسانی میں خصوصی مہارت رکھتا تھا۔ ہم دونوں اس شک پر متفق ہو گئے کہ یہ واردات مقتولہ کے خاوند نے کی ہے اور اس کا باعث یہی ہے کہ مقتولہ کے تعلقات ایک غیر مرد کے ساتھ تھے اور اس نے انہیں کہیں اکٹھے دیکھ لیا ہو گا۔ رہی بات یہ کہ مقتولہ کے خاوند میں مقتولہ کے والدین نے کوئی ایسی ویسی تبدیلی نہیں دیکھی

تھی' اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ ان پر ظاہر ہی نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اسے ان کی بیٹی کے خلاف کوئی شکایت ہے۔

ہمارے سامنے ایک طریقہ تو یہ تھا کہ مقتولہ کے خاوند کو اپنے ساتھ اپنے ہیڈ کوارٹر میں لے جاتے اور وہ نسخہ آزماتے جو پتھروں کو بھی زبان دے دیتا ہے لیکن ایسے طریقے سے لئے ہوئے بیان عدالت میں جا کر اکثر ناکام ہو جاتے ہیں۔ یہ کامیاب اسی صورت میں ہوتے ہیں کہ ثبوت اور شہادت ساتھ ہو اور ایسی ہو کہ عدالت کو قائل کر سکے۔ ہم دونوں نے یہ راستہ اختیار کیا کہ پہلے شہادت اکٹھی کر لی جائے اس کے بعد مقتولہ کے خاوند کو اپنی چکّی میں پیسا جائے۔ اس کے لئے ذرا ذرا سی تفصیل بھی فراہم کرنی ضروری تھی۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ مقتولہ کا خاوند شاہدرہ کا ہی رہنے والا تھا۔ وہ اُس وقت ریلوے ہیڈ کوارٹر میں چیف اکاؤنٹینٹ تھا۔ ہم نے تھانے کے ایس ایچ او سے کہا کہ وہ کسی سیانے سے کانسٹیبل کو مقتولہ کے والدین کے ہاں بھیجے اور وہاں سے ان کے پہلے داماد کا گھر معلوم کر کے اسے ساتھ لے آئے۔ شام ہو چلی تھی۔ ہمیں توقع تھی کہ یہ شخص واپس گھر آ چکا ہو گا۔

ایک کانسٹیبل چلا گیا۔ ایس ایچ او نے ہمارے لئے بڑی پُرتکلّف چائے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ ہم نے چائے ابھی ختم نہیں کی تھی کہ وہ شخص کانسٹیبل کے ساتھ آ گیا۔

میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور میرے دل میں اس کی عزت پیدا ہو گئی کیونکہ وہ اُس وقت کا ایک خوبرو آدمی تھا۔ اُس کی داڑھی مولویوں جیسی تھی ہی نہیں۔ اُس وقت اکثر مسلمان اس قسم کی داڑھی رکھا کرتے تھے جو چھوٹی ہوتی اور سلیقے سے تراشی ہوتی تھی۔ وہ جو چیف اکاؤنٹینٹ تھا آخر کچھ عقل بھی رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ جب بات ہوئی تو معلوم ہُوا کہ اسے اپنی سابقہ بیوی کے قتل کا پتہ چل گیا تھا۔ ایک معزز گھرانے کی عورت کا قتل ہو جانا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔

ہم نے اس سے پوچھا کہ اسے مقتولہ کے خلاف کیا شکایت تھی۔

"شکایت کوئی زیادہ بڑی تو نہ تھی" —— اس نے کہا —— "مجھے اُس کا بے پردہ ہو کر باہر نکلنا اچھا نہیں لگتا تھا اور وہ نماز کی پابندی نہیں کرتی تھی۔ میرے ساتھ اس نے کبھی

بدتمیزی نہیں کی تھی بلکہ مجھے خوش رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ پھر مجھے یہ شکایت تھی کہ وقت بے وقت باہر نکل جاتی تھی۔ وہ آوارہ گردی نہیں کرتی تھی' اپنے گھر یا کسی اور کے گھر چلی جاتی تھی۔ اکثر یوں ہوتا تھا کہ میں تھکا ماندہ آفس سے گھر آیا تو دیکھا بیوی غائب ہے۔ کبھی اپنے ماں باپ کے ہاں جا بیٹھتی اور کبھی محلّے میں کسی کے گھر۔ میرے والد صاحب بھی اس کی اس عادت کو معیوب سمجھتے تھے۔ بچّہ پیدا ہُوا تو میں یہ سوچنے لگا کہ اس کی تربیت میں خود کروں گا۔ اگر ماں نے اس کی تربیت کی تو بچہ ماں کے نقشِ قدم پر ہی چلے گا"۔

اس شخص کے سارے بیان سے جو خاصا لمبا تھا' ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ طلاق اس اکیلے نے نہیں دی تھی بلکہ اس کے باپ اور پھر اس کی ماں کا عمل دخل تھا۔

"طلاق کے بعد اس کے چال چلن کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟" —— میں نے پوچھا۔

"اس کے چال چلن کی میں نے ہمیشہ تعریف کی ہے" —— اُس نے جواب دیا —— "اس کی دوسری شادی سے کچھ پہلے میرے کانوں میں ایسی باتیں پہنچی تھیں جیسے اس نے کسی کے ساتھ دوستی کر لی ہے۔ میں اس شخص کو جانتا ہوں۔ وہ اس کے رشتہ داروں میں سے ہے۔ اس کا باپ ریٹائر ہو کر مر بھی چکا ہے۔ نوجوانی کے زمانے میں وہ اوچھی قسم کا نوجوان تھا۔ اگر میری اس سابقہ بیوی کے ساتھ اس نے دوستانہ کر ہی لیا تھا تو میں حیران ہوں کہ اس نے اس اوچھے آدمی کو کس طرح قبول کر لیا تھا۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ یہ شخص اب تک میری سابقہ بیوی سے ملتا رہا ہے۔ ذرا میری اس بات پر غور کیجئے گا صاحب! میں نے کہا ہے کہ میں نے یہ باتیں سنی ہیں۔ میں اپنی طرف سے مرحومہ پر کوئی الزام عائد نہیں کر رہا نہ کروں گا کیونکہ میں نے اسے کسی کے ساتھ چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے یا کوئی نازیبا حرکت کرتے نہیں دیکھا۔ میں اسے گناہ سمجھتا ہوں کہ بغیر کسی ثبوت کے کسی پر اتنا غلیظ الزام عائد کر دیا جائے"۔

یہ شخص صحیح معنوں میں مومن تھا۔ اس کے ساتھ بہت باتیں ہوئی تھیں۔ میں اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ سب انسپکٹر فرانسس کی بھی یہی رائے تھی۔ اس شخص سے ہم جھوٹ کی توقع نہیں رکھ سکتے تھے۔ اسے ہم نے تفتیش سے فارغ کر دیا۔

شام گہری ہو چکی تھی۔ ہمارا سارا دن وہیں گُل ہو گیا تھا۔ اب ہم نے جسے شاملِ تفتیش کرنا تھا وہ یہ شخص تھا جس کے مقتولہ کے ساتھ تعلقات تھے۔ اس کا نام ایوب بتایا گیا تھا۔ چونکہ وہ ایک صوبیدار میجر کا بیٹا تھا اور مشہور زمیندار بھی تھا اس لئے ایس ایچ او اسے جانتا تھا۔ میں نے اور فرانسس نے آپس میں بات کر کے طے کیا کہ رات ضائع نہ کی جائے' اس شخص کو ساتھ ہیڈ کوارٹر لے چلتے ہیں اور آدھی رات کے لگ بھگ تفتیش شروع کریں گے۔ فرانسس کا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے قاتل یہی شخص ایّوب ہی ہو۔

میں نے جب فرانسس کے اس شک پر غور کیا تو مجھے بھی یہی خیال آیا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہُوا تھا تو اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ مقتولہ نے اس سے قطع تعلق کر کے دلّی کے کسی آدمی کے ساتھ تعلق پیدا کر لیا ہو گا یا دوسری وجہ یہ کہ مقتولہ اسے بلیک میل کرتی ہو گی۔

یہ تو تفتیش میں ہی معلوم ہونا تھا کہ اس شخص کا رویہ کیا ہو گا اور راز کی کوئی بات معلوم ہوتی ہے یا نہیں۔ میں نے ایس ایچ او سے کہا کہ وہ ایّوب کو بلوا دے۔ اس نے اُسی وقت ایک کانسٹیبل کو بھیج دیا۔

تصویر اور دو رُقعے

کچھ دیر بعد کانسٹیبل کے ساتھ ایک خوبرو جوان آدمی ہمارے سامنے آن کھڑا ہُوا اور اُس نے بڑی بے تکلفی سے میرے ساتھ' فرانسس کے ساتھ اور ایس ایچ او کے ساتھ ہاتھ ملایا اور پھر ہماری خیر خیریت پوچھی۔ ہم نے اسے بٹھایا تو اس نے پوچھا کہ اس کے لئے کیا حکم ہے۔ وہ خوش شکل اور خوش طبیعت آدمی تھا۔

"آپ کی دوست قتل ہو گئی ہے" — میں نے کہا — "اس کے متعلق کچھ باتیں پوچھنی ہیں"۔

"کون سی دوست؟" — اُس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا — "میری کسی عورت کے ساتھ دوستی نہیں!"

میں نے مقتولہ کا نام لیا اور اسے کہا کہ وہ ہمارے ساتھ تعاون کرے تاکہ ہم قاتل کو پکڑ سکیں۔

"آپ حکم کریں کہ آپ کو کس طرح کا تعاون چاہئے" — اُس نے کہا — "میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا لیکن یوں نہ کہیں کہ میری اس کے ساتھ دوستی تھی یا اور کوئی تعلق تھا"۔

فرانسس نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"آپ ہمارے ساتھ چلیں" — فرانسس نے اسے کہا — "ہم آپ کو دِلّی لے جائیں گے اور کچھ دیر بعد واپس چھوڑ جائیں گے"۔

"آپ نے جو کچھ بھی پوچھنا ہے یہیں پوچھ لیں" — اُس نے کہا — "یا میں صبح سویرے آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا"۔

میں بھی اُٹھ کھڑا ہُوا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ وہ ابھی ہمارے ساتھ چلے کیونکہ ہم اسے اپنی ضرورت کے مطابق لے جا رہے ہیں اور ہمیں اس کی سہولت کی کوئی پرواہ نہیں۔

"میں پھر گھر اطلاع دے آؤں" — اُس نے کہا۔

"آپ کے گھر اطلاع پہنچ جائے گی" — میں نے کہا اور ایس ایچ او سے کہا — "آپ ذرا ان کے گھر بتا دینا کہ یہ صاحب ہمارے ساتھ دلّی چلے گئے ہیں اور جلدی واپس آ جائیں گے"۔

وہ پس و پیش کرتا رہا اور ہم نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جیپ میں جا بٹھایا۔ میں اس کے پہلو میں بیٹھ گیا اور سب انسپکٹر فرانسس سٹیئرنگ پر بیٹھا اور اس نے جیپ چلا دی۔ ایّوب کچھ نہ کچھ بولتا جا رہا تھا۔ اس نے احتجاج بھی کیا لیکن میں نے اسے تسلی دلاسہ دینے کے سوا اور کچھ بھی نہ کہا۔

ہم دلّی اپنے ہیڈ کوارٹر میں پہنچے اور ایّوب کو ایک ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کر کے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ ہم نے طے کر لیا تھا کہ رات بارہ بجے واپس آئیں گے۔ اگر یہ شخص شاہدرہ تھانے میں ہی مان لیتا کہ مقتولہ کے ساتھ اس کی دوستی تھی تو ہم شاید وہیں اس سے پوچھ گچھ کر کے اسے گھر بھیج دیتے لیکن وہ بڑی دلیری سے انکار کر رہا تھا اور اس کا انداز ایسا تھا جیسے ہمیں بے وقوف بنا رہا ہو یا جیسے اسے یہ گھمنڈ تھا کہ ہم اس پر

اپنا حکم نہیں چلا سکتے۔ اس کا شمار بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا۔

میں اور فرانسس رات بارہ بجے اپنے ہیڈ کوارٹر میں پہنچ گئے اور ایّوب کو تفتیش والے کمرے میں لے گئے۔

"یہاں سے تم بھاگ نہیں سکتے ایّوب!" — میں نے کہا — "جب تک سچ نہیں بولو گے، ہم سے جان نہیں چھڑا سکو گے"۔

"ایک بات بتاؤ ایّوب!" — فرانسس نے پوچھا — "تم کیوں انکار کرتے ہو، مان کیوں نہیں لیتے کہ مقتولہ کے ساتھ تمہاری دوستی تھی؟"

وہ ایسا ڈھیٹ آدمی تھا کہ مانتا ہی نہیں تھا۔ یہ شک والی تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ ہمیں بہت سے آدمی بلکہ مقتولہ کی اپنی ماں بتا چکی تھی کہ ایّوب کی مقتولہ کے ساتھ دوستی تھی۔

"کیا ہم تمہاری بیوی کو یہاں بلوا لیں؟" — میں نے ہوا میں تیر چلاتے ہوئے کہا — "وہ تو فوراً بتا دے گی کہ تم نے مقتولہ کے ساتھ تعلقات گانٹھ رکھے تھے"۔

میں نے یہ بات اس خیال سے کہی تھی کہ جہاں بہت سے لوگ ایّوب اور مقتولہ کے تعلقات کی باتیں کرتے تھے وہاں ایّوب کی بیوی کو لازماً علم ہو گا اور اگر اسے علم تھا تو وہ یقیناً پریشان ہو گی.... ایّوب کا چہرہ بتا رہا تھا کہ میری اس دھمکی کا اس پر اثر ہُوا ہے۔

"چھپانے والی کوئی بات نہیں صاحب!" — اُس نے کہا — "وہ ہماری رشتہ دار تھی اس لئے میرا ان کے ہاں آنا جانا لگا رہتا تھا اور کبھی وہ بھی ہمارے ہاں آ جاتی تھی لیکن آپ دوستی کی بات کر رہے ہیں۔ یہ آپ کو غلط اطلاع دی گئی ہے"۔

"تم اس کی شادی کے بعد بھی دِلّی اسے ملنے آتے رہے ہو" — میں نے اسے کہا۔

"اور اب میں تمہیں اصل بات بتا دوں" — فرانسس نے کہا — "اُس نے تمہیں اپنے گھر آنے سے منع کر دیا تھا لیکن تم اس کے ساتھ تعلق توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ تم نے یوں انتقام لیا کہ اس کے گھر جا کر اسے گولی مار دی"۔

ایّوب نے تو تڑپنا اور اچھلنا کُودنا شروع کر دیا۔ وہ قسمیں کھا رہا تھا کہ ایسی بات نہیں ہوئی۔

"پھر تم نے اسے گولی کیوں ماری؟" — یہ میں نے اس پر مزید دباؤ ڈالنے کے

لئے کہا۔

"اب تم گھر نہیں جا سکو گے" — فرانسس نے کہا۔

وہ تو رونے پر آ گیا۔ اب تو وہ ہاتھ جوڑتا اور کہتا تھا کہ وہ قاتل نہیں اور اس نے کبھی ایسی بات سوچی بھی نہیں تھی اور ایسی بات سوچنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔

"پھر کیوں نہیں مانتے کہ مقتولہ کے ساتھ تمہارے ناجائز تعلقات تھے؟" — میں نے پوچھا اور کہا — "ہم نے تھانے سے تمہاری رپورٹ لی ہے۔ تم شریف آدمی نہیں"۔

وہ چپ ہو گیا اور اُس نے سر جھکا لیا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ ہم نے اسے سوچنے کا موقع دیا۔

"میں مرد ہوں اور میں گھٹیا مرد نہیں ہوں" — اس نے کہا — "میں اس لئے تعلقات کی بات اپنی زبان پر نہیں لاتا تھا کہ وہ بیچاری بدنام نہ ہو..... اس کے ساتھ میری ایسی ہی دوستی تھی جیسی آپ کہہ رہے ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ میں دِلّی اس کے پاس آیا کرتا تھا"۔

"کیا اس کے خاوند کو معلوم تھا؟" — فرانسس نے پوچھا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا" — اُس نے جواب دیا — "اگر اس کے خاوند کو پتہ چل جاتا تو وہ اپنی بیوی کے ساتھ ضرور بات کرتا، اسے ڈانٹتا، دھمکیاں دیتا اور بازپُرس کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کی بیوی مجھے ضرور بتاتی"۔

"اور یاد کرو" — میں نے کہا — "اس کے خاوند نے تم دونوں کو کہیں دیکھا ہو گا۔ وہ تمہارا تو کچھ نہ بگاڑ سکا، اس نے اپنی بیوی کو گولی مار دی"۔

"جہاں تک میں جانتا ہوں، اس کے خاوند نے ہمیں کبھی نہیں دیکھا تھا" — ایّوب نے کہا — "ہماری ملاقات اتنی خفیہ ہوتی تھی کہ سوائے خدا کے کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا"۔

میرے ذہن میں ایک شک اور آ گیا۔

"ہم نے مان لیا کہ تم نے اسے قتل نہیں کیا" — میں نے ہنستے ہوئے کہا — "یہ خوف دل سے اتار دو کہ ہم تمہیں گرفتار کر لیں گے۔ میں ویسے ہی دوستوں کی طرح

پوچھ رہا ہوں.... تم شاید اس سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے اور وہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی"۔

"سچی بات بتاؤں صاحب!" — اُس نے مسکراتے ہوئے کہا — "میں اس سے پیچھا نہیں چھڑانا چاہتا تھا بلکہ وہ کبھی کبھی کہا کرتی تھی کہ اب یہ دوستی ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔ یہ وہ اس لئے کہتی تھی کہ اس کا بیٹا جوان ہو گیا تھا۔ اس کا دوستی توڑنے کا کوئی پکّا ارادہ نہیں تھا.... وہ جو میں سچّی بات کہنے لگا تھا وہ یہ ہے کہ وہ میری بلیک میلنگ سے ڈرتی تھی حالانکہ میں نے اسے کبھی ایسی دھمکی نہیں دی تھی"۔

"تمہارے پاس بلیک میلنگ کا کوئی ذریعہ تھا؟" — میں نے پوچھا۔

"ہاں صاحب!" — اُس نے کہا — "ایک بار وہ میرے ساتھ فوٹو کھنچوا بیٹھی تھی۔ ایک تو یہ فوٹو اور اس کا نیگیٹو میرے پاس ہے اور اس کے دو رُقعے بھی میرے پاس ہیں جو اس نے مجھے میری ایک نوکرانی کے ہاتھ بھیجے تھے"۔

اصل بات تو وہ بتا ہی چکا تھا' اب ہم اس سے جو کچھ بھی پوچھتے تھے یا جرح کرتے تھے' وہ بے تکلّفی سے جواب دیتا تھا۔ ہم نے کئی بار اس شک کا اظہار کیا کہ مقتولہ کے خاوند نے انہیں کہیں دیکھا تھا اور مقتولہ کے قتل کا یہی باعث بنا لیکن ایوّب ہمارے اس شک کو رد کر رہا تھا۔ اس سے ہمیں مایوسی ہو رہی تھی۔ ہم نے اس شخص کو اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لیا جس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ قتل کی واردات کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ہم نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ معاشرے میں اچھی پوزیشن والا ہے اور وہ اپنے طور پر جاسوسی کرے اور اس طرح ہماری مدد کرے۔

"میں خود حیران ہوں صاحب!" — ایوّب نے کہا — "مجھے قتل کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ کے کہنے کے بغیر ہی میں اِدھر اُدھر سے سُن گن لے رہا ہوں کہ مجھے قاتل کا سراغ مل جائے۔ میرا تو خون کھول رہا ہے صاحب! اگر مجھے یقین ہو گیا کہ فلاں آدمی قاتل ہے تو ہو سکتا ہے کہ میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکوں اور اسے قتل کر دوں"۔

"اب اپنی بیوی کی بات کرو" — فرانسس نے کہا — "تمہاری بیوی تو یقیناً تمہارے اور مقتولہ کے تعلقات توڑنا چاہتی ہوگی۔ اس کے بھائی ہوں گے...."

"گستاخی معاف صاحب!" — ایوّب نے کہا — "میں نے آپ کی بات کاٹ دی ہے۔ میری بیوی کا کوئی بھائی نہیں۔ وہ تین بہنیں ہیں۔ میری بیوی اتنی جرأت نہیں رکھتی کہ اس نے قتل کی واردات کرا دی ہوگی۔ ہمارے تعلقات آج کے تو نہیں' یہ اٹھارہ اُنیس سال کے تعلّقات ہیں۔ اگر میری بیوی اتنی طاقت والی ہوتی تو وہ بہت عرصہ پہلے یہ کارروائی کر چکی ہوتی۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ میں نے اپنی بیوی سے یہ کبھی نہیں کہا اور نہ کبھی اسے یہ احساس ہونے دیا ہے کہ میں اس کی بجائے کسی اور عورت کو پسند کرتا ہوں۔ آپ اگر چاہیں تو اس کے ساتھ بات کر سکتے ہیں"۔

ہم نے اس کے مشورے پر تو نہیں چلنا تھا نہ ہم نے اس کی ہر بات کو سچ مان لینا تھا' ابھی تو ہم نے مخبروں سے بھی رپورٹیں لینی تھیں اور نہ جانے کس کس کو شاملِ تفتیش کرنا تھا۔ ہم اس شک کو ذہن میں رکھ کر تفتیش کر رہے تھے کہ قتل کا باعث مقتولہ کے ایوّب کے ساتھ تعلّقات ہیں۔ میں نے ڈرائیور کو بلا کر کہا کہ ایوّب کو شاہدرہ اس کے گھر چھوڑ آئے۔

عبید بھی گیا

اگلی صبح ہم مقتولہ کے گھر چلے گئے۔ عبید کالج نہیں گیا تھا اور اس نے جانا بھی نہیں تھا کیونکہ وہ بہت ہی مغموم تھا۔ مقتولہ کے والدین ہم سے تھوڑی دیر پہلے شاہدرہ سے ان کے پاس پہنچ گئے تھے۔ مقتولہ کا خاوند آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے ہم نے روک لیا۔ پہلے عبید کو الگ کمرے میں بٹھایا۔ اس کے ساتھ ہمدردی کی باتیں کیں اور اس کی حوصلہ افزائی کی پھر اسے کہا کہ وہ ہمیں کچھ بتائے کہ قاتل کون ہو سکتا ہے اور قتل کی وجہ کیا ہے۔

عبید خوبصورت نوجوان تھا۔ اسے دیکھ کر طبیعت خوش ہوتی تھی لیکن وہ اس قدر مغموم تھا کہ اُس کے منہ سے بات بھی نہیں نکلتی تھی۔ ہم اس سے کچھ پوچھتے تھے تو وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا جیسے بھاگ جانے کا راستہ دیکھ رہا ہو۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کی ماں گھر میں خوش رہتی تھی یا نہیں اور کیا میاں بیوی آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے؟

"نہیں جی!" — عبید نے بڑی مشکل سے اپنے منہ سے یہ الفاظ باہر کو دھکیلے — "وہ آپس میں کبھی نہیں لڑے تھے۔ ٹھیک ٹھاک رہتے تھے"۔

"شاہدرہ کے ایک آدمی ایوّب کو تم جانتے ہو گے" — میں نے پوچھا — "کیا وہ یہاں بھی آیا کرتا تھا؟"

"نہیں!" — عبید نے جواب دیا — "وہ یہاں کبھی نہیں آیا۔ شاہدرہ میں ہمارے گھر آیا کرتا تھا"۔

"وہ کیسا آدمی ہے؟" — فرانس نے پوچھا۔

"بہت اچھا آدمی ہے" — عبید نے جواب دیا — "میری امّی اسے بہت اچھا چاہتی تھیں" — اتنا کہہ کر وہ بے اختیار رو پڑا۔

اسے رونا ہی تھا۔ اس کی ماں قتل ہو گئی تھی۔ ہم نے اس سے یہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا کہ ایوّب کے تعلق اس کی ماں کے ساتھ کیسے تھے یا کیا اس نے کبھی سنا ہے کہ ان کے تعلّقات قابلِ اعتراض تھے۔ وہ تو ہمیں ایوّب خود ہی بتا گیا تھا۔

پھر ہم نے عبید کے چھوٹے بھائی کو بلایا جس کی عمر سات سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ بھی رو رہا تھا۔ اُس نے بھی یہی بتایا کہ اس کی امّی اور ابّا آپس میں بہت خوش رہتے تھے۔

میں ان تفصیلات میں نہیں جا رہا کہ ہم نے ان دونوں سے کیا کچھ پوچھا اور انہوں نے کیا بتایا کیونکہ ان سے کوئی اہم بات معلوم نہ ہوئی۔ مقتولہ کے خاوند سے بھی پوچھ گچھ کی تو اس سے بھی کام کی کوئی بات معلوم نہ ہوئی۔ اس سے ہم نے یہ بھی پوچھا کہ ایوّب اور اس کی بیوی کے آپس کے تعلقات کے متعلق اس کی کیا رائے ہے۔

"میرے خیال میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں تھی" — اس نے بتایا — "مجھے اپنی بیوی پر پورا بھروسہ تھا"۔

"کیا وہ یہاں بھی کبھی آیا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"یہاں تو وہ کبھی نہیں آیا" — اس نے کہا — "اُس کے ساتھ میری ملاقات شاہدرہ میں میرے سسرال کے ہاں ہوئی تھی اور اس کے بعد وہیں اس سے کبھی ملاقات ہو جاتی تھی.... آپ اس کے متعلق کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"ہم نے قاتل کا سراغ لگانا ہے" — میں نے کہا — "ہماری نظریں اندھیرے

کونوں کھدروں تک بھی چلی جاتی ہیں۔ بعض اوقات کوئی بالکل ہی غیر اہم آدمی آخر میں بڑا ہی اہم نکل آتا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں، ہمیں ہر بات پوچھنی پڑتی ہے"۔

ایک وہ گناہگار ہوتے ہیں جو معصومیت کی کامیاب ایکٹنگ کر لیتے ہیں اور ایک وہ معصوم ہوتے ہیں جو بات ایسے طریقے سے کرتے ہیں کہ گناہگار لگتے ہیں۔ تفتیشی افسر میں یہ قابلیت ہونی لازمی ہے کہ وہ باتوں پر نہ جائے اور گناہگار اور معصوم میں تمیز کر سکے۔ یہ تجربہ مجھے حاصل ہو چکا تھا اور سب انسپکٹر فرانس تو مجھ سے بھی زیادہ باریک بین اور ذہین تھا۔ مقتولہ کے خاوند سے ہم نے جو باتیں پوچھیں اور جس انداز سے پوچھیں، اس سے وہ بہت ہی پریشان ہو گیا اور آخر میں ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ شخص قتل جیسے اقدام کی جرأت نہیں رکھتا اور اسے اپنی بیوی سے دلی محبت تھی۔ اس نے بتایا کہ مقتولہ کے ساتھ اس کی شادی ایک دوست کی معرفت ہوئی تھی۔ اس کے والدین اس لئے اس لڑکی کو گھر نہیں لانا چاہتے تھے کہ طلاق یافتہ ہے اور اس کا ایک بچہ بھی ہے لیکن جب اس نے لڑکی کو دیکھا تو یہ بھی قبول کر لیا کہ لڑکی طلاق یافتہ ہے اور اس کے بچے کو بھی قبول کر لیا۔ اسے اپنی بیوی کی خوش مزاجی اور آزاد خیالی اچھی لگتی تھی۔ اُس نے اپنی بیوی پر پردے کی اور بُرقعے کی پابندی عائد کی ہی نہیں تھی۔

میں یہ باتیں بہت ہی مختصر کر کے پیش کر رہا ہوں کیونکہ اس کے بعد ایک بڑا ہی ہولناک واقعہ ہو گیا۔ میں اب آپ کو یہ واقعہ سناؤں گا.... ہمارا وہ دن وہیں گزرا، اگلا دن مخبروں سے رپورٹیں لینے میں گزرا اور اس سے اگلے دن کے غالباً گیارہ بجے تھے جب مجھے بتایا گیا کہ شاہدرہ تھانے کے ایس ایچ او کا فون ہے۔ میں فون سننے لگا۔ توقع یہ تھی کہ وہ اس واردات کے متعلق کوئی بات بتائے گا لیکن اس نے یہ خبر سنائی کہ مقتولہ کے بیٹے عبید کو اس کے باپ یعنی عبید کی ماں کے پہلے خاوند نے ریوالور سے گولی مار کر قتل کر دیا ہے۔ پولیس والے اپنے جذبات کو دبا کر رکھتے ہیں۔ میرا ردِّعمل یہ نہیں تھا کہ مجھے سخت صدمہ پہنچا کہ پہلے ماں قتل ہوئی اور اب اس کا نوجوان بیٹا مارا گیا ہے بلکہ مجھے اطمینان سا محسوس ہُوا کہ اب مقتولہ کا قاتل بھی مل جائے گا۔ یہ قاتل مقتولہ کا پہلا خاوند بھی ہو سکتا تھا جس نے اپنے سگے نوجوان بیٹے کو گولی مار دی تھی۔

ایس ایچ او نے بتایا کہ عبید کو اس کے باپ نے اپنے گھر گولی ماری ہے اور تھانے میں آ کر یہ رپورٹ دی ہے کہ اُس کے بیٹے نے خود اپنے سر میں گولی مار کر خودکشی کی

ہے۔ باپ نے وہ ریوالور جس سے اس کے بیان کے مطابق عبید نے خودکشی کی تھی، تھانیدار کے حوالے کردیا۔ تھانیدار نے اسے کہا کہ اپنی پہلی بیوی کو بھی اسی نے قتل کیا ہے اور بیٹے کو بھی۔

شاہدرہ تھانے کا یہ ایس ایچ او ایک ہندو راجپوت تھا جو طبیعت اور مزاج کا بڑا ہی سخت تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ عبید کے باپ سے بیان لینے کے لئے اس نے اس شخص پر ایذا رسانی کا عمل شروع کردیا ہے لیکن وہ ابھی تک اس بات پر قائم ہے کہ عبید نے خودکشی کی ہے۔

اس واردات کا تعلق اُس واردات کے ساتھ نظر آتا تھا جس کی تفتیش ہم کر رہے تھے لیکن ہم اپنے آپ ہی اس تازہ واردات کی تفتیش اپنے ذمے نہیں ڈال سکتے تھے، اس کے لئے اوپر کے حکم کی ضرورت تھی۔ ہم صرف اجازت لے سکتے تھے کہ عبید کے قتل کی تفتیش جو ایس ایچ او کر رہا ہے، اس پر نظر رکھیں۔ سب انسپکٹر فرانسس کا مشورہ تھا کہ شاہدرہ والوں کو تفتیش کرنے دی جائے اور دیکھا جائے کہ وہ کس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ فرانسس یہ بھی کہتا تھا کہ شاہدرہ کے تھانیدار کو ملزم پر تشدّد کرنے دو، امید ہے وہ دونوں قتل تسلیم کرلے گا۔

میں پہلے بھی اپنی کہانیوں میں بتاچکا ہوں کہ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں اُس وقت تفتیش کا مطلب تفتیش ہی ہوتا تھا، تُک مُکا یا ہیرا پھیری نہیں ہوتی تھی اور یہ بھی نہیں دیکھا جاتا تھا کہ ملزم یا مُشتبہ معاشرے میں اونچی حیثیت رکھتا ہے یا اس کا مقام کیا ہے۔ انگریز آفیسر واردات کے بعد علاقہ تھانیدار سے اس کا ملزم مانگتے تھے اور ملزم نہ ملتا تو اس علاقے کے تھانیدار کی بدبختی آجاتی تھی۔ ہم نے جب اپنے ایس پی سے بات کی کہ شاہدرہ والی تازہ واردات میں دخل دیں یا نہ دیں تو اس انگریز ایس پی نے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ تم لوگ قانون اور ضابطے کی لکیروں پر چلتے رہو گے تو ملزم کو کس طرح پکڑو گے؟..... جاؤ اور دیکھو کہ یہی ملزم تمہاری واردات کا ملزم تو نہیں!

شوباز امیرزادہ

ہم اگلے روز صبح شاہدرہ تھانے پہنچے۔ لاش کا پوسٹ مارٹم گذشتہ روز ہی ہوگیا تھا اور لاش وارثوں کے حوالے کر دی گئی تھی۔ اس گھر میں دو افراد قتل ہو گئے تھے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں آیا کہ گولی مقتول کی کنپٹی پر اتنی قریب سے لگی ہے کہ گولی کا دھوَاں زخم کے اردگرد جم گیا تھا۔ دوسری اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ یہ ہندو تھانیدار ملزم کے گھر گیا تھا اور اس نے فائر کی ہوئی گولی برآمد کرلی تھی۔ یہ گولی بھی پوائنٹ 38 ریوالور کی تھی۔ مطلب یہ کہ یہ ریوالور بھی اُسی بور کا تھا جس بور کے ریوالور سے عبید کی ماں کو گولی ماری گئی تھی۔

تھانیدار نے ایک کارروائی فوری طور پر کرلی تھی۔ وہ یہ کہ ملزم جس کا نام محسن علی تھا، ریوالور کے ساتھ تھانے آیا تو تھانیدار نے انگلیوں کے نشان محفوظ کرنے والی کِٹ نکالی اور ریوالور کے دستے اور نالی پر انگلیوں کے جو نشان تھے وہ محفوظ کر کے اُسی وقت ملزم کی انگلیوں کے پرنٹ لئے اور فنگر پرنٹ بیورو کے ہاں بھیج دیئے۔ ہم جب شاہدرہ تھانے میں پہنچے تو اس کے دس پندرہ منٹ بعد انگلیوں کے نشانوں کے ماہرین کی رپورٹ آگئی۔ ریوالور پر ملزم محسن علی کی انگلیوں اور ایک ہتھیلی کے نشانات تھے۔ ہم کوئی اناڑی تو نہیں تھے، ہم جانتے تھے کہ ملزم یہ ریوالور گھر سے یعنی موقعۂ واردات سے اپنے ہاتھ میں لے کر تھانے آیا تھا اس لئے اس کی انگلیوں کے نشانات ریوالور کے دستے پر لازماً ہونے چاہئیں تھے لیکن مقتول کی انگلیوں کا ذرا سا بھی نشان ریوالور پر موجود نہ تھا۔ ماہرین کی رپورٹ کے مطابق ریوالور کے دستے پر تمام نشانات ملزم کے تھے۔

ہم نے ایک کارروائی یہ کی کہ وہ چلی ہوئی گولی یعنی BULLET جو مقتولہ کی کھوپڑی میں سے گزری اور واردات والے کمرے سے برآمد ہوئی تھی، ہمارے قبضے میں تھی۔ ہم نے شاہدرہ والی واردات کی چلی ہوئی گولی بھی لے لی اور یہ دونوں گولیاں اور ریوالور BALLISTIC EXPERT کے پاس بھیج دیا۔ ہمارا اس ایکسپرٹ کے ساتھ تعلق رہتا تھا۔ میں نے اسے فون پر کہا کہ یہ رپورٹ ہمیں فوراً یعنی ارجنٹ چاہئے۔

شاہدرہ والے تھانیدار نے ریوالور کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ اس نے ملزم سے پوچھا تھا کہ اس ریوالور کا اس کے پاس لائسنس ہے یا نہیں۔ ملزم نے کہا تھا کہ اس کے پاس نہ لائسنس والا کوئی ریوالور ہے نہ بلا لائسنس۔

میں نے اور فرانسس نے تھانیدار کا ایک کام اپنے ذمے لے لیا۔ وہ یہ کہ ریوالور کا نمبر لے کر ہم ڈپٹی کمشنر کے آفس کی اسلحہ برانچ چلے گئے اور کہا کہ ریکارڈ دیکھ کر بتائیں کہ یہ ریوالور ریکارڈ پر موجود ہے یا نہیں۔

رجسٹر دیکھا تو یہ نمبر مل گیا۔ یہ لائسنس یافتہ ریوالور تھا اور یہ لائسنس ایک بہت بڑے مسلمان زمیندار کے نام تھا اور اس کا پورا پتہ بھی موجود تھا۔ ہم نے یہ پتہ نوٹ کیا۔ یہ دِلّی کا ہی تھا۔ ہماری یا یوں کہیں کہ اُس وقت کی پولیس کی فرض شناسی دیکھیں کہ ہم ڈپٹی کمشنر کے آفس سے نکل کر اُسی ایڈریس پر پہنچے۔ وہ زمیندار گھر پر ہی مل گیا۔ ادھیڑ عمر آدمی تھا اور خاصا معزز اور قابلِ احترام لگتا تھا۔ ہم نے اپنا تعارف کروایا اور اس سے پوچھا کہ اس کا ریوالور کہاں ہے۔

"گم ہو گیا ہے" — اُس نے بڑے آرام سے جواب دیا — "تین دنوں سے گم ہے"۔

"اگر ریوالور گم ہے تو آپ نے کچھ کیا نہیں؟" — فرانسس نے پوچھا۔

"کیا کیوں نہیں!" — اس نے جواب دیا — "میں نے اپنی بیوی اور بیٹے سے پوچھا تھا۔ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو میں نے اُسی وقت تھانے جا کر رپورٹ درج کروا دی تھی.... آپ کیوں پوچھنے آئے ہیں؟ کیا ریوالور کسی کے قبضے سے برآمد ہُوا ہے؟"

"آپ کے ریوالور سے ایک نوجوان لڑکے کو قتل کر دیا گیا ہے" — میں نے کہا — "اور آپ کا ریوالور برآمد کر لیا گیا ہے"۔

"کون قتل ہُوا ہے؟" — اُس نے چونک کر صوفے پر سیدھا ہوتے ہوئے پوچھا — "کس نے قتل کیا ہے؟"

"لڑکے کا نام عبید تھا" — میں نے کہا — "کچھ دن پہلے بیچارے کی ماں قتل ہو گئی تھی۔ اُسے بھی اسی بور کے ریوالور سے گولی ماری گئی تھی"۔

"ہائیں؟" — اُس نے اپنی رانوں پر دونوں ہاتھ زور سے مارتے ہوئے کہا — "یہ لڑکا تو میرے بیٹے کا دوست تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس لڑکے کی ماں قتل ہو گئی ہے۔ میں اُس کے جنازے میں بھی شامل ہُوا تھا.... لڑکا کس طرح قتل ہوا ہے؟"

ہم نے اُسے بتایا کہ عبید کس طرح قتل ہُوا ہے اور یہ بھی بتایا کہ ملزم کہتا ہے کہ لڑکے نے خودکشی کی ہے۔

"اس پر بھی غور کریں" — اس زمیندار نے کہا — "لڑکے نے اپنے سگے باپ کے گھر جا کر اس کے سامنے کیوں خودکشی کی؟ یہ بھی دیکھیں کہ اس نے الگ کمرے میں اپنے آپ کو گولی ماری تھی یا باپ کے سامنے!"

"اس کے باپ نے ابھی تک صحیح بیان نہیں دیا" — میں نے کہا۔

"میری ایک بات پر بھی غور کریں" — زمیندار نے کہا — "میرا ایک ہی ایک بیٹا ہے جو اس وقت کالج گیا ہُوا ہے۔ عبید کی میرے بیٹے کے ساتھ بڑی گہری دوستی تھی۔ اسے عبید اپنے دل کی باتیں سناتا رہتا تھا۔ میرا بیٹا یہ باتیں کبھی کبھی مجھے اور اپنی ماں کو بھی سنایا کرتا تھا۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ عبید زندگی سے تنگ آیا ہُوا تھا۔ وہ میرے بیٹے کا کلاس فیلو بھی تھا۔ وہ کئی بار یہاں آیا تھا اور دو تین بار میں نے اسے بٹھا کر بڑے پیار سے سمجھایا تھا کہ وہ اسی عمر میں اپنے آپ کو روگ نہ لگا لے کیونکہ اس کے سامنے بڑی لمبی عمر پڑی ہے اور وہ اپنے مستقبل کی فکر کرے لیکن یہ میں نے بھی دیکھا کہ لڑکا مغموم سا رہتا تھا۔ میں یہ بات آپ کو اس لئے بتا رہا ہوں کہ ہو سکتا ہے لڑکے نے خودکشی ہی کی ہو"۔

"کیوں نہ ہم یہ باتیں آپ کے بیٹے سے پوچھیں!" — فرانسس نے کہا — "آپ کا بیٹا کس وقت گھر آئے گا؟"

"ایک گھنٹے تک آ جائے گا" — زمیندار نے جواب دیا۔

"لیکن جناب!" — میں نے پوچھا — "آپ کا ریوالوار وہاں تک کس طرح پہنچ گیا؟.... کیا ریوالور گھر سے گم ہُوا ہے یا آپ کہیں باہر لے گئے تھے اور وہاں بھول آئے؟"

"میں آپ سے ایک درخواست کروں گا" — اس نے کہا — "میری حیثیت اور

پوزیشن کا خیال رکھیں' میں آپ کے آگے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میرا بیٹا اکلوتا ہے۔ قدرتی طور پر ہم نے اسے ضرورت سے زیادہ پیار دیا ہے۔ میں انے تو اسے کچھ زیادہ ہی بگاڑ دیا ہے۔ یہ میری غلطی اور میرا جرم ہی سہی لیکن سچ یہ ہے کہ میرا بیٹا کبھی کبھی ریوالور اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ وہ صرف شوبازی اور نمائش کے لئے ایسا کرتا تھا' اس نے کبھی گولی فائر نہیں کی۔ میں نے کئی بار اس کی ماں سے کہا ہے کہ اسے ریوالور دے دیا کرو' گولیاں نہ دیا کرو لیکن میری غیر حاضری میں ماں بیٹے کی یہ فرمائش بھی پوری کر دیتی ہے کہ بیٹا ریوالور مانگ رہا ہے۔ ماں کو یہ اچھا لگتا ہے کہ بیٹے کے پاس ریوالور ہے۔ کئی دن پہلے بھی وہ ریوالور لے گیا تھا اور اب میں نے دیکھا تو ریوالور غائب تھا۔ میں تسلّی میں رہا کہ بیٹا لے گیا ہو گا لیکن اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ نہیں لے گیا۔ مجھے اپنے بیٹے سے یہ توقع نہیں کہ وہ جھوٹ بولے گا کیونکہ ہم اس کی ہر ضِد اور ہر فرمائش پوری کرتے ہیں۔ میں نے فوراً تھانے جا کر ریوالور کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوا دی.... اب آپ نے بتایا ہے کہ میرے ریوالور سے ایک انسان کی جان ضائع ہو گئی ہے تو اس جرم میں مجھے بھی شامل کیا جائے گا کہ میں نے ایسی بے احتیاطی سے ریوالور رکھا ہُوا تھا کہ کوئی شخص اتار کر لے گیا اور اپنا ارادہ پورا کر لیا۔ میں نے آپ سے سچ بولا ہے اس لئے آپ سے یہ درخواست کروں گا کہ مجھے اس ذلّت سے بچا لیں"۔

اس حیثیت کے زمیندار عموماً بڑے رعب سے رہتے اور رعب سے ہی بات کرتے ہیں۔ یہ شروع سے ہوتا آیا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان لوگوں نے اپنا اثر و رسوخ بھی بنا رکھا ہوتا ہے۔ اس درجے کے زمیندار اپنے آپ کو نواب اور مہاراجے سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں لیکن میں نے اس شخص میں شائستگی اور وقار سا دیکھا اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ اپنی کلاس کے دوسرے زمینداروں اور جاگیرداروں کی طرح خوشامدی نہیں تھا۔ پولیس کے افسروں کے آگے تو یہ لوگ رکوع کی پوزیشن میں چلے جایا کرتے تھے۔ میں نے فرانسس کی طرف دیکھا تو فرانسس نے مجھے سر کا ہلکا سا اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس شخص کی عزت کا خیال رکھا جائے۔ میں نے اسے تسلّی دی کہ ہم پوری کوشش کریں گے کہ اسے یا اس کے بیٹے کو اس جرم میں شریک نہ کریں۔

اُس نے بڑی ہی پُر تکلّف چائے سے ہماری تواضع کی۔ ہم چائے پی رہے تھے کہ اُس کا بیٹا آ گیا۔ باپ نے اسے بلا کر ہم سے ملوایا۔ وہ بھی عبید کی طرح خوبصورت لڑکا تھا۔ ہم نے اس کے باپ سے کہا کہ یہ کھانا کھا لے پھر ہم اسے الگ بٹھا کر پوچھیں گے۔ لڑکا کھانا کھا کر آ گیا تو میں نے اس کے باپ سے کہا کہ وہ اسے ہمارے پاس اکیلا بیٹھنے دے۔ باپ اٹھ کھڑا ہُوا۔

"شرفی بیٹا!" — باپ نے بیٹے سے کہا — "یہ جو کچھ بھی پوچھیں' بالکل سچ سچ بتانا۔ تم سچ نہیں بولو گے تو بھی انہیں کہیں نہ کہیں سے سچی بات معلوم ہو جائے گی پھر یہ تمہارا جرم ہو گا کہ تم نے پولیس کو جھوٹ بول کر گمراہ کرنے کی کوشش کی.... بات کتنی ہی خطرناک کیوں نہ ہو' سچ بولنا۔ تم پر کوئی الزام آیا تو وہ میں ان صاحبان سے معاف کرا لوں گا"۔

باپ اپنے بیٹے کو یہ ہدایت دے کر کمرے سے نکل گیا۔ لڑکے کا نام مشرف تھا اور اسے شرفی کہتے تھے۔

"اپنے ابّا جان کا ریوالور کہاں پھینک آئے تھے؟" — میں نے اُس سے پوچھا۔

"میں؟" — اُس نے حیران سا ہو کے کہا — "میں کہاں لے گیا تھا؟"

ہم نے اسے کہا کہ اس کا باپ ہمیں بتا چکا ہے کہ وہ ریوالور نکال کر لے جاتا ہے اور شوبازی کرتا ہے۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ سچ بولے۔

"ابّا جان نے آپ کو ٹھیک بتایا ہے" — شرفی نے کہا — "میں کبھی کبھی ریوالور اپنے ساتھ لے جاتا تھا لیکن اب میں نہیں لے گیا تھا۔ معلوم نہیں کون لے گیا ہے"۔

ہم نے ابھی ایک سوال ریزرو رکھا ہُوا تھا۔ وہ یہ تھا کہ زمیندار کا کوئی ایسا نوکر ہو گا جو ریوالور چوری کر کے لے گیا ہو۔ پہلے ہم اس لڑکے سے پوچھنا بہتر سمجھتے تھے۔ ایک یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ اس لڑکے کے باپ نے ہمارے دلوں میں ایک شک پیدا کر دیا تھا۔ وہ اس طرح کہ اس نے کہا تھا کہ عبید بہت ہی مغموم رہتا اور کبھی رو بھی پڑتا تھا۔ یہ شک ذہن میں رکھ کر ہم نے سوچا کہ پہلے شرفی سے یہ پوچھا جائے کہ عبید کی ذہنی اور جذباتی حالت کیا تھی۔

"چلو' ریوالور کی بات چھوڑو" — میں نے کہا — "عبید تمہارا بڑا ہی گہرا دوست

تھا۔ وہ قتل ہو گیا ہے یا اُس نے خود کشی کر لی ہے"۔

"میں نے آج صبح یہ خبر اخبار میں پڑھی ہے"— شرفی نے کہا— "وہ تو میرا اتنا گہرا دوست تھا کہ میرے ساتھ دل کی ہر بات کرتا تھا"۔

"ہمیں اس کی ہر بات بتاؤ"— میں نے کہا— "ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اُس نے خود کشی کی ہے یا اسے باپ نے قتل کیا ہے"۔

شرفی نے ہمیں عبید کی باتیں سنانی شروع کر دیں۔ یہ میں اختصار سے اپنی زبان سے سناؤں گا۔

ریوالور کس نے دیا؟

عبید اور شرفی پہلی بار کالج میں ملے تھے جب وہ فرسٹ ایئر میں داخل ہوئے تھے۔ چند دنوں میں ہی ان کی دوستی پکّی ہو گئی۔ اب دونوں سیکنڈ ایئر میں تھے۔ عبید شرفی کو بتایا کرتا تھا کہ وہ بہت ہی بے چین اور بے آرام رہتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ اس کی ماں اور باپ نے اس کی زندگی میں سے خوشیاں نکال لی ہیں۔ وہ تین سال کا تھا جب اس کی ماں گھر آ بیٹھی اور اسے باپ سے الگ کر دیا گیا۔ باپ اسے مہینے میں ایک بار تھوڑی سی دیر کے لئے ملا کرتا تھا۔ باپ اس کے لئے کھلونے اور تحفے لاتا تھا۔ عبید کو اپنے سگے باپ کے ساتھ بہت ہی پیار تھا۔

وہ جب سکول میں داخل ہُوا تو اس کا شعور بیدار ہو چکا تھا۔ وہ اب اچھے بُرے کو پہچانتا تھا اور اس کے احساسات پوری طرح بیدار ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی وہ ماں کو بتائے بغیر اپنے باپ کے پاس چلا جاتا تھا۔ یہ اس وقت ہوتا تھا جب اُس کی ماں شاہدرہ گئی ہوئی ہوتی تھی۔ اس وقت اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اس کا سوتیلا باپ کوئی بُرا آدمی نہیں تھا لیکن اس کے اپنے سگے باپ کی طرح اچھا بھی نہیں تھا۔ یہ باپ اس کے ساتھ اس طرح پیار نہیں کرتا تھا جس طرح اس کا سگا باپ کیا کرتا تھا۔

پھر اس کا پہلا سوتیلا بھائی پیدا ہُوا تو عبید نے دیکھا کہ سوتیلا باپ اپنے بچّے کے ساتھ بہت ہی پیار کرتا تھا اور اس کے دل سے عبید کا پیار نکلتا جا رہا تھا۔ عبید اپنے سگے

باپ سے ملتا تو اسے وہ پیار ملتا تھا جو اس کا فطری مطالبہ تھا۔ اس طرح اس کے دل میں اپنے سوتیلے باپ کے لئے نفرت سی پیدا ہونے لگی۔ کچھ عرصہ اور گزرا تو عبید اور سوتیلے باپ کے درمیان فاصلے بڑھنے لگے اور پھر جب عبید ساتویں آٹھویں جماعت میں پہنچا تو سوتیلے باپ کے ساتھ اس کی بول چال تقریباً بند ہو گئی تھی۔ وہ آپس میں کوئی مطلب کی بات ہی کرتے تھے۔ عبید کو غصہ اس وقت آتا تھا جب اُس کی ماں ڈانٹ کر کہتی تھی کہ وہ اپنے باپ کا احترام کیا کرے اور اس کا ہر کام کر دیا کرے۔ ایک کام تو جوتے پالش کرنا تھا جس سے عبید نے صاف انکار کر دیا تھا۔

عبید کو غصہ اُس وقت آتا تھا جب وہ اپنی ماں کو سوتیلے باپ کے ساتھ تنہائی میں دیکھتا تھا۔ یہ اُس نے کئی بار دیکھا۔ اس کی ماں اور سوتیلا باپ احتیاط نہیں کرتے تھے۔ عبید اپنے سوتیلے باپ کو اپنی ماں کے لئے غیر مرد سمجھتا تھا۔ اس کے اندر تلخیاں بڑھتی جا رہی تھیں، زندگی سے وہ مایوس ہوتا جا رہا تھا اور وہ یوں سمجھنے لگا تھا جیسے اسے اپنے گھر سے نکال دیا گیا ہو اور وہ غیروں اور بیگانوں میں رہ رہا ہو۔

اسے اپنی ماں کے ساتھ بہت ہی زیادہ محبت تھی۔ اسے پیار ماں سے ملتا تھا یا تھوڑی سی دیر کے لئے اپنے سگے باپ محسن علی سے ملتا تھا جب وہ اس کے پاس جایا کرتا تھا۔ جس روز وہ باپ سے مل کر آتا اُس روز تو وہ اس قدر پریشان ہوتا کہ شرفی کے ساتھ باتیں کرتا وہ رو بھی پڑتا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ اس کا باپ مرجاتا تو وہ کوئی گِلہ شکوہ نہ کرتا کیونکہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن اسے یہ صورتِ حال پاگل کئے جا رہی تھی کہ اس کا باپ زندہ تھا اور وہ اس کے پاس نہیں رہ سکتا تھا۔ باپ کے پیار کی محرومی تو وہ محسوس کرتا ہی تھا لیکن یہاں یہ صورتِ حال تھی کہ وہ باپ کی موجودگی میں باپ کے وجود کی محرومی محسوس کر رہا تھا۔

وہ غصیلا ہونے لگا اور اس کے مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہو گیا۔ وہ ذہین طالب علموں میں سے تھا اور بڑے اچھے نمبر لے کر پاس ہوتا تھا لیکن نویں جماعت میں آکر اس کا معیار اتنا گر گیا اور گرتا ہی چلا گیا کہ ماسٹر بھی اسے مارنے پیٹنے لگے اور اس کا شمار نالائق طالب علموں میں ہونے لگا۔ ایک بار میٹرک میں فیل بھی ہو گیا۔ اس طرح اس کی تلخیوں میں اضافہ ہو گیا اور اس کی مزاجی حالت یہ ہو گئی کہ کسی کی ذرا سی بات بھی

برداشت نہیں کرتا تھا۔ پھر اس کی تباہی میں یوں اضافہ ہُوا کہ وہ وہمی ہوگیا۔ خود ہی ایک وہم پیدا کرکے اپنے آپ میں غصہ' بیزاری' مایوسی اور شکست خوردگی پیدا کرلیتا تھا۔ اس کی ہر سوچ منفی ہوگئی تھی۔ کبھی کبھی وہ خودکُشی کی باتیں بھی کرتا تھا اور کبھی یوں کہتا کہ میں ایک دو بندوں کو ختم کرکے اپنے آپ کو ختم کرلوں گا۔

یہ بالکل وہی کیس تھا اور جو ہمارے معاشرے کی بہت بڑی خرابی ہے جس پر میم الف صاحب مضامین لکھ چکے ہیں اور لکھتے رہتے ہیں۔ جن گھروں میں اولاد والے ماں باپ سکون پیدا نہیں کرتے اور آپس میں لڑتے رہتے ہیں' ان کی اولاد کی ذہنی حالت یہی ہو جاتی ہے۔ ہماری چار دیواری کی دنیا میں ایک بیماری اور ہے۔ میں اسی بیماری کی کہانی سنا رہا ہوں۔ میاں بیوی میں ناچاقی ہوتی ہے اور نوبت طلاق تک پہنچتی ہے تو کچھ عرصہ بعد بیوی کو دوسرا خاوند اور خاوند کو دوسری بیوی مل جاتی ہے لیکن یہ بہت کم دیکھا جاتا ہے کہ اس کی سزا بچّوں کو ملتی ہے۔ وہ اندر سے کٹ پھٹ جاتے ہیں اور ایسے بچّے بڑے ہو کر جرائم پیشہ بنتے ہیں یا ان میں مجرمانہ رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ جھوٹ بولتے ہیں اور فریب کاری کے عادی ہو جاتے ہیں یا وہ ایسے ذہنی مریض بن جاتے ہیں کہ بیکاری کی زندگی گذارتے اس دنیا سے اٹھ جاتے ہیں۔

میں نے یہ تفتیشی کہانی ان الفاظ سے شروع کی ہے کہ کہانی تو پرانی ہے لیکن مسئلہ جو میں پیش کر رہا ہوں وہ پرانا نہیں بلکہ ہمارے معاشرے میں ہر روز اسے نیا بنایا جا رہا ہے۔ اب دیکھئے کہ یہ مسئلہ ایک ذہین نوجوان کو کہاں تک پہنچاتا ہے اور گھر کس طرح اُجڑتے ہیں۔

عبید کا دوست شرفی ہمیں بیان دے رہا تھا جو میں بہت ہی مختصر کرکے لکھ رہا ہوں۔ اصل بیان بہت ہی لمبا ہے اور اس کے دوران ہم دونوں پولیس آفیسر اس سے کچھ نہ کچھ پوچھتے جا رہے تھے۔ ہم دونوں اس فیصلے پر پہنچے کہ عبید کا باپ محسن علی شاید ٹھیک ہی کہتا ہے کہ عبید نے خودکُشی کی ہے۔ یہ خودکُشی کا ہی کیس تھا لیکن اس کی تفتیش ضروری تھی اور باریک باریک باتوں کو بھی دیکھنا بہت ضروری تھا۔ شرفی نے بتایا کہ ایک تو عبید کی یہ ذہنی حالت تھی جس نے اسے جینے سے بیزار کر دیا تھا' اس کے ساتھ اس نے محبت کا روگ بھی لگا لیا تھا۔ وہ لڑکی عبید کے سوتیلے باپ کی بھانجی تھی۔

شرفی نے بتایا کہ وہ بہت ہی خوبصورت اور بڑے اچھے کردار کی لڑکی ہے۔ عبید اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا لیکن سوتیلے باپ نے اسے بُری طرح ڈانٹ کر کہہ دیا کہ وہ اس لڑکی کا خیال ذہن سے نکال دے۔ لڑکی اُس وقت دسویں جماعت میں پڑھتی تھی اور عبید سے باہر ملتی تھی۔ کبھی کبھی عبید کالج سے اور لڑکی سکول سے جلدی نکل آتے اور دونوں تین چار گھنٹے کہیں دُور جا بیٹھتے اور باتیں کرتے رہتے تھے۔ سوتیلے باپ نے عبید کے لئے یہ محبت ایک مہلک روگ بنا دیا تھا۔ ان کی شادی ہو سکتی تھی لیکن عبید کہتا تھا کہ اس کے سوتیلے باپ نے اسے ذلیل کرنے کے لئے یہ رشتہ نہیں ہونے دیا۔

پھر یوں ہُوا کہ عبید کالج میں آگیا تو اس نے ماں سے پوچھنا شروع کر دیا کہ اس کی اپنی پہلے خاوند کے ساتھ کیوں نہیں بنی؟ ماں پہلے خاوند کے خلاف باتیں کرتی اور اس کے نقائص بیان کرتی تھی۔ عبید اپنے باپ سے بھی پوچھتا تھا کہ اس نے اس کی ماں کو کیوں طلاق دی تھی۔ باپ باوقار قسم کی باتیں کرتا اور کہتا تھا کہ تمہاری ماں اسلامی احکام کی پابندی نہیں کرتی تھی اور ضرورت سے زیادہ آزاد خیال تھی.... اس طرح اس کے کانوں میں ایسی باتیں پڑتی تھیں کہ باپ اس کی ماں کے خلاف اور ماں اس کے باپ کے خلاف بولتی تھی۔

شرفی نے یہ تو بتا دیا کہ جب عبید کی ماں قتل ہوئی اس سے کچھ دن پہلے عبید کی ذہنی حالت بہت ہی بگڑی ہوئی تھی۔ ماں کے قتل کے بعد تو وہ بالکل خاموش ہوگیا تھا۔ شرفی اس کے پاس آتا تو بھی عبید کچھ نہیں بولتا تھا اور اپنے ہاتھوں کی انگلیاں الجھا کر موڑتا توڑتا رہتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اچانک اٹھ کھڑا ہوتا اور چل کر دروازے میں جاتا' رکتا اور پھر واپس آجاتا تھا۔

"تم اسے آخری بار کب ملے تھے؟" —— میں نے پوچھا۔

"وہ تو پرسوں بھی مجھے ملا تھا" —— شرفی نے جواب دیا۔

"کیا اس کی حالت یہی تھی یا اور زیادہ بگڑ گئی تھی؟" —— میں نے پوچھا۔

"حالت ویسی ہی تھی" —— شرفی نے جواب دیا —— "لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ کوئی خطرناک اقدام کرے گا"۔

"اب یہ بتاؤ شرفی!" —— میں نے پوچھا —— "تمہارا ریوالور اُس تک یا اُس کے باپ تک کیسے پہنچا؟"

"میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا" — اُس نے کہا — "مجھے کچھ معلوم نہیں کہ ریوالور ہمارے گھر سے کس طرح نکلا ہے"۔

"کیا تمہارے گھر میں کوئی ایسا نوکر ہے جس نے ریوالور چوری کیا ہو؟" — میں نے پوچھا۔

"ہمارے گھر میں کبھی چوری نہیں ہوئی" — شرفی نے جواب دیا — "کوئی نوکر یا مزارعہ اتنی جرأت نہیں کر سکتا کہ گھر میں چوری کرے۔ سب جانتے ہیں کہ گھر میں کسی نے ایسی حرکت کی تو میرے ابّا جان اسے جان سے مار ڈالیں گے یا ایسی سزا دیں گے کہ سننے والے کانپنے لگیں گے"۔

میرا یہ شک پکّا تھا کہ عبید کو ریوالور شرفی نے ہی دیا تھا۔ شرفی مان ہی نہیں رہا تھا۔ ہم نے شرفی کو تھوڑی دیر کے لئے باہر بھیج دیا اور آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ فرانس کا بھی یہی خیال تھا کہ شرفی کی عبید کے ساتھ گہری دوستی تھی اور شرفی اکثر ریوالور اپنے ساتھ لے جایا بھی کرتا تھا اس لئے یہ بعید از قیاس نہیں کہ عبید کو ریوالور شرفی نے دیا تھا۔ ہم نے سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ شرفی کو یہی تاثر دیا جائے گا کہ ہم نے مان لیا ہے کہ اس نے عبید کو ریوالور نہیں دیا تھا۔ شرفی کی باتوں سے یعنی اس کے بیان سے ہم نے یہ تاثر لیا تھا کہ عبید اپنے سوتیلے باپ کی بھانجی کے ساتھ اور بھی زیادہ چھوٹی چھوٹی باتیں کیا کرتا تھا۔ ہم نے یہ دیکھنا تھا کہ عبید کے پاس ایسی وجوہات تھیں جو خودکشی پر مجبور کر دیا کرتی ہیں۔ ہم نے اس لڑکی سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ شرفی کے باپ کو بلایا اور اسے کہا کہ اپنے بیٹے کو تیار کرے کہ سچ بولے اور بتا دے کہ عبید کو ریوالور اس نے دیا تھا۔ یہ کہہ کر ہم وہاں سے آ گئے۔

محبت ہار گئی، نفرت جیت گئی

ہم وہاں سے بیلسٹک ایکسپرٹ کے آفس میں چلے گئے۔ وہاں تھانے والوں کے کام کبھی نہیں رکا کرتے تھے لیکن سی آئی اے کے کام ایمرجنسی کے طور پر کئے جاتے تھے۔ وہاں رپورٹ تیار تھی جس کے مطابق دونوں گولیاں اسی ایک ریوالور سے فائر کی

گئی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ماں کو بھی اور بیٹے کو بھی اسی ریوالور کی گولیوں سے مارا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ میرے بعض پڑھنے والے حیران ہوں کہ یہ کیسے پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ یہ گولیاں فلاں ریوالور سے نکلی ہیں۔ اس کی تشریح ذرا لمبی اور ٹیکنیکل ہے، میں یہ بتا دیتا ہوں کہ ریوالور، رائفل اور مشین گن کی نالیوں کے اندر لمبی جھریاں بنی ہوئی ہوتی ہیں جنہیں GROOVE کہا جاتا ہے۔ اسے SPIRAL GROOVE کہا جائے تو زیادہ صحیح ہے۔ یہ جھریاں چیمبر سے دھانے تک گئی ہوئی ہوتی ہیں۔ گولی فائر ہوتی ہے تو ان جھریوں کی وجہ سے گھومتی ہوئی نکلتی ہے۔ ان جھریوں کے نشان گولی پر بھی آ جاتے ہیں، یعنی گولی کا وہ حصہ جو نالی سے نکل کر ٹارگیٹ پر لگتا ہے۔ اس سے ایکسپرٹ صحیح نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ یہ گولی اس ریوالور یا رائفل سے نکلی ہے یا کسی اور ریوالور یا رائفل سے۔ ان جھریوں کو ٹیکنیکل زبان میں RIFLING کہتے ہیں۔ کچھ اور چیزیں بھی دیکھی جاتی ہیں، بہرحال یہ ایکسپرٹ بالکل صحیح اور قابل اعتماد رپورٹ دیتے ہیں۔

یہ رپورٹ، ریوالور اور گولیاں وصول کر کے ہم مقتولہ کے گھر چلے گئے۔ مقتولہ کا خاوند گھر ہی تھا۔ عبید کی لاش اس کے نانا نے وصول کی تھی اس لئے مقتولہ کے گھر میں کوئی ماتم نہیں تھا۔ مقتولہ کے خاوند نے عبید کے قتل پر افسوس کا اظہار کیا اور پھر پوچھا کہ اس کی بیوی کے قتل کا سراغ ملا ہے کہ نہیں؟

"مل جائے گا" — میں نے کہا — "آپ ایک کام کریں۔ اپنی اُس بھانجی کو یہاں لے آئیں جسے عبید چاہتا تھا"۔

مقتولہ کے خاوند کے چہرے کا رنگ نمایاں طور پر پھیکا پڑ گیا اور وہ دو چار سیکنڈ میرے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے اسے پھر کہا کہ وہ اس لڑکی کو لے آئے۔ وہ پس و پیش کرنے لگا اور دبی سی زبان میں ایک بار یہ بھی کہا کہ وہ سمجھا نہیں کہ ہم کون سی لڑکی کی بات کر رہے ہیں۔ سب انسپکٹر فرانس نے اسے صاف الفاظ میں بتایا کہ وہ لڑکی تمہاری بھانجی ہے اور عبید کی اس کے ساتھ محبت کا صاف لفظوں میں ذکر کیا۔

"اپنی عزت کا خیال کریں محترم!" — میں نے کہا — "اگر آپ ہمیں اس طرح ٹالنے کی کوشش کریں گے تو ہم اس لڑکی کو اپنے ہیڈ کوارٹر میں بلا کر تفتیشی کمرے میں

تفتیش کریں گے.... جائیں اور اسے یہاں لے آئیں"۔

"آپ کوئی فکر نہ کریں" — فرانسس نے کہا — "آپ گھر میں موجود ہوں گے اور لڑکی کی ماں یا اس کے باپ کو بھی ساتھ لے آئیں۔ آپ سب باہر بیٹھے رہنا اور ہم لڑکی سے کچھ باتیں پوچھ لیں گے"۔

وہ سر جھکا کر آہستہ آہستہ چل پڑا۔ ہم حویلی کی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔

کچھ دیر بعد ایک نوجوان اور معصوم سی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ مقتولہ کا خاوند اور اس کا باپ تھا۔ میں نے انہیں تسلّی دلاسہ دے کر باہر بھیج دیا اور کمرے کا دروازہ کھلا رہنے دیا۔

لڑکی کا سر جھکا ہُوا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ بات شروع کی تو اُس نے سر اور زیادہ جھکا لیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ لڑکی مشکل سے ہی بولے گی۔ میں اور فرانسس اسے کوئی دھمکی نہیں دینا چاہتے تھے نہ ہم یہ اچھا سمجھتے تھے کہ اسے ڈانٹا جھڑکا جائے۔ ہم نے اس کے ساتھ پیار اور شفقت سے باتیں کیں اور دیکھا کہ اب بھی وہ نہیں بول رہی تو میں نے جذباتی باتیں شروع کر دیں۔ میں اس کا ایک نمونہ پیش کرتا ہوں۔

"دیکھو فرانسس!" — میں نے لڑکی پر جذباتی اثر ڈالنے کے لئے فرانسس سے کہا — "کتنی معصوم لڑکی ہے اور ان ظالموں نے اس کے جذبات کا خون کر دیا ہے"۔

"میں جانتا ہوں" — فرانسس نے کہا — "عبید بیچارے کو اسی لئے قتل کیا گیا ہے کہ اس کے دل میں اس بچّی کا پیار تھا۔ پہلے اس کی ماں کو قتل کیا اور اب اس بیچارے کا خون کر دیا"۔

اس طرح میں اور فرانسس آپس میں اسی طرح کی جذباتی باتیں کرتے رہے اور قاتلوں کو بُرا بھلا کہتے رہے۔ پھر میں نے عبید کی تعریفیں شروع کر دیں۔ اس کی مردانہ وجاہت کا اور پھر اس کی عادات اور اخلاق کا اس طرح ذکر کیا جیسے اُس جیسا اس دنیا میں کوئی تھا ہی نہیں۔

ہماری ان باتوں کا لڑکی پر یہ اثر ہُوا کہ اُس نے اچانک رونا شروع کر دیا۔ وہ سسکیاں لینے لگی۔ میں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ اور ہی زیادہ بلکنے لگی۔ میں اور فرانسس آپس میں اسی طرح جذباتی باتیں کرتے رہے۔ لڑکی نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔

"میرے عبید کو کس نے قتل کر دیا ہے؟" — لڑکی نے سسکتے ہوئے پوچھا۔

"تم کچھ اشارہ دو گی تو ہم قاتل کو پکڑ کر پھانسی دلا دیں گے" — میں نے کہا۔

یہ تو بڑی لمبی بات ہے کہ ہم نے اس لڑکی کی زبان کس طرح رواں کی، کیا کچھ پوچھا اور کس طرح پوچھا، میں صرف یہ سناتا ہوں کہ اس سے ہمیں راز کی کیا بات معلوم ہوئی۔ اس نے تسلیم کیا بلکہ جذباتی لہجے میں ہمیں بتایا کہ عبید کو وہ دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ سمجھ نہیں سکی کہ ماموں کیوں اسے عبید سے ملنے سے روکتا تھا۔

لڑکی نے عبید کے متعلق بالکل ویسی ہی باتیں سنائیں جیسی شرفی نے سنائی تھیں۔ اس لڑکی کے پاس بیٹھ کر بھی عبید رو پڑتا تھا۔ لڑکی نے بتایا کہ عبید اپنے سگے باپ محسن علی کو بہت پسند کرتا تھا لیکن پندرہ بیس روز پہلے کی بات ہے کہ اس نے اپنی ماں اور باپ محسن علی کے خلاف باتیں شروع کر دی تھیں اور کہتا تھا کہ وہ چاہتا ہے کہ ان دونوں کو دنیا کے تختے سے اٹھا دے کیونکہ ان دونوں نے اس کی زندگی جہنّم بنا دی ہے۔ لڑکی اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی تھی لیکن عبید کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ لڑکی نے اسے یہاں تک کہا کہ چلو کہیں بھاگ چلتے ہیں اور وہاں جا کر شادی کر لیں گے۔ عبید کو یہ بات اچھی لگی تھی لیکن دو ہی دن بعد وہ پھر بھڑکا ہُوا اس لڑکی سے ملا۔ اس نے اب قتل اور خودکُشی کی باتیں شروع کر دی تھیں۔

لڑکی نے بتایا کہ ماں کے قتل سے دو روز پہلے عبید نے اسے بتایا تھا کہ اس کا دوست شرفی اسے ریوالور دے گا۔ میں بہت تڑپی، عبید کے آگے ہاتھ جوڑے اور اس کے پاؤں پکڑے اور کہا کہ میری محبت کی خاطر تم برداشت کرو اور ان لوگوں کو بھول جاؤ، آؤ کہیں دُور چلے چلتے ہیں لیکن عبید کی ذہنی حالت بہت ہی بگڑ گئی تھی اور شاید اس کے اپنے قابو سے نکل گئی تھی۔ لڑکی نے یہ بھی کہا کہ وہ عبید کے دوست شرفی سے مل نہیں سکتی تھی۔ اگر ملتی تو اسے کہتی کہ عبید کے ہاتھ میں ریوالور نہ دینا۔ لڑکی بہت پریشان رہی اور سوچتی رہی کہ عبید پر کس طرح قابو پائے لیکن ایک روز عبید کی ماں قتل ہو گئی۔

اس کے ایک روز بعد لڑکی عبید سے ملی۔ اب تو عبید کی حالت اور ہی بُری ہو گئی

تھی۔ لڑکی نے اس سے پوچھا کہ ماں کو اس نے خود ہی قتل کیا ہے؟ عبید نے انکار نہ کیا اور اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی جس کا مطلب اقرار ہی ہو سکتا تھا۔ لڑکی بہت ہی پریشان ہو گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اپنی ماں کو عبید نے ہی قتل کیا ہے۔ اس کے بعد وہ دو مرتبہ عبید سے ملی اور اس پر زور دیا کہ یہاں سے بھاگ چلتے ہیں' کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ پکڑا جائے۔ عبید نے دونوں بار اسے یہ جواب دیا — "ابھی ایک کام اور کرنا ہے' یہ کر کے یہاں سے نکل چلیں گے"۔

آیت الکرسی اور خون

لڑکی اس کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ لڑکی نے جو بیان دیا تھا' اسے سامنے رکھ کر ہم نے اس پر بہت جرح کی اور بہت کریدا۔ وہ سوچ سوچ کر جواب دیتی رہی۔ اس سے جو مطلب ہم سمجھ سکے' وہ یہ تھا کہ عبید باپ کو بھی قتل کرنا چاہتا تھا۔ شرفی اور اس لڑکی کو اُس نے کہا تھا کہ اس کی ماں اور اس کے باپ نے اس کی زندگی جہنّم بنا دی ہے۔ وہ ذہنی مریض بنا گیا اور پاگل پن کے اُس مقام پر پہنچ گیا کہ اس نے اپنی ماں کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد یہ قدرتی بات تھی کہ وہ اپنے باپ کو بھی قتل کر دے۔ اس واردات کا جواز تھا' اس کے مطابق اس کا باپ محسن علی بھی مجرم تھا لیکن قتل تو وہ خود ہو گیا تھا.... ہم نے یہ معمہ حل کرنا تھا۔

ہم شاہدرہ تھانے چلے گئے۔ ملزم محسن علی کا بیان لینا تھا۔ ہم نے شرفی اور اس لڑکی کے بیان کے بعد محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ محسن علی بہت حد تک سچّا ہو سکتا ہے۔ شاہدرہ تھانے میں ہم نے ایس ایچ او سے کہا کہ وہ محسن علی کو ہمارے سامنے لے آئے۔ ایس ایچ او نے کہا کہ وہ ابھی بولنے کے قابل نہیں۔

ہم نے حوالات میں جا کر اسے دیکھا تو وہ بے ہوش پڑا تھا یا بڑی گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ اُسے اس قدر ٹارچر کیا گیا تھا کہ اسے بولنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے اور فرانسس نے اس ہندو تھانیدار کو برا بھلا کہا اور یہ بھی کہا کہ ہم اس کے خلاف رپورٹ کر کے کارروائی بھی کرا سکتے ہیں۔ یہ ایس ایچ او مشہور ظالم اور وحشی تھا۔ ہم نے محسن

علی کو اٹھوایا اور کانسٹیبلوں کے کمرے میں ایک چارپائی پر ڈال دیا۔ ایس ایچ او سے کہا کہ اسے دودھ پلاؤ اور اچھی غذا دو اور اسے یہ تاثر دو کہ وہ تمہارا ملزم نہیں اور ہم کل صبح آئیں گے۔ ہم اگلی صبح پھر شاہدرہ تھانے گئے تو محسن علی کو بہتر حالت میں دیکھا۔ وہ بات کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ میں نے اور فرانسس نے جب اس کے ساتھ ہمدردی کی باتیں کیں تو وہ بے اختیار رو پڑا۔ ہم نے اسے اور زیادہ تسلّی تشفّی دی اور کہا کہ وہ صحیح بات بتائے اور اس کی صحیح بات سننے کے لئے ہم دونوں آئے ہیں۔ وہ عادی مجرم تو تھا نہیں کہ پولیس کی مار سہہ جاتا۔ وہ معزز اور تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ اس کے لئے یہی ٹارچر بہت تھا کہ اسے تھانے میں ملزم کی حیثیت سے بلایا گیا تھا۔

میں نے اسے کہا کہ وہ بتائے کہ یہ کیا ہُوا تھا۔

"مجھے یہاں کے تھانیدار صاحب نے بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا" — محسن علی نے کمزور سی آواز میں کہا — "انہوں نے کہا کہ مان جاؤ کہ تم قاتل ہو۔ میں انہیں اصل واقعہ سنانا چاہتا تھا لیکن یہ مجھ سے صرف یہ کہلوانا چاہتے تھے کہ اپنے بیٹے کو میں نے قتل کیا ہے۔ میں ایسا نہیں کہہ رہا تھا اس لئے انہوں نے میرا جو حال کر دیا وہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ واقعہ یوں ہُوا تھا صاحب! میں اپنی بیٹھک میں بیٹھا ہُوا تھا جس کا ایک دروازہ گلی میں کھلتا ہے۔ دروازہ آہستہ سے کھلا۔ میں نے دیکھا عبید اندر آیا تھا۔ مجھے اپنے اس بیٹے کے ساتھ بہت ہی پیار تھا۔ میں نے کہا' آؤ بیٹے' آگے آ جاؤ لیکن وہ وہیں کھڑا رہا۔ میں نے اُس کا چہرہ دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ یہ لڑکا اپنے آپ میں نہیں۔ اس کی آنکھیں سُرخ تھیں اور مجھے ایسی نظروں سے گھور رہا تھا جیسے مجھے کھا جائے گا۔ اس کی نظروں میں قہر اور عتاب تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں تھے۔ وہ دروازے کے قریب ہی کھڑا مجھے گھُورتا رہا اور میں سامنے والی دیوار کے ساتھ کُرسی پر بیٹھا رہا....

"میں نے اسے ایک بار پھر کہا' آؤ عبید' آگے آؤ لیکن وہ وہیں کھڑا رہا۔ اس کے منہ سے یہ الفاظ اس طرح نکلے جیسے کوئی نیند میں بولا کرتا ہے — "تم لوگوں نے میری زندگی حرام کر دی ہے' — اُس نے دایاں ہاتھ کوٹ کی جیب سے نکالا تو میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اُس نے ریوالور کی نالی میری طرف کر دی اور بولا کہ

اپنی ماں کو ختم کر کے میں تمہیں بھی زندہ نہیں رہنے دوں گا۔ اُس نے ریوالور میری طرف بالکل سیدھا کر دیا اور اس کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ یقین جانیں صاحب! میں نے ذرا سا بھی خوف محسوس نہ کیا۔ میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ میرا بیٹا بہت بُری اذیّت میں مبتلا ہے....

"میں نے اسے کہا' ہاں بیٹا' میں تمہارا مجرم ہوں' مجھے گولی مار دو لیکن یہ یقین کر لو کہ ماں کے بعد باپ کو بھی مار دو گے تو تمہیں وہ سکون میسّر آ جائے گا جس کے لئے تم تڑپ رہے ہو۔ میں آہستہ آہستہ کرسی سے اٹھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دل میں دعا کی' اے میرے خدا' میرا بیٹا اذیّت میں مبتلا ہے' اسے نجات عطا فرما' اس کی روح کو تسکین عطا فرما۔ اگر میری جان اسے روحانی سکون دے سکتی ہے تو میرے خدا' اس کے ہاتھوں میں میری جان لے لے....

"عبید میرے پاس آیا کرتا تھا۔ مجھے اس کے ساتھ بہت ہی پیار تھا۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتا تھا۔ میں نے اسے یہ بھی کہا تھا کہ وہ میرے پاس آ جائے اور میں اسے اپنے پاس رکھوں گا اور اسے کوئی بھی مجھ سے چھین نہیں سکتا۔ وہ کبھی کبھی میرے ساتھ لگ کر رویا بھی کرتا تھا۔ مجھے ایک سہولت یہ بھی حاصل ہو گئی تھی کہ میری دوسری بیوی عبید کو اچھا چاہتی تھی اور وہ جب بھی آتا میری بیوی اسے ماؤں جیسا پیار دیتی تھی اور یہ تو اس نے کئی بار کہا کہ یہ لڑکا مجھے بہت ہی اچھا لگتا ہے اور اس پر رحم اور ترس بھی آتا ہے کہ ماں اور باپ کے درمیان بھٹکتا پھر رہا ہے....

"عبید ابھی تک ریوالور میری طرف کئے چُپ چاپ کھڑا تھا۔ اس میں اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ وہ مجھے گولی مارے گا لیکن میرے دل میں کوئی ایسا خیال نہ آیا کہ میں لپک کر یا کوئی پینترہ بدل کر اس کا ریوالور والا ہاتھ پکڑ لوں۔ میرے دل میں وہی دعا تھی کہ اللہ میرے بیٹے کو اس اذیّت سے نجات دلا دے۔ میں نے آیت الکرسی کا وِرد شروع کر دیا' اس لئے نہیں کہ بیٹا مجھے نہ مارے بلکہ اس لئے کہ میرا بیٹا سکون میں آ جائے اور پھر میں اسے ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھ لوں۔ میں نے آیت الکرسی پڑھ کر اسے کہا ——'آؤ بیٹا' میرے سینے سے لگ جاؤ اور پھر ریوالور میرے سر کے ساتھ لگا کر گولی چلا دینا۔ اتنے میں میری بیوی اندر سے آئی اور اس کمرے میں یہ منظر دیکھ کر دروازے میں ہی رک گئی....

"میری بیوی کچھ بھی نہ بولی۔ ایسے موقعوں پر عموماً عورتیں چیخنا چلّانا شروع کر دیتی ہیں لیکن میری بیوی نے عبید سے کہا' آ بیٹے' دروازے میں کیوں کھڑا ہو گیا ہے... عبید کی آنکھیں میری بیوی کی طرف گھومیں' پھر اس کی آنکھیں میری طرف ہوئیں۔ میں نے بازو پھیلا دیئے اور میری آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ عبید کا ریوالور جو میری طرف تھا وہ اوپر کو نہایت آہستہ آہستہ اٹھا۔ پھر یہ ریوالور بائیں طرف گھوما اور عبید نے ریوالور کی نالی اپنی کنپٹی کے ساتھ لگا لی۔ میں نے بڑی زور سے جست لگائی کہ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لوں لیکن وہ ٹریگر دبا چکا تھا اور گولی اس کے سر میں سے گزر گئی تھی۔ وہ گرنے لگا تو میں نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ میری بیوی بھی دوڑتی آگے آئی۔ وہ بھی عبید سے لپٹ گئی۔ ہم نے اسے پلنگ پر ڈالا نبض دیکھی وہ مر چکا تھا..

"پہلے تو مجھے ہوش ہی نہ رہی کہ اب کیا کروں۔ میری بیوی نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ میرے بیٹے بھی آ گئے جن میں ایک کی عمر تیرہ سال ہے۔ گھر میں کہرام بپا ہو گیا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ تھانے والوں کا کیس ہے اور مجھے تھانے جانا چاہئے۔ پہلے میں نے محلّے کے دو تین آدمیوں کو بلایا اور انہیں یہ واقعہ سنایا تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ ریوالور لے کر تھانے چلے جاؤ۔ میں تھانے گیا اور ریوالور تھانیدار کی میز پر رکھ کر اسے یہ حادثہ سنایا۔ میری قمیض اور شلوار سامنے سے خون سے لال ہو گئی تھی۔ میں نے عبید کو اپنے بازوؤں میں لے لیا تھا اس لئے اس کا خون میرے کپڑوں پر بہتا رہا تھا۔ تھانیدار صاحب نے میری جذباتی حالت دیکھے بغیر اور کوئی بات سنے بغیر مجھے مارنا پیٹنا شروع کر دیا"۔

"کیا آپ نے ریوالور کو دستے سے پکڑا تھا؟" —— فرانس نے اس سے پوچھا۔

"ہاں صاحب!" —— محسن علی نے جواب دیا —— "کچھ یاد نہیں' میں نے شاید نالی کی طرف سے پکڑا تھا اور دستے کو بھی ہاتھ میں لئے رکھا تھا"۔

اس کے اس جواب سے یہ ثابت ہو گیا کہ عبید کی انگلیوں اور ہاتھوں کے نشان محسن علی کی انگلیوں اور ہاتھوں نے مٹا دیئے تھے.... محسن علی کی شلوار اور قمیض جو خون آلود تھیں' تھانے میں رکھ لی گئی تھیں اور محسن علی کو تھانے میں کسی کانسٹیبل کے کپڑے پہنا دیئے گئے تھے۔ ہم نے اس کی قمیض اور شلوار دیکھی تو ہم دونوں اس نتیج

پر پہنچے کہ محسن علی اگر اپنے بیٹے کو گولی مارتا تو اس کی لاش اپنے ساتھ نہ لگاتا۔ اس صورت میں عبید گر پڑتا محسن علی کے کپڑوں پر زیادہ خون نہ لگتا۔

محسن علی نے بڑی مشکل سے یہ بیان مکمل کیا تھا کیونکہ وہ روتا تھا اور اتنی ہچکیاں لیتا تھا کہ اس سے ٹھیک طرح بولا نہیں جاتا تھا۔ ایک بار تو اس کی دھاڑیں نکل گئیں۔

یہ کیس چونکہ شاہدرہ تھانے کا تھا اس لئے ہم نے ایس ایچ او کو الگ بٹھا کر صلاح مشورہ کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ محسن علی کو چھوڑ دیا جائے۔ اسے چھوڑ دیا گیا۔

اس میں اب کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ عبید ہی اپنی ماں کا قاتل تھا اور اپنا قاتل بھی وہ خود ہی تھا۔ اس میں بھی اب کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ عبید کو ریوالور اس کے دوست شرفی نے دیا تھا۔ میں اور فرانسس شاہدرہ تھانے سے چلے' دلی آئے اور شرفی کے گھر جا پہنچے۔ شرفی کا باپ گھر پر مل گیا اور شرفی بھی گھر ہی تھا' تھوڑی ہی دیر پہلے کالج سے آیا تھا۔

میں نے شرفی کے باپ سے کہا کہ عبید کو ریوالور اس کے بیٹے نے دیا تھا اور اپنے بیٹے سے کہے کہ یہ بات مان جائے تاکہ ہمارا کیس مکمل ہو جائے۔ قدرتی بات ہے کہ باپ نے منت سماجت شروع کر دی کہ اس کے بیٹے کو گرفتار نہ کیا جائے۔ میں نے اسے وعدہ دیا کہ اسے اور اس کے بیٹے کو بچانے کی پوری کوشش کروں گا لیکن ہمیں سچ معلوم ہو جانا چاہئے۔ باپ اندر چلا گیا اور کچھ دیر بعد اپنے بیٹے شرفی کے ساتھ باہر آیا اور کہا کہ اسے وہ ہمارے پاس چھوڑ چلا ہے' اب یہ سچ بولے گا۔

"تم ڈرو نہیں شرفی!" — میں نے کہا — "تم اصل بات تو گول ہی کر گئے تھے۔ عبید کو ریوالور تم نے دیا تھا۔ اگر تم اب بھی جھوٹ بولو گے تو تمہارے ابا جان کو ہم ساتھ لے جا کر حوالات میں بند کر دیں گے۔ کیا تم اپنے اتنے معزز باپ کی یہ بے عزتی برداشت کر لو گے؟"

"نہیں سر!" — اُس نے کہا — "ابا جان نے مجھے کہا ہے کہ بس آپ کو سچی بات بتا دوں تو آپ مجھے گرفتار نہیں کریں گے"۔

"یہ ہمارا تمہارے ساتھ وعدہ ہے" — فرانسس نے کہا — "ہم تمہیں گرفتار نہیں کریں گے؟"۔

"عبید کو دونوں بار ریوالور میں نے ہی دیا تھا" — شرفی نے کہا — "پہلی بار اسے

ریوالور کے سلنڈر میں چھ گولیاں ڈال کر دیا تھا۔ اس نے ایک گولی اپنی ماں کو ماری اور مجھے بتا دیا۔ میں نے چلی ہوئی گولی کا کھوکھا سلنڈر سے نکال کر پھینک دیا اور باقی گولیاں بھی نکال دیں اور ریوالور واپس رکھ دیا۔ میں نے آپ کو اس کی ساری حالت بتائی ہے۔ وہ اب باپ کو گولی مارنا چاہتا تھا۔ میں نے پھر اسے ریوالور دے دیا لیکن یہ پتہ چلا کہ اسی ریوالور سے وہ خود مارا گیا ہے تو میں بہت پریشان ہُوا۔ اگلے ہی روز یا اس سے اگلے روز میرے ابا جان نے دیکھا کہ ریوالور غائب ہے تو انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے صاف جھوٹ بول دیا کہ مجھے کچھ علم نہیں"۔

"شرفی یار!" — میں نے کہا — "تمہارا فرض تو یہ تھا کہ اُسے روکتے کہ اتنا ہولناک جرم نہ کرو۔ تم نے اس کے ہاتھ میں ریوالور دے دیا"۔

شرفی نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور اُس کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ آ گئی۔

"آپ مسلمان ہیں نا!" — اُس نے کہا — "غیرت سے تو آپ واقف ہوں گے! .... میں نے آپ کو ایک بات نہیں بتائی تھی۔ عبید کی ماں کے قتل سے سات آٹھ روز پہلے یہ لوگ شاہدرہ گئے تھے۔ عبید کی ماں اپنے والدین کے ہاں شاہدرہ جاتی ہی رہتی تھی۔ عبید بھی ساتھ تھا۔ دو دنوں بعد وہ واپس آئے تو عبید نے مجھے کالج میں الگ لے جا کر بتایا کہ وہاں ایوب نام کا ایک آدمی ہے جو اُس کی ماں سے ملتا رہتا ہے۔ اب وہ شاہدرہ گئے تو ایوب ان کے گھر آیا۔ عبید اپنے نانا کی حویلی میں ویسے ہی گھوم پھر رہا تھا کہ ایک بند دروازے کی درز میں سے اُس نے اندر دیکھا تو وہاں ایوب اور اپنی ماں کو بغلگیری کی حالت میں دیکھ لیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس سے پہلے دو بار اس نے اپنی ماں کو ایوب کے ساتھ ایسی ہی حالت میں دیکھا تھا اور ایک بار تو وہ بڑی ہی بے ہُودہ حرکتیں کر رہے تھے .... اب اس نے پھر دیکھا تو وہ پاگل سا ہو گیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ ماں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں خود عزت اور غیرت والا ہوں صاحب! میری اور عبید کی دوستی کو آپ شاید نہ سمجھ سکیں۔ میں نے عبید سے کہا کہ چلو میں تمہارے ساتھ ہوں گا اور تم ماں کو ختم کر دو .... اس نے میرے ریوالور سے یہ کام کر دیا اور کہنے لگا کہ اس کا باپ محسن علی اس کی ماں کو تنگ کر کے طلاق نہ دے دیتا تو ماں اس ذلت میں نہ پڑتی۔ اُس نے اسی روز فیصلہ کر لیا تھا کہ باپ کو بھی قتل کرے گا۔ معلوم نہیں وہ خود کیسے قتل

ہوگیا"۔

"اس نے خودکشی ہے" — میں نے اسے بتایا۔

ہمارا کیس مکمل ہو چکا تھا۔ قاتل اپنے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ میں نے اور فرانسس نے شرفی کے باپ کی بہت سفارش کی اور ایس پی سے کہا کہ یہ شخص خود بھی سچ نہ بولتا اور بیٹے کو سچ بولنے کی تلقین نہ کرتا تو ہمیں پتہ نہ چل سکتا کہ ریوالور تو قاتل کے ہاتھ میں کس طرح پہنچ گیا تھا۔ ہم نے اپنے ایس پی سے کہا کہ شرفی اور اس کے باپ کے خلاف کوئی الزام نہیں آنا چاہئے اور انہیں اس تعاون کا کچھ نہ کچھ صلہ ملنا چاہئے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ انہیں بالکل ہی معاف کر دیا جاتا۔ انہیں سزا یہ دی گئی کہ ریوالور بحق سرکار ضبط اور اس کا لائسنس منسوخ کر دیا گیا۔

* * *

آشرم سے اُس بازار تک

قتل کا یہ کیس بھی مجھے اُس وقت ملا تھا جب میں سی آئی اے میں تھا۔ میرے ساتھ ایک انگریز انسپکٹر ہیو والٹر کلارک تھا۔ اس کا نام تو کلارک تھا لیکن سب اسے انسپکٹر کلاک کہا کرتے تھے۔ وہ نیا نیا سی آئی اے میں آیا تھا لیکن پولیس میں نیا نہیں تھا۔ وہ سینٹرل انڈیا کے دو تین شہروں میں رہ چکا تھا اور وہاں اس نے سات آٹھ سال گذارے تھے۔ اُردو بہت اچھی بولتا اور بڑی آسانی سے سمجھتا تھا اور ایک خوبی یہ کہ ہندوستان کے مختلف خطّوں کے لوگوں کی عادات' نفسیات اور معاشرتی احوال کو بڑی مہارت سے سمجھتا اور اس کے مطابق ان کے ساتھ سلوک اور برتاؤ کرتا تھا۔ ایک تو اس کی کامیابی کی یہ وجہ تھی اور دوسری وجہ یہ کہ وہ انگلینڈ کے مشہور سراغرساں ادارے سکاٹ لینڈ یارڈ کا تربیت یافتہ اور تجربہ کار تھا۔

واردات یہ تھی کہ پرانی دِلّی کے ایک محلے کی چھوٹی سی ایک مسجد کا امام قتل ہوگیا تھا۔ اس امام کی عمر چھبیس ستائیس سال تھی۔ وہ مسجد میں فجر کی اذان کے وقت قتل ہُوا تھا۔ یہ مڈل اور لوئر مڈل کلاس مسلمانوں کا محلّہ تھا۔ اس کے ساتھ ہندوؤں کا محلّہ تھا'۔۔

۔۔ میں اپنی کہانیوں میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ ہر واردات کی تفتیش سی آئی اے کو نہیں دی جاتی' خاص وجوہات ہوتی ہیں جن کی بناء پر کسی سنگین واردات کی تفتیش سی آئی اے کو دی جاتی ہے۔ اس جواں سال امام کا قتل سی آئی اے کے پاس برائے تفتیش نہیں آنا چاہئے تھا کیونکہ یہ قتل کی ایک عام سی واردات تھی لیکن اس کا ایک پس منظر تھا جسے دیکھ کے ہمارے بالائی انگریز افسروں نے فیصلہ کیا کہ اس کی تفتیش سی آئی اے کرے۔

پس منظر یہ تھا کہ تقریباً ایک مہینہ پہلے اس مسلمان محلے اور ساتھ والے ہندو

محلے میں ہندو مسلم فساد ہو گیا تھا۔ فساد یوں ہُوا کہ ہندوؤں کی بارات مسجد کے سامنے سے بینڈ بجاتے گزری اور اندر مسلمان نماز پڑھ رہے تھے۔ ہندوستان میں ایسے فساد ہوتے ہی رہتے تھے۔ نمازی مسجد سے نکل آئے اور باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔ مسلمانوں نے دو ہندوؤں کو پھڑکا دیا اور بارہ چودہ ہندو زخمی کر دیئے۔ مسلمان بھی زخمی ہوئے لیکن مرا کوئی نہیں۔ دو ہندو مارے گئے تھے۔ یہ کیس ابھی تک پولیس کے پاس تھا لیکن انگریز افسر اس پر مٹی ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ دونوں فریقوں میں صلح صفائی کرانا چاہتے تھے۔ ایک ہی مہینے بعد امام اپنی مسجد میں قتل ہو گیا تو پہلی بات ہر کسی کے ذہن میں یہی آئی کہ یہ ہندوؤں کی واردات ہے۔

آج کل تو پاکستان میں یوں ہو رہا ہے کہ قتل یا ڈکیتی یا اغوا کی واردات ہو جاتی ہے تو متعلقہ تھانیدار نہ صرف یہ کہ رپورٹ لکھنے میں پس و پیش کرتا ہے بلکہ رپورٹ دینے والی پارٹیوں کی بے عزتی کر کے تھانے سے چلتا کرتا ہے۔ انگریزوں کے وقتوں میں قتل اور ڈاکہ زنی کی وارداتوں کی رپورٹ تھانے میں آتی تھی تو تھانیدار اُسی وقت علاقہ ڈی ایس پی اور علاقہ مجسٹریٹ کو تحریری رپورٹ بھیجتا تھا۔ ڈی ایس پی انگریز ہوتے تھے۔ وہ اُسی وقت سے اس واردات کی تفتیش کی نگرانی شروع کر دیتے اور وقتاً فوقتاً تھانے میں جا کر دیکھتے تھے کہ ملزم پکڑے گئے ہیں یا نہیں یا متعلقہ تھانیدار کوتاہی تو نہیں کر رہا!.... انگریز قتل' ڈاکہ اور اغوا کی واردات کی تفتیش کو ایک منٹ کے لئے بھی نظرانداز نہیں کرتے تھے۔

اس علاقے کے تھانیدار نے ڈی ایس پی کو امام کے قتل کی رپورٹ بھیجی تو اس انگریز ڈی ایس پی نے تھانے دار کو حکم دیا کہ وہ فوراً تفتیش شروع کر دے لیکن مکمل تفتیش سی آئی اے کرے گی۔ وجہ یہ تھی کہ ایک امام' مسجد میں قتل ہو گیا اور ایک ہی مہینہ پہلے یہاں ہندو مسلم فساد ایک مسجد کی بے حرمتی سے ہُوا تھا۔ ڈی ایس پی نے سوچا تھا کہ یہ قتل اسی فساد کی اگلی کڑی ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں نے دو ہندوؤں کو مار ڈالا تھا۔ ایک وجہ یہ تھی کہ اس علاقے کا تھانیدار مسلمان تھا۔ وہ سب انسپکٹر رضا احمد خان رامپوری تھا جو اپنے فرائض کی پابندی بڑی سختی سے کیا کرتا تھا اور بڑا ہی سخت طبیعت انسان تھا۔ ڈی ایس پی نے خطرہ یہ محسوس کیا تھا کہ یہ مسلمان سب انسپکٹر ہندوؤں کے

خلاف کیس بنا دے گا اور فساد مزید بڑھے گا۔ واردات کی تفتیش تو بہرحال صحیح کرنی تھی۔ کسی بے گناہ کو نہیں پکڑنا تھا نہ ہی انگریزوں کے دَور میں ایسا کیا جاتا تھا۔ انگریز افسروں کا مطلب یہ دیکھنا تھا کہ اس قتل کا باعث ذاتی ہے یا اس کا تعلق ہندو مسلم کشیدگی کے ساتھ ہے۔ اسلام کی روح کو دیکھیں تو اس میں فرمانِ الٰہی یہ بھی ہے کہ ایک انسان کا قتل انسانیت کے قتل کے برابر ہوتا ہے۔ انگریزوں نے قتل کے سلسلے میں اپنا قانون اتنا ہی سخت بنایا تھا۔ افسوس اور شرم کا مقام ہے کہ آج ایک اسلامی مملکت میں انسان یوں قتل ہو رہے ہیں جیسے مکھیاں ماری جاتی ہیں اور کوئی گرفت نہیں۔ جس کے پاس پیسہ اور اثر و رسوخ ہے' قانون بھی اُسی کا اور پولیس بھی اُسی کی ہے۔

یہ کیس مجھے اور انسپکٹر کلاک کو دیا گیا۔ واردات دو دن پرانی ہو چکی تھی۔ ہم دونوں متعلقہ تھانے میں گئے۔ اُس وقت تک سب انسپکٹر رضا جو تفتیش کر چکا تھا' وہ رپورٹ اس نے ہمیں تفصیل سے بتائی۔ لاش کا پوسٹ مارٹم کرایا گیا تھا اور مقتول دفن ہو چکا تھا۔ مقتول کو چاقوؤں سے قتل کیا گیا تھا۔ اُس کے جسم پر چاقو کے پانچ گہرے زخم تھے۔ واردات کا ایک عینی شاہد بھی تھا جسے ہم نے تھانے بلوا لیا۔ سب انسپکٹر رضا نے ہمیں اس کا بیان سنایا تھا لیکن ہم ازسرِنو اس گواہ سے بیان سننا چاہتے تھے۔ وہ ایک ادھیڑ عمر سکول ماسٹر تھا۔

اس سکول ماسٹر نے جو بیان دیا وہ یوں تھا کہ یہ اُس کا معمول تھا کہ اذان کے وقت مسجد میں جاتا اور نمازِ باجماعت سے پہلے تلاوتِ قرآن کیا کرتا تھا۔ قتل کی صبح حسبِ معمول مسجد میں گیا اور غسل خانے میں چلا گیا۔ مسجد میں تین غسل خانے تھے اور تینوں پر چھت نہیں تھی۔ ان میں کوئی آدمی کھڑا ہوتا تو وہ باہر آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ اندر سے مسجد یوں تھی کہ دروازے میں داخل ہوتے تو بائیں طرف تین غسل خانے تھے اور دائیں طرف مسجد کا کمرہ۔ اس کے آگے برآمدہ اور آگے چھوٹا سا صحن تھا۔ غسل خانوں اور مسجد کے درمیان تھوڑی سی جگہ جُوتوں سمیت چلنے اور جُوتے رکھنے کے لئے تھی۔ ماسٹر غسل خانے میں کھڑا ہو کر ازاربند باندھ رہا تھا کہ اس نے امام کو دیکھا جو اذان دینے والی جگہ کی طرف جا رہا تھا۔ اُن دنوں چاند پچھلے پہر کا ہوتا تھا اور چاندنی بڑی ہی شفاف ہوتی تھی۔ مسجد کے برآمدے میں بلب جل رہا تھا۔ یہ نہ بھی ہوتا تو چاندنی

اتنی صاف تھی کہ سب کچھ بڑی اچھی طرح نظر آتا تھا۔ امام ابھی اذان دینے والی جگہ سے دو تین قدم دور تھا کہ دروازے میں دو آدمی داخل ہوئے اور وہ بڑی تیزی سے امام تک پہنچے اور اسے چاقو مارنے شروع کر دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے امام کے کپڑے خون سے سرخ ہو گئے۔

ماسٹر کے پاس بید کی لمبی چھڑی تھی جو غسل خانے سے باہر دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی تھی۔ اُس زمانے میں چھڑی ہاتھ میں لے کر چلنے کا رواج عام تھا۔ ماسٹر لوگ تو چھڑی کے بغیر لگتے ہی نامکمل تھے۔ ماسٹر بڑی تیزی سے غسل خانے سے نکلا اور اس نے اپنی چھڑی اٹھائی۔ دونوں حملہ آور پیچھے کو مڑے تو ماسٹر نے ایک کے منہ پر بید کی یہ چھڑی پوری طاقت سے ماری۔ اس آدمی نے اپنے دونوں ہاتھ منہ پر رکھے تو اس کے ہاتھ سے چاقو گر پڑا۔ ماسٹر چوکنّا تھا۔ اس کی نظر دوسرے آدمی پر بھی تھی۔ دوسرے آدمی نے ماسٹر کو چاقو مارنا چاہا تو ماسٹر نے پیچھے ہٹ کر پوری طاقت سے اس آدمی کو بید مارا اور اس کا بھی چاقو گر پڑا کیونکہ بید کی ضرب چاقو والے ہاتھ پر لگی تھی۔ جس کے منہ پر بید لگا تھا وہ تو چاقو وہیں چھوڑ کر بھاگ گیا لیکن دوسرا آدمی اپنا چاقو اٹھانے کے لئے جھکا۔ ماسٹر نے اس کی پیٹھ پر بڑے زور زور سے بید کی دو ضربیں لگائیں۔ اس آدمی نے چاقو اٹھا لیا اور باہر کو بھاگا۔ ماسٹر نے بڑی تیزی سے اپنے بید کے اوپر والا سرا آگے کیا جو مُڑا ہُوا ہوتا ہے اور جہاں سے بید پکڑا جاتا ہے۔ اس نے یہ سرا بھاگتے ہوئے حملہ آور کے پاؤں میں ٹخنے کے قریب اُڑا دیا اور وہ حملہ آور دروازے میں منہ کے بل گرا۔ وہ فوراً اٹھا' ماسٹر نے پیچھے سے اسے پکڑنا چاہا لیکن اس کی قمیض کا نیچے والا حصہ ماسٹر کے ہاتھ میں آیا اور یہ حصہ پھٹ گیا اور وہ آدمی بھاگ گیا۔ ماسٹر نے اس کی قمیض چھوڑ دی اور اس کے پیچھے دوڑا لیکن دہلیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ دروازے کی تین سیڑھیاں تھیں کیونکہ دروازہ اونچا تھا۔ ماسٹر ان سیڑھیوں پر گرا اور گلی میں جا پڑا۔ اتنے میں حملہ آور بھاگ گئے۔

ماسٹر اٹھا اور شور مچایا اور پھر گلی میں سامنے والے دروازے پر زور زور سے دستک دی۔ دروازہ کھلا تو اس نے بتایا کہ مولوی صاحب پر حملہ ہُوا ہے اور باہر آ کر سارے محلّے کو بتا دو۔ ماسٹر خود مسجد میں گیا اور امام تک پہنچا۔ امام ابھی زندہ تھا لیکن

ایسے جیسے خون میں ڈوبا ہُوا ہو۔

"ہم ابھی آپ کو ہسپتال پہنچاتے ہیں" — ماسٹر نے امام سے کہا — "اللہ رحم کرے گا"۔

"نہیں!" — امام نے سرگوشی کی — "اجمیری گیٹ کے لوگ ہوں گے.... رانی کو معلوم ہے"۔

امام اس کے آگے نہ بول سکا۔ ماسٹر کے بیان کے مطابق' امام نے یہ چند الفاظ بڑی ہی مشکل سے اپنی زبان سے آگے دھکیلے تھے۔ ماسٹر نے تین چار بار پوچھا کہ یہ رانی کون ہے لیکن امام غشی میں چلا گیا تھا اور اُس وقت محلّے کے بہت سے آدمی مسجد میں آ گئے تھے۔ چارپائی بھی آ گئی اور امام کو چارپائی پر ڈال کر لوگوں نے چارپائی اٹھائی اور دوڑتے ہوئے ہسپتال پہنچے لیکن امام مر چکا تھا۔

سب انسپکٹر رضا کو میں ذاتی طور پر جانتا تھا۔ وہ اپنے کام کا ماہر تھا۔ اس نے اس ماسٹر کی وہ بید کی چھڑی اپنے قبضے میں لے لی تھی جو اس نے دونوں حملہ آوروں کو ماری تھی۔ میں نے اور انسپکٹر کلاک نے یہ بید دیکھا تو کلاک نے مسکرا کر کہا کہ ماسٹر کے بیان کے مطابق اگر یہ بید جس کسی کو بھی لگا ہے اس کے جسم پر وہاں گہرے نیلے رنگ کی لکیر پڑ گئی ہو گی۔ اس سے ہم ملزم کو شناخت کر لیں گے.... اس بید کی موٹائی بمشکل نصف انچ تھی۔ اس نے وہاں سے کھال بھی ادھیڑ لی ہو گی جہاں یہ بید لگا ہو گا۔ سب انسپکٹر رضا نے ہمیں تین چابیاں دیں جو ایک رِنگ میں پروائی ہوئی تھیں۔ یہ اس نے مقتول کی لاش کی جامہ تلاشی میں اس کی جیب سے برآمد کی تھیں۔ امام کو جو مکان دیا گیا تھا وہ مسجد سے ملحق تھا اور مقفّل تھا۔ وہ اس مکان میں اکیلا رہتا تھا اور جب باہر نکلتا تو باہر والے دروازے کو تالا لگا دیا کرتا تھا۔

چونکہ سب انسپکٹر رضا کو حکم دے دیا گیا تھا کہ وہ تفتیش کی ابتدائی کارروائی کرے لیکن ساری تفتیش سی آئی اے کرے گی اس لئے رضا نے مولوی کا مکان سربمہر کر دیا اور وہاں ایک کانسٹیبل کا پہرہ کھڑا کر دیا تھا۔

ہم جائے وقوعہ یعنی مسجد اور مقتول کا مکان دیکھنے کے لئے چلے گئے۔ رضا کو بھی ساتھ لے لیا۔ اس کی ابھی ہمیں ضرورت تھی کیونکہ اس نے مقتول کے متعلق محلّے

داروں سے کچھ معلومات حاصل کی تھیں۔ ہم ان لوگوں سے بھی ملنا چاہتے تھے۔ سب انسپکٹر رضا کی اس بات نے مجھے اور انسپکٹر کلاک کو پریشان کر دیا کہ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ مقتول امام کہاں کا رہنے والا تھا۔ ہم مسجد میں گئے اور سکول ماسٹر سے کہا کہ وہ ہمیں بتائے کہ قتل کے وقت وہ کہاں تھا اور پھر وہ چاقو کہاں گرا تھا اور پھر دوسرا حملہ آور کس جگہ تھا کہ وہ بید کی ضربیں کھا کر بھاگا وغیرہ۔ سکول ماسٹر نے ہمیں وہ ساری جگہیں دکھائیں اور بڑے اچھے الفاظ میں ایکشن ری پلے کیا۔

رضا نے ایک اور ضروری کام پہلے ہی مکمل کر رکھا تھا۔ وہ اطلاع ملتے ہی مسجد میں آیا۔ لوگوں نے یہ عقلمندی کی تھی کہ قاتل کا چاقو وہیں پڑا رہنے دیا تھا جہاں گرا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ پولیس آ کر یہ چاقو دیکھے گی۔ رضا نے چاقو بڑی احتیاط سے ایک سرے سے پکڑ کر اٹھایا تھا اور اس پر انگلیوں کے واضح نشان تھے جنہیں اس نے ایک خاص کاغذ پر منتقل کر کے محفوظ کر لیا تھا۔ انگلیوں کے نشان محفوظ کرنے کا پورا سامان ہر تھانے میں ہوتا تھا۔

جائے وقوعہ دیکھ کر ہم مقتول کے مکان کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔ تالے پر سب انسپکٹر رضا نے جو مہر لگائی تھی وہ توڑی۔ تین چابیوں میں سے ایک اس تالے کو لگ گئی۔ تالا کھول کر ہم اندر گئے۔ یہ دو کمروں کا مکان تھا جس کے آگے برآمدہ بھی تھا اور صحن بھی۔ دونوں کمرے دیکھے۔ ایک کمرے میں چارپائی اور کچھ دوسری گھریلو استعمال کی چیزوں کے علاوہ ایک درمیانہ سائز کا ٹرنک بھی پڑا تھا۔ ٹرنک کو تالا لگا ہوا تھا۔ ایک چابی سے یہ تالا کھل گیا۔

ٹرنک میں کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک ایک کپڑا الگ کر کے دیکھا اور ان کپڑوں کے نیچے دو لفافے پڑے ملے جن میں خط تھے۔ یہ ڈاک خانے کے لفافے تھے۔ ایک لفافے میں سے خط نکالا تو پڑھنے سے پتہ چلا کہ یہ مقتول کی ماں کا خط ہے۔ خط میں ماں نے زیادہ تر اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ وہ مقتول کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔ نیچے صرف یہ لکھا تھا' تمہاری ماں۔ ماں نے اپنا ایڈریس نہیں لکھا تھا۔ لفافے پر جو مہر تھی' اس سے پتہ چلا کہ یہ خط انبالہ سے لکھا گیا ہے۔

دوسرے لفافے میں سے جو خط نکلا' اسے دیکھ کر ہمیں اطمینان ہوا۔ اس کے نیچے لکھنے والے کا پورا ایڈریس لکھا تھا اور خط لکھنے والے نے اپنا نام بھی لکھا تھا۔ یہ خط

بھی انبالہ سے آیا تھا۔ پورا خط پڑھنے سے پتہ چلتا تھا کہ لکھنے والا مقتول کا دوست تھا۔ تحریر تو یاد نہیں لیکن لبِ لباب بڑی اچھی طرح یاد ہے۔

دوست نے لکھا تھا کہ یہ میرا آخری خط ہے' اس کے بعد میں کوئی خط نہیں لکھوں گا۔ میں تمہیں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ رانی کو دل سے اتار دو اور میری باتوں کو ٹالنے کا خیال چھوڑ دو۔ میں نے تمہاری زندگی سنوار دی تھی' تم خود تباہی کی طرف چل پڑے ہو۔ تم بھاگ نہیں سکتے۔ مسجد تمہیں پناہ نہیں دے سکتی۔ میں آج تمہیں پہلی اور آخری بار لکھ رہا ہوں کہ تمہارا جو رویّہ ہے' اس کا نتیجہ بہت ہی بُرا ہو گا۔

میرا اور انسپکٹر کلاک کا بھی خیال یہی تھا اور یہی شک ہمارے ذہنوں میں بیٹھا ہوا تھا کہ مقتول امام کو ہندوؤں نے قتل کیا ہے۔ یہ شک رفع کرنے کے لئے یا اس شک کو ذہن میں رکھ کر چھان بین کے لئے ہم مقتول کے گھر میں ہی بیٹھ گئے اور محلے کے تین معزز اور بزرگ آدمیوں کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ سکول ماسٹر پہلے ہی ہمارے ساتھ تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ مسجد کی ایک کمیٹی بھی بنی ہوئی ہے۔ اتفاق سے ان تین بزرگوں میں دو مسجد کمیٹی سے تعلق رکھتے تھے اور کمیٹی کا جو صدر تھا' اسے بھی بلوا لیا۔ ان سے ہم نے پوچھا کہ ان کی رائے کیا ہے۔ وہ بھی یہی کہتے تھے کہ مقتول کو ہندوؤں نے مارا ہے لیکن قاتلوں کو سکول ماسٹر نے دیکھا تھا۔ اس کی رائے مختلف تھی۔ ویسے بھی ہم نے دیکھا کہ وہ جذباتی کم اور حقیقت پسند زیادہ تھا۔

"وہ ہندو نہیں لگتے تھے" ـــ سکول ماسٹر نے بتایا ـــ "یہ بھی بتا دوں کہ ان کا قتل کرنے کا انداز اور طریقہ ہندوؤں والا نہیں تھا۔ ہندو عموماً ہجوم کی صورت میں حملہ کیا کرتے ہیں اور ہجوم کی صورت میں ہی بھاگا بھی کرتے ہیں۔ اگر یہ دونوں میرے سامنے آئیں تو شاید میں انہیں پہچان بھی لوں۔ ایک کی داڑھی تھی جو میرے اندازے کے مطابق دو اڑھائی انچ لمبی تھی اور دوسرا بغیر داڑھی کے تھا۔ انہوں نے شلواریں پہنی ہوئی تھیں۔ اوپر قمیضیں تھیں۔ دونوں کے سروں پر بڑے سائز کے رومال بندھے ہوئے تھے"۔

"ایک بات بتائیں" ـــ میں نے پوچھا ـــ "مقتول مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا؟"

ہمیں جواب ملا کہ مقتول نے محلے کے مسلمانوں کو کبھی بھی ہندوؤں کے خلاف مشتعل نہیں کیا تھا۔ ان لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ مقتول کی موجودگی میں ہندو مسلم فساد ہُوا تھا لیکن مقتول نے کبھی بھی اپنے وعظ میں یا نمازیوں میں بیٹھے ہوئے یہ نہیں کہا تھا کہ ہندوؤں سے انتقام لیں گے' البتہ وہ جہاد پر بہت زور دیتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ جہاد کے جذبے کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ مقتول اپنے خیالوں میں گم رہتا تھا اور پیار اور محبت سے ہر کسی کے ساتھ پیش آنے کی تلقین کرتا تھا۔ ان لوگوں نے ہمیں یقین دلایا کہ مقتول فسادی قسم کی طبیعت کا آدمی نہیں تھا۔

ان لوگوں سے ہمیں معلوم ہُوا کہ تین چار مہینے گزرے اس مسجد کا امام فوت ہو گیا۔ اس امام کا ایک جوان بیٹا تھا جو امامت کا دعویدار تھا بلکہ حق دار بھی تھا لیکن مسجد کمیٹی کے تقریباً تمام ممبر اور دو تین اور آدمی بھی مرحوم امام کے اس بیٹے کے حق میں نہیں تھے۔ یہ بیٹا دینی مدرسے میں پڑھا تھا اور دین کا اچھا خاصا علم رکھتا تھا۔ کبھی کبھی باپ کی غیر حاضری میں امامت کے فرائض سرانجام دیتا تھا لیکن ان لوگوں کو کسی طرح پتہ چلا تھا کہ مرحوم امام کے اس بیٹے کی پرائیویٹ زندگی ٹھیک نہیں۔ وہ درپردہ تاش کھیلتا اور جُوا بھی کھیلتا تھا۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا بدمعاش اور بداخلاق لوگوں کے ساتھ تھا۔ اس نے اپنی امامت کے لئے کچھ حمایتی اکٹھے کر لئے تھے لیکن زیادہ تر لوگ اس کے خلاف تھے۔ اس نے دھمکیوں کے لہجے میں اعلان کیا تھا کہ اس مسجد کی امامت کا حقدار صرف وہ ہے اور کوئی دوسرا آ گیا یا لایا گیا تو وہ اسے امامت نہیں کرنے دے گا۔

ہم نے سب انسپکٹر رضا سے کہا کہ وہ امام کے اس بیٹے کے متعلق پوری رپورٹ فراہم کرے۔ رضا جانتا تھا کہ رپورٹ فراہم کرنے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ اس نے یہ کام اپنے مخبروں سے کروانا تھا۔

مقتول کے متعلق ان لوگوں نے بتایا کہ ایک روز وہ اس مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے آیا اور نماز کے بعد اس نے نمازیوں کو روک لیا اور کہا کہ وہ یتیم ہے اور اس کا اپنا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں۔ اس نے بتایا کہ اپنی کوشش سے اس نے دینی تعلیم حاصل کی ہے اور اب تعلیم سے فارغ ہو کر امامت کے فرائض سرانجام دینا چاہتا ہے۔ اس نے یہ ساری بات وعظ کے انداز سے کہی۔ قرآن اور احادیث کے حوالے بھی دیئے اور اپنی

ذات اور اپنے مفاد سے ہٹ کر اس نے ایسی باتیں کیں کہ سب بہت متاثر ہوئے۔ مسجد کمیٹی کے یہ بزرگ اور دو تین جواں سال ورکر بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کر کے اسے امام رکھ لیا اور یہ فرض کر لیا کہ یہ دِلّی کا ہی رہنے والا ہے۔ مقتول نے انہیں کہا تھا کہ اس کا کوئی گھر اور ٹھکانہ نہیں اور اسے رہائش بھی چاہئے۔ مسجد سے ملحقہ یہ چھوٹا سا مکان مسجد کی ہی ملکیت تھا۔ مقتول کو یہ مکان دے دیا گیا۔ اس کے بعد مقتول نے خطبوں سے' اپنی زبان کی مٹھاس سے اور اپنے کردار سے لوگوں کے دلوں میں جگہ پیدا کر لی۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ مرحوم امام بوڑھا ہو گیا تھا لیکن وہ مقتول کے مقابلے میں دینی معاملات میں خاصا کمزور تھا۔ سب حیران تھے کہ اسے کس نے قتل کیا ہے۔

میری ذاتی رائے یہ تھی کہ یہ واردات ہندوؤں نے نہیں کی۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ سٹائل ہندوؤں کا نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ جن بزرگوں اور دیگر افراد کو ہم نے اپنے پاس بٹھا رکھا تھا' وہ بھی یہی کہتے تھے کہ ہندو اتنی جرأت نہیں کر سکتے۔ انسپکٹر کلاک بھی ہندوستانیوں کی نفسیات اور فطرت سمجھتا تھا۔ اس نے بھی یہ رائے دی کہ ہندو اتنے بے وقوف نہیں کہ پہلے دنگا فساد کا ایک کیس پولیس کے پاس موجود ہے تو ہندو ایک اور واردات کر ڈالتے۔ ہندو تعلیم یافتہ اور چالاک قوم ہے۔ وہ تو یہ ثابت کر رہے تھے کہ وہ بے گناہ اور مظلوم ہیں اور فساد مسلمانوں نے شروع کیا تھا۔ ہندوؤں میں وکیل بھی تھے اور سرکاری دفتروں میں بڑے عہدوں پر کام کرنے والے بھی تھے۔ پھر بھی ہم نے ہندوؤں کو نظرانداز نہیں کیا اور انہیں ذہن میں رکھا۔

ہمارے ذہن میں مقتول کے آخری الفاظ اٹک کر رہ گئے تھے۔ اس نے سکول ماسٹر سے کہا تھا کہ اجمیری گیٹ کے لوگ ہوں گے اور اس نے کسی رانی کا نام لیا تھا کہ اسے معلوم ہے.... ہم نے ان لوگوں کو باہر بٹھایا اور آپس میں تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ میں سوچتا تھا کہ مقتول کے کردار کی سب تعریف کرتے تھے پھر اس کا اجمیری گیٹ کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا تھا.... یہ ذہن میں رکھیں کہ اجمیری گیٹ کے اندر عصمت فروشوں کا بازار تھا بلکہ وہ سارا اندرونی علاقہ عصمت فروشوں کا ہی تھا۔ اس کے ساتھ دوسری یعنی عام لوگوں کی آبادی بھی تھی۔ میں نے یہ ذہن سے نکال دیا کہ مقتول کا کوئی تعلق عصمت فروشوں کے ساتھ تھا۔ اس کی بجائے یہ ذہن میں رکھ لیا کہ مقتول اجمیری

گیٹ کے اندرونی علاقے کا رہنے والا تھا اور رانی کوئی اسی آبادی کی رہائشی ہوگی جس کے ساتھ مقتول کا کوئی اچھا برُا تعلق ہوگا لیکن اتنی بڑی آبادی میں ایک عورت کو تلاش کرنا ممکن نہیں تھا۔ تاہم اجمیری گیٹ اور رانی کو ہم نے خاص طور پر اپنے ریکارڈ میں شامل کر لیا۔

سب انسپکٹر رضا کو ہم نے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ میں نے اسے کہا تھا کہ وہ مرحوم امام کے بیٹے کی رپورٹ جتنی جلدی ہو سکے' ہمیں دے دے۔

مسجد کمیٹی والوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ مقتول دِلّی کا رہنے والا ہے لیکن مقتول کے ٹرنک سے جو دو خط ملے تھے' ان سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ انبالہ کا رہنے والا تھا۔ ایک خط اس کی ماں کا تھا جو پکا ثبوت تھا کہ یہ لوگ انبالہ کے رہنے والے ہیں۔ دوسرا خط بھی جو اس کے دوست کا تھا' انبالہ سے ہی لکھا گیا تھا۔ دوست کا خط ہمیں شک میں ڈالتا تھا۔ اس میں دھمکیوں کی زبان استعمال کی گئی تھی۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ مقتول نے پہلے روز مسجد میں نمازیوں کو اپنے متعلق یہ بتایا تھا کہ وہ یتیم ہے اور اس کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں نہ ہی اس کا کوئی ٹھکانہ ہے لیکن خط اس کی ماں نے لکھا تھا اور اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ تمہارا بھائی اور بہنیں خیریت سے ہیں۔ یہ خط مقتول کے خلاف شکوک پیدا کرتا تھا۔

انسپکٹر کلاک نے کہا کہ یہ دونوں خط پڑھ کر یقین ہونے لگا ہے کہ مقتول انبالہ سے بھاگ کر یہاں آیا تھا اور وہاں کوئی گڑبڑ کر کے آیا ہوگا۔ مجھے انسپکٹر کلاک کا یہ فیصلہ اچھا لگا کہ ہمیں سب سے پہلے انبالہ اس ایڈریس پر جانا چاہئے جو مقتول کے دوست نے لکھا ہے..... اس روز کی تفتیش یہاں تک ہی پہنچ سکی اور شام گہری ہونے لگی۔ ہم وہاں سے اٹھ آئے اور اگلے روز پہلے تھانے جانا تھا اور اُس کے بعد انبالہ روانہ ہونا تھا۔

مقتول کی بیوی اور ایک نوجوان ہندو بیوہ

ایس پی نے امن و امان قائم رکھنے کے لئے یہ انتظام کیا تھا کہ پولیس کی گارد مسلمانوں کے اس محلّے اور ہندوؤں کے محلے پر نظر رکھنے کے لئے تعینات کر دی تھی۔

یہ گارد گشتی پارٹیوں میں تقسیم ہو کر دونوں محلّوں میں گشت کرتی رہتی تھی۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ مسلمانوں کے محلّے کے لوگوں میں ہندوؤں کے خلاف اچھا خاصا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ انسپکٹر کلاک نے مسجد کمیٹی کے بزرگوں سے کہا تھا کہ وہ تمام مسلمانوں کو بتا دیں کہ یہ واردات ہندوؤں نے نہیں کی۔ انسپکٹر کلاک کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان ٹھنڈے ہو جائیں' وہاں تو بارُود اور چنگاری والی بات بنی ہوئی تھی۔ کسی کی ذرا سی غلطی یا بے سمجھی سے چنگاری بارود تک پہنچ سکتی تھی۔

اگلی صبح بہت سویرے میں اور انسپکٹر کلاک اُس علاقے کے تھانے میں پہنچ گئے۔ سب انسپکٹر رضا ہمارا منتظر تھا۔ اُس نے رات ہی رات مرحوم امام کے بیٹے کی ساری رپورٹ تیار کر لی تھی۔ پولیس کے لئے یہ کام کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ مخبر زمین کی تہوں میں سے بھی راز نکال لایا کرتے ہیں۔

میں اور انسپکٹر کلاک یہ رپورٹ سن کر حیران نہ ہوئے کیونکہ یہ پولیس والے یا نفسیات کا علم رکھنے والے ہی جانتے ہیں کہ انسان ظاہری طور پر جو کچھ بھی ہو' اندرونی طور پر کچھ اور ہوتا ہے۔ بعض انسان لوگوں کو حیران کر دیا کرتے ہیں جب ان سے پردہ اٹھتا ہے۔ یہی حال مرحوم امام کے اس بیٹے کا تھا۔ پکّا دینی آدمی تھا۔ اُس نے مولویوں والی داڑھی رکھی ہوئی تھی اور دین کے رنگ میں باتیں کرتا تھا اور یہ دعویٰ بھی کہ اس کے سوا کوئی اور امام نہیں ہو سکتا لیکن مخبروں نے بتایا کہ رات کا اندھیرا گہرا ہوتے ہی اس شخص کی شخصیت اور کردار میں انقلاب آ جایا کرتا ہے۔ اسے انقلاب کہیں' تضاد کہیں' ہوتا یہ تھا کہ وہ باقاعدہ جُوا کھیلتا تھا اور اس کا دوستانہ بدمعاشوں کے ساتھ تھا اور وہ اجمیری گیٹ کے عصمت فروشوں کے ہاں بھی جاتا تھا۔ شراب کا عادی تو نہیں تھا لیکن مل جاتی تو انکار بھی نہیں کرتا تھا۔ مخبروں نے یہ بھی بتایا کہ جب مقتول کو اس مسجد کی امامت مل گئی تو مرحوم امام کا یہ بیٹا بہت ہی بھڑکا ہُوا رہنے لگا تھا اور اس نے کئی بار کہا تھا کہ وہ اس امام کو کم از کم اس مسجد میں ٹکنے نہیں دے گا۔ اس نے اس امام یعنی مقتول کے خلاف پروپیگنڈا بھی کیا تھا لیکن لوگوں نے اس کا خاطر خواہ اثر قبول نہیں کیا تھا۔ مسلمانوں کی اس آبادی میں سے کچھ لوگ اس کے حمایتی تھے لیکن ان کی آواز اتنی پُراثر نہیں تھی کہ مسجد کمیٹی کے بزرگوں کو متاثر کر سکتے۔

اس رپورٹ نے اس شخص کو ہماری نظروں میں مشتبہ بنا دیا لیکن میں نے اور انسپکٹر کلاک نے آپس میں تبادلۂ خیالات کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اسے ابھی نہ چھیڑا جائے اور پہلے انبالہ جا کر معلوم کیا جائے کہ مقتول کیا تھا اور وہ انبالہ سے کیوں چلا گیا تھا....

ہم نے یہ خاص طور پر نوٹ کیا کہ مرحوم امام کا بیٹا اجمیری گیٹ کے اندر عصمت فروشوں کے ہاں جاتا تھا اور مقتول نے مرتے وقت اجمیری گیٹ کا نام لیا تھا۔ سوال پیدا ہُوا کہ ایسا تو نہیں کہ مرحوم امام کے بیٹے نے اجمیری گیٹ کے بدمعاشوں سے مقتول کو مروایا ہو!.... بہرحال ہم نے اس شخص کو پکا مشتبہ قرار دے دیا اور سب انسپکٹر رضا سے کہا کہ وہ اس شخص کے پیچھے دو تین مخبر لگا دے جو روز بروز تھانے میں اس کی رپورٹ دیتے رہیں۔

انبالہ دِلّی سے ڈیڑھ سو میل کے لگ بھگ دُور ہے۔ ہم کسی میل یا ایکسپریس ریل گاڑی سے جانا چاہتے تھے تاکہ جلدی پہنچ جائیں۔ ایک میل ٹرین کے لئے ہمیں ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ گاڑی آئی اور ہم اس میں سوار ہوئے۔ انبالہ پہنچے تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ ہم انبالہ کینٹ اترے۔ سب سے پہلے تو یہ سوچا کہ کھانا کھا لیا جائے۔ سوال یہ تھا کہ میرے ساتھ ایک انگریز انسپکٹر تھا جس نے یورپی کھانا کھانا تھا اور میں نے کسی مسلمان ہوٹل میں جانا تھا لیکن انسپکٹر کلاک نے کہا کہ اسے ہندوستانی کھانے اچھے لگتے ہیں اور وہ ان کا عادی بھی ہو چکا تھا۔ میں اسے کینٹ کے ایک بڑے اچھے ہوٹل میں لے گیا۔ کھانا کھایا اور ہم انبالہ پولیس ہیڈ کوارٹر میں اپنی آمد کی اطلاع دینے چلے گئے۔ وہاں سے اس ایڈریس پر پہنچنے کے لئے ایک کانسٹیبل ساتھ لیا اور سوچا کہ یہ رات ضائع نہ کی جائے۔ رات کو ہی وہاں جانے میں یہ فائدہ تھا کہ اُس وقت لوگ گھروں میں مل جاتے ہیں۔ یہ ایڈریس کینٹ کا نہیں انبالہ سٹی کا تھا.... ہم اس ایڈریس پر پہنچ گئے اور کانسٹیبل کو واپس بھیج دیا۔ دروازے پر دستک دی۔ یہ پرانے ٹائپ کا مکان تھا لیکن بڑا اچھا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ یہاں رہنے والے بڑی اچھی حیثیت کے لوگ ہیں.... اتفاق سے دروازہ اُسی آدمی نے کھولا جو ہمیں مطلوب تھا۔ وہ تیس بتیس سال عمر کا آدمی تھا۔ ہم وَردی میں نہیں تھے۔ آج بھی سی آئی اے کے افسر اور دیگر عہدوں کے آدمی اور کانسٹیبل بھی پرائیویٹ کپڑوں میں تفتیش کرتے ہیں۔ میں تو ہندوستانی تھا۔ دروازہ کھولنے والا آدمی ایک انگریز کو دیکھ کر خاصا گھبرایا اور اُس کے منہ

سے آواز بھی نہ نکلی۔ خط میں دوست نے اپنا نام لیاقت علی لکھا تھا۔

جس نے دروازہ کھولا تھا' اسے میں نے یہ نہ کہا کہ ہم لیاقت علی سے ملنے آئے ہیں بلکہ یوں کہا— "آپ لیاقت علی صاحب معلوم ہوتے ہیں" —اُس نے آہستہ سے اور اوپر نیچے سر ہلایا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لیاقت علی ہی ہے۔ میں نے جب اسے یہ بتایا کہ ہم سی آئی اے کے انسپکٹر ہیں اور ایک انکوائری کے سلسلے میں آئے ہیں تو اُس کا رنگ بالکل ہی پیلا پڑ گیا۔ گلی میں اس کے گھر کے بالکل سامنے ایک بلب جل رہا تھا جس کی روشنی میں یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس شخص کا رنگ گندمی ہے یا ہلکا سانولا لیکن یہ پتہ چل گیا کہ اس کے چہرے کا قدرتی رنگ جو بھی ہے وہ زردی میں بدل گیا ہے۔ تین چار سیکنڈ تو وہ آنکھیں پھاڑے ہمیں دیکھتا ہی رہا پھر اچانک بیدار ہو گیا اور اپنی گھبراہٹ کو ایک مسکراہٹ میں چھپانے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ ہمیں اندر بیٹھک میں لے گیا۔ وہ اتنا سا بیدار ہو چکا تھا یا اتنا نارمل ہو گیا تھا کہ اُس نے ہم سے پوچھا کہ ہم چائے پئیں گے یا وہ کیا خدمت کرے۔

"آپ تشریف رکھیں" —میں نے کہا— "اتنی زیادہ گھبراہٹ کی بھی ضرورت نہیں۔ ہم اتنی سی خدمت چاہتے ہیں کہ آپ سے جو بات پوچھیں وہ ہمیں صحیح صحیح بتا دیں۔ ہم آپ سے راہنمائی لینے آئے ہیں"۔

میں نے جیب سے لفافہ نکالا اور اس پر لکھا ہُوا ایڈریس اسے دکھا کر پوچھا کہ یہ اُسی کا لکھا ہُوا ہے؟.... اس نے بلا حیل و حجت کہا کہ یہ اُسی کا لکھا ہوا ہے۔ پھر میں نے لفافے میں سے خط نکال کر اس کے ہاتھ میں دیا اور پوچھا کہ یہ خط اُس نے لکھا تھا؟"... اُس نے فوراً تسلیم کر لیا کہ یہ اُسی نے لکھا تھا۔

"کیا آپ کو اس خط کا جواب ملا تھا؟" —انسپکٹر کلاک نے پوچھا۔

"نہیں!" —لیاقت علی نے جواب دیا— "اُس نے کوئی جواب نہیں دیا"۔

"اور نہ ہی آپ کو جواب ملے گا" —میں نے کہا۔

"وہ جواب تو ضرور دے گا" —اُس نے کہا— "ہماری دوستی کوئی کچی دوستی نہیں"۔

"دوستی تو کچی نہیں" —میں نے کہا— "لیکن آپ کا دوست دنیا سے اُٹھ گیا ہے"۔

"بلکہ دنیا سے اُٹھا دیا گیا ہے"— انسپکٹر کلاک نے کہا— "وہ قتل ہو گیا ہے"۔

"کیا فرمایا آپ نے؟"— لیاقت نے آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے کچھ دیر ہمیں دیکھا اور پوچھا— "اس کے قتل کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ مجھے یقین نہیں آرہا کہ آپ کی یہ اطلاع صحیح ہے"۔

اُس کی اس حیرت زدگی اور ردِّ عمل کو دیکھ کر کم از کم مجھے یقین ہونے لگا کہ مقتول کے قتل کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لیاقت علی نے بتایا کہ مقتول انبالہ کا ہی رہنے والا تھا اور اس کا گھر یہاں قریب ہی ہے۔ اس نے میرے پوچھنے پر یہ بھی بتایا کہ مقتول کی ماں زندہ ہے' ایک بڑا بھائی ہے' بھائی کی بیوی ہے' بچّے بھی ہیں اور مقتول کی دو بڑی بہنیں بھی ہیں جن کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے اپنے سسرال میں ہیں۔

یہ سب باتیں سن کر میں نے سوچا کہ مقتول پُراسرار سا آدمی تھا۔ اس نے دِلّی میں یہ کیوں بتایا تھا کہ وہ دنیا میں اکیلا ہے اور اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں؟ اس سوال کا جواب لیاقت علی دے سکتا تھا۔

"کیا اس کی یہاں کسی کے ساتھ دشمنی تھی؟"— انسپکٹر کلاک نے پوچھا۔

"بالکل نہیں صاحب!"— لیاقت علی نے بتایا— "وہ کسی کے ساتھ دشمنی رکھنے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ پکّا مذہب پرست اور صوم و صلوٰۃ کا سختی سے پابند تھا"۔

"کیا بھائی کے ساتھ اس کا جائداد پر کوئی تنازعہ چل رہا تھا؟"— میں نے پوچھا۔

"بالکل نہیں صاحب!"— لیاقت علی نے جواب دیا— "وہ لڑائی جھگڑے اور تنازعات کھڑے کرنے والا آدمی تھا ہی نہیں"۔

میرے کہنے پر لیاقت علی نے مقتول کے متعلق ساری تفصیلات بتائیں جو اس طرح تھیں۔ یہ میں بتا چکا ہوں کہ مقتول کا ایک بڑا بھائی اور دو بڑی بہنیں تھیں۔ بھائی سب سے بڑا تھا۔ باپ کے ساتھ مقتول کو بہت پیار تھا اور باپ بھی اسے اپنی اولاد میں سے سب سے زیادہ چاہتا تھا۔

مقتول زندہ دل لڑکا تھا۔ ہنسی مذاق کرتا اور ہر قسم کا مذاق خندہ پیشانی سے برداشت کرتا بلکہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ ورزش کا شوقین چھوٹی عمر میں ہی ہو گیا تھا۔ باڈی

بلڈنگ تو اس کی ہابی بن گئی تھی اور وہ کہا کرتا تھا کہ یہ جہاد کے لئے ضروری ہے۔ اس خاندان میں مذہب پرستی زیادہ تھی جس کے زیرِ اثر مقتول بھی اسلام کا شیدائی بن گیا تھا لیکن اس کا اسلام مسجد تک ہی محدود نہیں تھا۔ وہ مجاہد بننا چاہتا تھا۔ تنگ نظر اور محدود سی ذہنیت کے لڑکوں کو تو وہ ذرا سا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

مقتول میٹرک میں پہنچا تو اس کا باپ مختصر سی علالت کے بعد فوت ہو گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے مقتول بھی باپ کے ساتھ ہی فوت ہو گیا ہو۔ وہ سکول میں بھی روتا اور گھر میں کی عمر بڑھتی جا رہی تھی اس کی زندہ دلی واپس آ رہی تھی لیکن اب یوں ہوتا تھا کہ اس کی زندہ دلی پر سنجیدگی غالب آ جاتی تھی۔ اس کی عمر بائیس تئیس سال ہوئی تو جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی روزگار کے دروازے کھل گئے۔ ٹھیکیداریاں اور سپلائی کا کام بہت ہی بڑھ گیا۔ ایک مسلمان ٹھیکیدار کا کام ایسا چلا اور پھیلا کہ اس نے چند آدمیوں کو ملازم رکھ لیا اور کسی کے کہنے پر اس نے مقتول کو بھی اپنے ہاں ملازمت دے دی۔ مقتول عقل اور جسم کا تیز تھا اس لئے اس نے بڑی اچھی پوزیشن بنا لی اور ٹھیکیدار کا منظورِ نظر ہو گیا۔ فطرت کے لحاظ سے وہ دیانتدار تھا۔ اس کا کام صرف دفتر میں ہی نہیں تھا بلکہ ٹھیکیدار نے اسے اپنے کاروبار کی فیلڈ میں لگا لیا۔ مقتول افسروں تک سے ملتا اور پھنسے ہوئے بلوں کی وصولی کرا لیا کرتا تھا۔ کہیں رشوت دینی پڑتی تو وہ خود ہی سودا کر کے دے دلا کر کام نکال لیتا تھا۔

ہندوستان کی آزادی کی باتیں تو ہوتی ہی رہتی تھیں اور ہندو اور مسلمان لیڈر اخباری بیان جاری کرتے اور تقریریں بھی کرتے رہتے تھے لیکن ایک اور نعرہ جو پہلے بھی لگتا تھا' جنگ کے دوران اور تیز ہو گیا۔ یہ تھا انقلاب زندہ باد۔ یہ ایک انقلابی گروہ تھا جو ہندوستان میں انقلاب لانا چاہتا تھا۔ اس انقلابی گروہ کے لیڈر زیادہ تر ہندو تھے لیکن کچھ مسلمان بھی ان میں شامل ہو گئے تھے۔ مقتول بھی یکلخت انقلابی ہو گیا اور اس نے ہندوستان کی آزادی کی باتیں شروع کر دیں۔ وہ کانگریس کا باقاعدہ کارکن بن گیا جو خالصتاً ہندوؤں کی پارٹی تھی۔ وہ روز بروز انقلابی اور جوشیلا ہوتا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے صوم و صلوٰۃ کی پابندی بھی جاری رکھی۔ اس نے چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی رکھ لی تھی۔

اس دوران اس کی شادی ہو گئی۔ چند مہینے ٹھیک ٹھاک گزرے' اس کے بعد بیوی کے ساتھ اس کی دلچسپی ختم ہو گئی اور گھر میں ناچاقی شروع ہو گئی۔ لیاقت علی نے بتایا کہ مقتول کی بیوی بڑی اچھی اور شریف لڑکی تھی اور اس کے والدین اور خاندان کے دیگر لوگ بھی بہت اچھے اور نیک لوگ تھے لیکن مقتول کا رویّہ ان کے ساتھ ٹھیک نہیں رہتا تھا۔ مقتول کا دل ایسا اچاٹ ہُوا کہ اس نے ٹھیکیدار کی نوکری چھوڑ دی۔ کچھ عرصہ فارغ رہ کر پھر نوکری شروع کر دی۔ بیوی کی حالت یہ تھی کہ کبھی وہ تنگ آ کر اپنے ماں باپ کے ہاں چلی جاتی اور اس کے ماں باپ اور مقتول کی ماں اسے راضی کر کے پھر لے آتے اور مقتول کو سمجھاتے کہ وہ اپنی بیوی کو سنبھالے لیکن مقتول توجہ نہیں دیتا تھا۔

میں لیاقت علی سے یہ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ مقتول اپنی بیوی سے کیوں اُکتا گیا تھا' لیاقت علی نے خود ہی بتایا کہ ایک ہندو بیوہ کے ساتھ مقتول کی دوستی ہو گئی تھی۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ہندو لڑکی اگر شادی کے پہلے روز ہی بیوہ ہو جائے یا کبھی بھی بیوہ ہو جائے تو وہ اپنے ماں باپ کے ہاں چلی جاتی ہے لیکن اس کی دوسری شادی نہیں ہو سکتی۔ اسے منحوس سمجھا جاتا ہے اور کوئی بھی اس کے ساتھ بات نہیں کرتا' یہاں تک کہ اس کی عزیز سہیلیاں بھی اُس سے دُور ہو جاتی ہیں۔ یہ ہندو لڑکی نوجوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ یہ معمولی سے گھرانے کی لڑکی تھی لیکن بہت ہی خوبصورت۔ وہ پہلے تو اپنے گھر میں ڈھکی چھپی رہی۔ کبھی کبھار ہی باہر نکلتی تھی پھر ایسی باہر نکلی کہ اس نے دوستیاں لگانی شروع کر دیں۔ اس نے دو تین دوست بدلے اور کہیں مقتول کے ساتھ اس کا آمنا سامنا ہو گیا۔ مقتول اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ سب کہتے تھے کہ یہ ناجائز تعلقات بھی روتا رہتا۔ ماں اور بہنوں نے اسے بہلانے کی بہت کوشش کی لیکن باپ کے ساتھ اس کا جو پیار تھا اور جو پیار اسے باپ دیتا تھا' وہ اسے کسی سے نہیں مل سکتا تھا۔ مقتول کی زندہ دلی اور ہنسی مذاق تو بالکل ہی بجھ کر رہ گئے اور وہ چلتی پھرتی لاش بن گیا۔

مقتول نے میٹرک کا امتحان دیا' چونکہ لڑکا ذہین تھا اور تعلیم میں دلچسپی بھی لیتا تھا اس لئے پاس ہو گیا۔ بڑا بھائی اسے آگے پڑھانا چاہتا تھا لیکن مقتول نے صاف جواب دے دیا کہ اس پر مزید پیسہ خرچ نہ کیا جائے۔ بڑے بھائی نے یہ غلطی کی کہ اس کے ساتھ سختی سے پیش آنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مقتول آوارہ ہو گیا لیکن اس کی

آوارگی یہ تھی کہ بھائی کا کہا نہیں مانتا تھا اور زیادہ سے زیادہ وقت گھر سے باہر گذارتا تھا۔ اس نے ایسا نہیں کیا کہ آوارہ اور گھٹیا قسم کے لڑکوں کے ساتھ دوستی لگا لیتا۔ اس کی دوستی لیاقت علی کے ساتھ تھی یا دو تین اور لڑکے تھے جو اچھے اور شائستہ گھرانوں کے تھے۔

اسے اپنی ماں اور بہنوں سے پیار اور توجہ ملتی تھی۔ وہی اسے جیب خرچ دیتی تھیں۔ مقتول نے ورزش جاری رکھی اور پھر شہر کی ہاکی ٹیم میں شامل ہو گیا۔ وہ بڑا خوبصورت جوان نکلا۔ اس کا بھائی آڈٹ کے محکمے میں آڈٹ آفیسر تھا۔ وہ مقتول کو سرکاری ملازمت دلوانا چاہتا تھا جو مقتول قبول نہیں کرتا تھا۔

میں قارئین سے گذارش کرتا ہوں کہ مقتول کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں نہیں سنا رہا بلکہ وہی حصے سنا رہا ہوں جن سے مقتول کی نفسیات کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے باپ کی موت نے اسے دراصل ذہنی مریض بنا دیا تھا لیکن وہ اسے ذہنی مرض نہیں سمجھتا تھا نہ اس کے گھر والے اس کی اس نفسیاتی کیفیت کو سمجھتے تھے....جوں جوں اس والی دوستی ہے لیکن مقتول اسے پاکیزہ محبت کہتا تھا۔ اس لڑکی کی خاطر مقتول نے اپنی بیوی کو ٹھکرا دیا تھا اور اپنے گھر میں چین اور سکون نہیں رہنے دیا تھا۔ مقتول اور اس خوبصورت ہندو بیوہ کی دوستی خاصی مشہور ہو گئی۔ لیاقت علی نے بتایا کہ اس لڑکی نے مقتول کے ساتھ دوستی قائم رکھی اور باقی تمام دوست چھوڑ دیئے اور وہ کسی اور کے ساتھ بات بھی نہیں کرتی تھی۔

اس ہندو لڑکی کا نام رانی تھا۔ ہمیں اس سوال کا جواب مل گیا کہ یہ رانی کون ہے۔

پھر یہ لڑکی اچانک غائب ہو گئی۔ مقتول کو دوستوں نے بڑی ہی بے چینی اور ذہنی اذیّت کی حالت میں دیکھا۔ وہ اس لڑکی کے لئے پاگل ہُوا جا رہا تھا۔ آخر پتہ چلا کہ اس لڑکی کا باپ اسے دِلّی کے آشرم میں چھوڑ آیا ہے۔ مقتول اداس اور زندگی سے مایوس رہنے لگا۔

قارئین کو معلوم ہو گا کہ یہ آشرم کیا چیز ہوتی ہے۔ آشرم مہاتما گاندھی نے کھلوائے تھے اور یہ ہندوستان کے تین چار بڑے بڑے شہروں میں تھے۔ جو ہندو لڑکیاں بیوہ ہو جاتی تھیں ان میں سے اکثر کے والدین انہیں کسی قریبی آشرم میں چھوڑ آتے

تھے۔ آج کل بھی ہندوستان میں یہ آشرم کھلے ہوئے ہیں۔ آشرم کے انچارج اور منتظم ہندوؤں کے پنڈت ہوتے تھے۔ میں آپ کو اپنے وقتوں کی بات سنا رہا ہوں۔ ہندو ذہنیت بڑی ہی گندی ذہنیت ہے۔ آشرم میں نوجوان اور بڑی ہی خوبصورت لڑکیاں بھی جاتی تھیں۔ ایک تو یہ پنڈت خود انہیں خراب کرتے تھے اور پھر یہ سلسلہ چلا کہ آشرم عصمت فروشی کے باقاعدہ اڈے بن گئے۔ ان پنڈتوں نے امیر کبیر تماش بینوں کو لڑکیاں سپلائی کرنی شروع کر دیں۔ گورنمنٹ کے اعلیٰ افسروں کو خوش رکھنے کے لئے بھی ان لڑکیوں کو استعمال کیا جاتا تھا۔ دِلّی کے ایک آشرم کے جرائم کی کہانی "حکایت" میں چھپ چکی ہے۔ اس کی تفتیش انسپکٹر دبیر حسین رضوی مرحوم نے کی تھی اور یہ کہانی انہوں نے ہی لکھی تھی.... رانی کو دِلّی کے آشرم میں بھیج دیا گیا تھا۔

لیاقت علی نے بتایا کہ چار پانچ مہینے پہلے مقتول کی ذہنی حالت ایسی بگڑی کہ ایک روز وہ لیاقت علی کو بتا کر دِلّی چلا گیا اور یہ کہہ گیا کہ وہ کسی دینی مدرسے یا مسجد میں بیٹھ جائے گا اور باقی عمر گوشہ نشینی میں گذارے گا۔ مقتول نے دینی تعلیم اچھی خاصی حاصل کر لی تھی۔ پھر مقتول نے دِلّی سے لیاقت علی کو خط لکھا اور بتایا کہ اس نے ایک مسجد کی امامت کر لی ہے۔ اس خط میں اس نے یہ بھی لکھا کہ اسے رانی مل گئی ہے لیکن وہ آشرم کی قید سے نکل کر اجمیری گیٹ کی قید میں چلی گئی ہے۔

لیاقت علی نے اپنی رائے یہ دی کہ مقتول ذہنی مریض ہو گیا تھا۔ ہم نے لیاقت علی سے کہا کہ وہ ہمیں مقتول کے گھر لے چلے۔ وہ ہمیں ساتھ لے کر چل پڑا۔

خود ہی اپنا دشمن بن گیا

مقتول کے گھر والے گہری نیند سوئے تھے۔ تیسری دستک پر دروازہ کھلا۔ یہ کوئی معمولی سا مکان نہیں تھا بلکہ بڑی اچھی حویلی تھی۔ دروازہ مقتول کے بڑے بھائی نے کھولا تھا۔ وہ شکل و صورت اور انداز سے ہی پتہ چلتا تھا کہ پُروقار اور معزز آدمی ہے۔ اس نے بڑی شائستگی اور ادب سے ہمارا استقبال کیا۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم سی آئی اے کے انسپکٹر ہیں۔ وہ کچھ پریشان ہُوا اور بولا کہ اندر تشریف لے آئیں باہر کھڑے

رہنا مناسب نہیں۔

اندر لے جا کر اُس نے ہمیں بیٹھک میں بٹھایا۔ بیٹھک کا فرنیچر اور آرائش و زیبائش کی دیگر اشیاء دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ اونچی حیثیت کے لوگ ہیں.... مقتول کا بھائی ہمیں سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے آہستہ آہستہ بتانے کی بجائے کیوں نہ فوراً بتا دیا جائے کہ اس کا چھوٹا بھائی دِلّی میں قتل ہو گیا ہے۔ میں نے موزوں الفاظ میں پوری ہمدردی کر کے اسے یہ خبر سنائی تو بیچارہ کچھ دیر تو میرے منہ کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس کے آنسو بہنے لگے۔ میں نے اور انسپکٹر کلاک نے بھی اس کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا اور میں نے افسوس کا اظہار کیا کہ یہ بری خبر مجھے ہی سنانی تھی، اگر میری ڈیوٹی نہ ہوتی تو میں یہاں آتا ہی نہ۔

"قتل کس نے کیا ہے؟" — اُس نے پوچھا — "قتل کی وجہ کیا بتائی گئی ہے؟"

"یہی ہم آپ سے دریافت کرنے آئے ہیں" — میں نے کہا — "وہاں تو اس کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی بلکہ سب اس کی تعریف کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں اور اسے یاد کر کے روتے بھی ہیں۔ وہ ان لوگوں کا امام تھا.... کیا آپ اپنے بھائی کے متعلق کوئی ایسی بات بتا سکتے ہیں جس سے ہمیں یہ سراغ ملے کہ اسے کیوں اور کس نے قتل کیا ہے؟"

اس طرح ہماری بات چلی اور مقتول کے بھائی نے مقتول کی پچھلی باتیں سنانی شروع کر دیں۔

"میرا یہ بھائی کسی کا دشمن نہیں تھا" — مقتول کے بھائی نے کہا — "وہ خود ہی اپنا دشمن بن گیا تھا۔ دراصل صاحب! ہمارے والد صاحب کی وفات نے اس لڑکے کو ذہنی مریض بنا دیا تھا۔ ذرا تضاد ملاحظہ کریں۔ ایک طرف تلاوت قرآن اور صوم و صلوٰۃ کی اتنی پابندی کہ دوسروں کو بھی تلقین کرنا اور دوسری طرف ہندوؤں پر اندھا اعتماد اور ان سے دوستی اور پھر ہندوؤں کی جماعت میں شامل ہو کر انقلابی نعرے لگانا۔ ایک طرف ہندو لیڈروں کو ہندوستان کا نجات دہندہ سمجھنا اور دوسری طرف جہاد کا ایسا جوش کہ قرآن و حدیث کے حوالے دے دے کر مسلمانوں کو جہاد کا سبق دینا۔ گھر میں نیک، سلیقہ شعار اور خوبصورت بیوی موجود ہے لیکن اس نے ایک ہندو بیوہ کے ساتھ دوستی

لگائی اور جب مجھے پتہ چلا تو میں نے اسے بُرا بھلا کہا۔ اس کا اُس نے یہ جواب دیا کہ اس لڑکی کو وہ مسلمان کر رہا ہے اور پھر وہ اس کے ساتھ شادی کرلے گا۔ موجودہ بیوی کو وہ طلاق دینا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اور زیادہ ڈانٹ ڈپٹ کی تو اس نے کہا کہ ایک کافر عورت کو مسلمان کر کے اس کی زندگی سنوار دینے سے زیادہ ثواب ملتا ہے اور یہ ایک بہت بڑی نیکی ہے۔ اپنی بیوی کے متعلق اس نے کہا کہ یہ ابھی نوجوانی کی عمر میں ہے' اس کی تو کسی اور جگہ بھی شادی ہو سکتی ہے.... مجھے خطرہ یہ نظر آ رہا تھا کہ ہندوؤں کو پتہ چل گیا تو وہ اسے قتل کر دیں گے۔ میں نے اپنے دو تین ہندو دوستوں سے کہا تھا کہ وہ اس بیوہ کے باپ کو کہیں کہ وہ اپنی بیٹی کو کسی آشرم میں بھیج دے کیونکہ وہ اس کی بدنامی کا باعث بن رہی ہے۔ میرے ان دوستوں نے اس لڑکی کے باپ کو یہ مشورہ دیا تو باپ نے لڑکی کو آشرم میں بھیج دیا۔ مجھے اطمینان تو ہو گیا لیکن کچھ دنوں بعد میرا یہ بھائی بھی دِلّی چلا گیا اور وہاں سے اس نے لکھا کہ اب وہ ایک مسجد میں امام بن گیا ہے۔ اس نے دینی تعلیم تو بہت حاصل کر لی تھی لیکن اپنے دماغ میں مذہب کو ایک جنون بنا کر بھر لیا تھا۔ میں اس کا مستقبل کچھ اور بنانا چاہتا تھا لیکن میرا یہ بھائی بد قسمت تھا کہ میری حیثیت سے فائدہ نہ اٹھا سکا"۔

یہ تو ہم نے اندازہ کر لیا تھا کہ مقتول ذہنی مریض تھا اور وہ تضاد کے مرض میں مبتلا تھا۔ وہ انتہا پسند بھی تھا۔ میں اگر نفسیات کا ڈاکٹر ہوتا تو اس کا علاج کرتا لیکن قانون کسی کی نفسیات کو نہیں دیکھا کرتا۔ یہاں حادثہ یہ ہُوا کہ اس نفسیاتی مریض نے کسی کو قتل نہیں کیا بلکہ قتل ہو گیا۔ ہمیں دیکھنا یہ تھا کہ اس قتل کا باعث کیا تھا۔

مقتول کے بھائی نے مقتول کی گزری ہوئی زندگی کی تقریباً وہی باتیں سنائیں جو اس کا دوست لیاقت علی سنا چکا تھا۔ بڑے بھائی نے کچھ اور باتیں ایسی سنائیں جو لیاقت علی کی زبان پر نہیں آئی تھیں۔

بڑے بھائی نے سنایا کہ مقتول نے ٹھیکیدار کی نوکری چھوڑ دی تھی اور اس نے انقلاب زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیئے اور ہندوستان کی آزادی کا پرچار کرنے لگا تھا۔ بڑے بھائی نے خاص طور پر دیکھا کہ جب اس نے نوکری چھوڑ دی تو بھی وہ گھر پیسے لاتا تھا بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ لاتا اور اپنی ماں کو دیتا تھا اور اس کے پاس اتنے زیادہ

پیسے ہوتے تھے کہ بھائی کے بیوی بچوں کے اخراجات بھی پورے کر دیتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ مہینے میں دو تین دن اور راتیں گھر سے غائب رہتا تھا۔ تیسری بات یہ کہ اس نے جاپانیوں کا پروپیگنڈہ اس طرح شروع کر دیا تھا جیسے جاپانی ہندوستان کو آزاد کرانے آئے ہوں۔ مقتول کے بھائی نے ایک بات یہ بھی بتائی کہ مقتول کو اس کے دوست لیاقت علی نے گمراہ اور خراب کیا تھا۔ مقتول لیاقت کو اپنا ہمدرد اور مخلص دوست سمجھتا تھا۔

وہ جنگِ عظیم کے عروج کا دَور تھا۔ جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گئی تھی۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ ہندوستان میں جرمنی اور جاپان کے جاسوسوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ کئی ہندوستانی جرمنی اور جاپان کے ایجنٹ بن گئے تھے۔

جاسوسی کے کئی درجے ہوتے ہیں۔ ایک تو سب سے اوپر والا درجہ ہے جس کے جاسوس راز کی خبریں حاصل کرتے اور اُس ملک کو پہنچاتے ہیں جس کے وہ جاسوس ہوتے ہیں۔ پھر کچھ اور درجے ہیں جو بیان کرنے کی ضرورت نہیں' میں ایک درجہ بیان کروں گا۔ یہ ہوتے ہیں ففتھ کالم۔ انہیں تخریب کار بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ جس ملک سے انہیں تنخواہ یا الاؤنس ملتا ہے' اس ملک کا پروپیگنڈہ ایسے کرتے ہیں جیسے وہ فرشتوں کا ملک ہو۔ ان کا دوسرا کام یہ ہوتا ہے' مثلاً جاپانیوں نے برما پر قبضہ کر لیا تھا۔ جاپان کے ہندوستانی ایجنٹوں نے ہندوستان میں جاپانی فوج کی ایسی باتیں پھیلانی شروع کر دی تھیں جیسے جاپانیوں میں مافوق الفطرت طاقت ہو۔ مثلاً جاپان کے ہندوستانی ایجنٹوں نے عام لوگوں پر ہی نہیں بلکہ انگریزوں کی انڈین آرمی پر بھی جاپانی فوج کی دہشت طاری کر دی تھی۔

میرا خیال تھا کہ مقتول اگر جاپانیوں کا ایجنٹ بن گیا تھا تو اس کے ذمے ففتھ کالم کا ہی کام ہو گا۔ اس کی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ بالائی یا فوجی حلقوں سے راز حاصل کر کے جاپانیوں کو دیتا۔ ففتھ کالم دراصل دشمن کا نفسیاتی حملہ ہوتا ہے۔

مقتول کے بھائی نے یہ بات یقینی طور پر نہیں کہی تھی کہ مقتول جاپانیوں کا ایجنٹ بن گیا تھا' اسے شک تھا۔ مقتول کے دوست لیاقت علی کے متعلق مقتول کے بھائی نے یہ نہیں کہا تھا کہ لیاقت علی جاپانیوں کا ایجنٹ تھا' اُس نے کہا تھا کہ لیاقت علی نے مقتول

کو خراب کیا تھا.... میں اوپر ایک خاص بات لکھنا بھول گیا ہوں' وہ میں سناتا ہوں۔ میں نے لیاقت علی سے کہا تھا کہ اس نے اس خط میں مقتول کو کچھ دھمکیاں دی ہیں' وہ یہ بتائے کہ مقتول نے کیا کیا تھا۔ اس کے جواب میں لیاقت علی نے کہا تھا کہ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ وہ اپنی بیوی کو اُس طرح نہ اجاڑے اور ایک ہندو بیوہ کے پیچھے اپنا گھر برباد نہ کرے۔ بیوہ بھی ایسی جس کے دو تین آدمیوں کے ساتھ غلط تعلقات رہ چکے تھے۔ لیاقت علی نے کہا تھا کہ اس نے مقتول کو دھمکی نہیں دی بلکہ یہ لکھا تھا کہ اس نے اپنا گھر اجاڑا تو اُس کا انجام بہت بُرا ہو گا۔ بہرحال لیاقت علی نے ہمیں قائل کر لیا تھا کہ اس نے مقتول کو ایک مخلص دوست کی حیثیت سے یہ باتیں لکھیں اور اسے انجام سے ڈرایا تھا۔ مقتول کے بڑے بھائی نے بھی لیاقت علی جیسی باتیں کیں اور کہا کہ وہ مقتول کو ڈراتا رہتا تھا کہ وہ ایک غیرمذہب کی لڑکی کے پیچھے اپنا گھر برباد نہ کرے ورنہ ایک دن وہ ایسا پچھتائے گا کہ اس کے حصے میں صرف تباہی آئے گی اور وہ زندگی کو خوشحال نہیں دیکھ سکے گا۔

میں نے مقتول کے بڑے بھائی سے مقتول کے سالوں کے متعلق پوچھا کہ وہ کیسے لوگ ہیں۔ یہ شک کیا جا سکتا تھا کہ مقتول کے سالوں نے اس سے انتقام لیا ہو کہ مقتول نے ان کی بہن کو بہت پریشان کیا ہُوا تھا۔ نہ طلاق دیتا تھا نہ اُسے آباد کرتا تھا۔ مقتول کے بھائی نے بتایا کہ ان لوگوں پر تو شک کیا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ وہ مرے مٹے سے اور بڑے ہی بھلے آدمی ہیں۔ اس نے کہا کہ ان بھائیوں پر اسے رحم آتا ہے کہ وہ منت سماجت کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

مقتول کے گھر سے ہم کچھ شک و شُبہ لے کر نکلے لیکن سراغ والی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم جب وہاں سے واپس آ رہے تھے تو انسپکٹر کلاک نے کہا کہ ہو سکتا ہے مقتول کو ہندوؤں نے ہی قتل کیا ہو کیونکہ اس نے ان کی بیوہ لڑکی کے ساتھ دوستی لگائی تھی اور اسے مسلمان کرنے کی کوشش میں تھا۔ میں نے اس کا یہ شک یوں رفع کر دیا کہ ہندوؤں نے اس بات پر اگر اسے قتل کرنا ہوتا تو وہ اپنی لڑکی کو آشرم میں نہ بھیجتے بلکہ مقتول کو قتل کر دیتے۔ اب لڑکی دِتّی کے آشرم میں تھی اور مقتول دِلّی کی ایک مسجد کا امام تھا۔

"لیکن لیاقت علی نے کہا ہے کہ مقتول کو رانی دِتّی میں مل گئی ہے" — انسپکٹر کلاک نے مجھے یاد دلایا — "یہ واردات ہندوؤں نے ہی کی ہے اور اس کا باعث رانی ہے"۔

انسپکٹر کلاک نے یہ بات کہہ کر میرے ذہن میں بھی شک پیدا کر دیا.... میں نے رانی کے گھر کا ایڈریس مقتول کے بڑے بھائی سے لے لیا تھا۔ اگلی صبح ہم وہاں جا پہنچے۔ رانی کا باپ دکاندار تھا۔ وہ گھر سے جا چکا تھا۔ ہم نے اس کے ایک بیٹے کو اس کی دکان پر بھیجا کہ اسے گھر بلا لائے۔ لڑکا دوڑا گیا اور باپ کو ساتھ لے آیا۔ میں نے جب اپنا اور انسپکٹر کلاک کا تعارف کرایا تو یہ ہندو دکاندار تھر تھر کانپنے لگا اور اس نے ہاتھ جوڑ دیئے لیکن کہہ کچھ بھی نہ سکا' اس کے ہونٹ کانپتے رہ گئے۔ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ اس پر کوئی الزام نہیں اور ہم اسے گرفتار کرنے نہیں آئے۔

"کیا آپ کی بیٹی رانی جو بیوہ ہو گئی تھی' دِتّی کے آشرم میں ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"کیا اس کا کوئی سراغ ملا ہے؟" — اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا — "وہ مل گئی ہے؟"

"کیا وہ آشرم میں نہیں ہے؟" — انسپکٹر کلاک نے پوچھا۔

"نہیں صاحب بہادر!" — رانی کے باپ نے جواب دیا — "میں نے اُسے آشرم میں داخل کرا دیا تھا لیکن ایک ہی مہینے بعد مجھے وہاں سے تحریری اطلاع بھیجی گئی کہ رانی آشرم سے بھاگ گئی ہے"۔

"پھر اسے کہیں تلاش نہیں کیا؟" — میں نے پوچھا۔

"کہاں تلاش کرتا جناب!" — ہندو نے جواب دیا — "میں دِتّی آشرم میں گیا تھا۔ ان سے پوچھا تھا کہ وہ کب اور کس طرح بھاگی ہے لیکن وہاں سے کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا" — اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ اس پر رقت طاری ہو گئی تھی اور اس کے آنسو بہنے لگے تھے۔ روتی ہوئی سی آواز میں اس نے کہا — "ہماری قسمت دیکھو جناب! اُس کی شادی کی تو ایک سال ہی گزرا تھا کہ وہ بیوہ ہو گئی۔ میرے گھر رہی تو ہماری بہت بدنامی ہوئی۔ میں نے اسے آشرم میں اس لئے داخل کیا تھا کہ وہاں پنڈت

اسے اپنے دھرم کے سبق دیں گے تو اس کا من راضی ہو جائے گا لیکن وہ وہاں سے غائب ہو گئی۔ میں یہ سمجھ کر چپ ہو گیا کہ وہ مرگئی ہے"۔

میں نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس نے اپنی بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ پولیس کو نہیں دی تھی۔ بات یہ ہے کہ ہندو بڑی خود غرض اور سفّاک قوم ہے۔ یہ ہندو اندر سے خوش ہوا ہو گا کہ اس کی بیٹی لاپتہ ہو گئی ہے اور وہ اس پر بھی خوش ہوا ہو گا کہ بیٹی اس کے گھر میں واپس نہیں آ گئی ورنہ پھر اس کی بدنامی کا باعث بنتی۔ ہندو بنئے پیسے پیسے پر مرتے ہیں۔ انہیں نیک نامی اور بدنامی سے کوئی غرض نہیں ہوتی' پیسہ بچنا چاہئے۔ رانی کے باپ کو رانی کی گمشدگی پر یہ خوشی بھی ہوئی ہو گی کہ بیٹی کی گمشدگی سے اس کے گھر کے اخراجات میں ایک فرد کی بچت ہو رہی ہے۔

"لالہ جی!" — میں نے کہا — "آپ کی بیٹی کی دوستی ایک مسلمان کے ساتھ ہو گئی تھی۔ کیا آپ کو اس دوستی کا پتہ چل گیا تھا؟"

"جی مہاراج جی!" — اس نے جواب دیا — "مجھے پتہ چل گیا تھا' اسی لئے میں نے بیٹی کو آشرم میں داخل کرا دیا تھا"۔

"اس سے پہلے آپ کو ایک اور بات کا بھی پتہ چلا ہو گا" — میں نے کہا — "وہ بات یہ ہے کہ آپ کی بیٹی نے دو تین اور آدمیوں کے ساتھ بھی غلط قسم کا تعلق پیدا کر لیا تھا۔ اُس وقت آپ نے اپنی بیٹی کو آشرم میں داخل کرانے کی کیوں نہیں سوچی؟"

"کیا بتاؤں مہاراج!" — اس نے بڑی ہی پریشانی کے لہجے میں جواب دیا — "مجھ جیسا بدقسمت باپ اور کون ہو سکتا ہے۔ مجھے سب کچھ پتہ چلتا رہا لیکن بیٹی بے لگام ہو گئی تھی۔ وہ میری بات پر تو دھیان ہی نہیں دیتی تھی۔ بھائیوں نے اسے مارا پیٹا تو بھی وہ باز نہیں آئی۔ سچّی بات تو یہی ہے جناب! اس نے ایک مسلمان کے ساتھ ویسی ہی دوستی لگا لی تو مجھے بہت دکھ ہوا کہ اس طرح تو ہمارا دھرم بھی بھرشٹ (ناپاک) ہو گیا ہے۔ میرے کانوں میں یہ بات بھی پڑی کہ میری بیٹی اس مسلمان کے کہنے پر مسلمان ہو رہی ہے۔ پھر میرے پاس دو ہندو آئے اور انہوں نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ بیٹی کو دِلّی آشرم میں داخل کرا دو ورنہ یہ مسلمان ہو جائے گی اور مسلمان کی بیوی بن کر ہم سب کے سامنے پھرتی رہے گی۔ میں نے ان کی بات مان لی اور بیٹی کو دِلّی آشرم میں چھوڑ آیا"۔

"کیا آپ کی بیٹی کا وہ مسلمان دوست یہیں ہے؟" — انسپکٹر کلاک نے پوچھا۔

"میں تو اُسے جانتا ہی نہیں تھا" — رانی کے باپ نے جواب دیا — "اسے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا اور مجھے بالکل علم نہیں کہ وہ یہاں ہے یا کہیں چلا گیا ہے"۔

میں نے اور انسپکٹر کلاک نے اس پر بہت زیادہ جرح کی اور سوال و جواب کا سلسلہ خاصی دیر تک چلایا۔ ہم یہ معلوم کر رہے تھے کہ اسے یہ معلوم ہے یا نہیں کہ مقتول اس کی بیٹی کا دوست تھا۔ اس کی باتوں سے اور ہمارے سوالوں کے جوابوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مقتول کو نہیں جانتا تھا۔

ہم بڑی اچھی طرح چھان بین کر کے وہاں سے واپس آ گئے اور اُسی روز گاڑی میں بیٹھے اور واپس دِلّی پہنچ گئے۔

مرحوم امام کا بیٹا اور مقتول اُس بازار میں

ہم اگلے روز آشرم میں چلے گئے اور یہ بتا کر کہ ہم پولیس کے افسر ہیں' وہاں کے پنڈت انچارج سے ریکارڈ طلب کیا۔ رانی کے باپ نے رانی کے داخلے کی جو تاریخ اور جو مہینہ بتایا تھا' اس کے مطابق رجسٹر دیکھا تو رانی کا نام موجود تھا۔ پنڈت سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ایک ہی مہینے بعد یہ لڑکی آشرم سے غائب ہو گئی تھی۔

اگر ہم اس واردات کی تفتیش کر رہے ہوتے کہ آشرم سے یہ لڑکی لاپتہ ہو گئی ہے تو ہم اس پنڈت سے اور آشرم میں کام کرنے والے دوسرے آدمیوں اور عورتوں سے پوچھ گچھ کرتے اور ہمارا انداز کچھ اور ہوتا لیکن ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ ان کی جو لڑکی گم ہوئی ہے' ہم اسے تلاش کر کے آشرم کے حوالے کر دیں۔ آشرم والوں نے رانی کے باپ کو تحریری اطلاع دے دی تھی کہ ان کی لڑکی لاپتہ ہو گئی ہے اور پھر انہوں نے رجسٹر پر لکھ لیا تھا کہ لڑکی لاپتہ ہے۔

"ایک بات بتائیں پنڈت جی مہاراج!" — میں نے اپنی دلچسپی کی خاطر پوچھا — "ایک لڑکی لاپتہ ہو گئی ہے اور آپ نے پولیس کو اطلاع نہیں دی اور ذرا سی بھی کوشش یا کارروائی نہیں کی کہ لڑکی کا کھُرا کھوج حاصل کیا جائے۔ آپ کا یہ رویّہ ایسا

کیوں ہے؟"

"جناب انسپکٹر جی!" — پنڈت نے جواب دیا — "ہم نے یہاں بڑے مضبوط حفاظتی انتظام کر رکھے ہیں۔ کبھی کبھار کوئی لڑکی بھاگ جاتی ہے۔ ہم ان لڑکیوں کو اور بڑی عمر کی بیوہ عورتوں کو دستکاری سکھاتے ہیں اور اپنے مذہب کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کا دھیان گیان پرماتما کی طرف کر دیتے ہیں اور پھر انہیں کپڑا لتّا اور کھانا دانہ بھی دیتے ہیں پھر بھی کوئی لڑکی بھاگ جائے تو ہم اسے کہاں ڈھونڈتے پھریں؟ ہم کسی بھی عورت کو داخل کرتے وقت اس کے رشتہ داروں کو بتا دیتے ہیں کہ یہ اگر بھاگ گئی تو اس کے ذمہ دار ہم نہیں ہوں گے"۔

ہم صرف یہ تصدیق کرنا چاہتے تھے کہ رانی یہاں سے بھاگ گئی ہے۔ تصدیق ہو گئی.... انسپکٹر کلاک نے مجھے انگریزی میں کہا کہ وہ اندر سے آشرم دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے یہ بات بڑی عجیب تھی کہ کوئی ہندو لڑکی نوجوانی میں ہی بیوہ ہو جائے تو اس کی شادی نہیں کی جاتی اور بعض لڑکیوں کو آشرم میں بھیج دیا جاتا ہے۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ لڑکیاں آشرم میں کس طرح رہتی ہیں۔ پنڈت سے کہا کہ وہ ہمیں اندر لے چلے ہم ان عورتوں کو ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں۔

پنڈت انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا خیال یہی ہو گا کہ ہم تفتیش کے سلسلے میں پورا آشرم دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ہمیں اندر لے گیا اور عورتیں دکھائیں۔

ان میں کچھ عورتیں ادھیڑ عمر تھیں۔ انہوں نے گھونگھٹ نکال لئے یا ان میں سے بعض اپنے کمروں میں چلی گئیں لیکن جو جواں سال تھیں یا جو نوجوان تھیں وہ باہر نکل آئیں اور ہمیں دیکھنے لگیں۔ ان لڑکیوں کا چونکہ میری اس کہانی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اس لئے میں ان کے متعلق کوئی زیادہ بات نہیں کروں گا۔ میں پہلی مرتبہ ان بدنصیب لڑکیوں کو آشرم میں دیکھ رہا تھا۔ ان لڑکیوں کے چہروں پر اداسی تھی اور ان کی آنکھوں میں ایسا تاثر تھا جیسے وہ ہمیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہوں۔ انہوں نے کچھ دن یا کچھ مہینے یا دو تین سال اپنے خاوندوں کے ساتھ گذارے تھے اور ان سب کے خاوند انہیں اس بدنصیبی میں پھینک کر دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ ان میں سے ہر لڑکی ایک مرد کی رفاقت چاہتی تھی لیکن ان سب کو قید میں ڈال دیا گیا تھا اور ان

کی فطرت کے قدرتی مطالبوں پر مہر بلکہ سیاہ کالی مہر لگا دی گئی تھی۔ بعض لڑکیوں کے چہروں کے تاثرات سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ باتیں کرنا چاہتی ہیں۔ ان میں چند ایک لڑکیاں تو بہت ہی خوبصورت تھیں۔

"ان لڑکیوں کو دیکھ کر میں صرف حیرت کا اظہار کر سکتا ہوں" — انسپکٹر کلاک نے کہا — "ان لڑکیوں کو دیکھ کر ہی ہندوؤں کی ذہنیت ننگی ہو جاتی ہے۔ کیا اس سے بہتر نہیں کہ ان لڑکیوں کو زہر دے کر مار ہی دیا جائے؟"

"اس ملک کے بادشاہ تم ہو" — میں نے کہا — "یہاں تمہارا قانون چلتا ہے۔ تمہارے قانون نے سَتی کی رسم کو جرم قرار دے دیا ہے تو اپنی قوم سے کہو کہ ایک قانون ایسا بھی بنا دے کہ بیوہ کے ساتھ یہ سلوک بھی جرم ہے۔ کوئی لڑکی یا عورت جوانی میں بیوہ ہو جائے تو اسے دوسری شادی کی آزادی دی جائے"۔

"بات یہ ہے ملک!" — انسپکٹر کلاک نے کہا — "ہم کسی کے مذہب میں دخل نہیں دینا چاہتے۔ میں جانتا ہوں کہ ہندو بیوہ کے لئے دوسری شادی کی ممانعت کو انہوں نے اپنے مذہب کا حکم بنا رکھا ہے۔ اگر یہ اپنی لڑکیوں پر یہ ظلم کرنے پر ہی راضی ہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ سَتی کو جرم اس لئے قرار دیا گیا تھا کہ یہ لوگ ایک عورت کو زندہ جلا ڈالتے تھے۔ یہ قتل ہے"۔

وہاں سے ہم ہیڈ کوارٹر میں چلے گئے اور قیاس کے گھوڑے دوڑانے لگے۔ میرے ذہن میں مقتول کے آخری الفاظ گونج رہے تھے — "اجمیری گیٹ.... رانی" — میں اور انسپکٹر کلاک ایک ہی نتیجے پر پہنچے تھے۔ وہ یہ کہ رانی آشرم سے بھاگ کر اجمیری گیٹ کے عصمت فروشوں کے پاس پہنچ گئی ہے یا پہنچا دی گئی ہے۔ مقتول کے دوست لیاقت علی کا بیان تھا کہ مقتول رانی سے دِلّی میں ملا تھا۔

یہاں سے ہمارے ذہنوں میں دو شک آئے۔ ایک یہ کہ مقتول کی کہیں رانی کے ساتھ اُس وقت ملاقات ہو گئی جب وہ آشرم میں تھی۔ اُس نے رانی کو وہاں سے بھگایا اور کہیں چھپا کر رکھا۔ ہندوؤں کو پتہ چل گیا اور وہ رانی کو لے گئے اور مقتول کو قتل کر دیا۔ یہ شک ذرا کچّا سا تھا کیونکہ مقتول نے مرتے وقت اجمیری گیٹ کا نام لیا اور ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ رانی کو معلوم ہے۔ پہلے تو ہمیں یہی پتہ نہ تھا کہ رانی کون ہے، اب ہمیں رانی کے متعلق معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔

دوسرا شک یہ کہ رانی اجمیری گیٹ کے کسی عصمت فروش کے پاس ہے اور مقتول کے ساتھ اس کی ملاقات ہوگئی اور مقتول نے اسے وہاں سے بھگانے کی کوشش کی اور ناکام رہا یا شاید کامیاب بھی ہوگیا ہو اور اجمیری گیٹ کے لوگوں نے جن کے پاس رانی تھی، مقتول کو قتل کر دیا۔

انسپکٹر کلاک نے کہا کہ رانی یقیناً اجمیری گیٹ کے اندر موجود ہے، اس کا سراغ لگانا بہت ہی ضروری ہے اور سراغ جلدی مل جائے تو اچھا ہے۔

ہمارے لئے یعنی پولیس کے لئے یہ سراغ لگانا کوئی زیادہ مشکل نہیں تھا۔ عصمت فروشوں کے بازار پر پولیس خاص نظر رکھا کرتی تھی۔ ہمارے اپنے یعنی سی آئی اے کے مخبر تھے اور تھانے کے تھے جس تھانے کے تحت اجمیری گیٹ آتا تھا۔ ہم نے سوچا کہ ہر طرف سے مخبر عصمت فروشوں کے علاقے پر حملہ کر دیں۔ اس مقصد کے لئے میں اور انسپکٹر کلاک سب انسپکٹر رضا کے تھانے میں چلے گئے۔

"ملک صاحب!" — سب انسپکٹر رضا نے پہلی بات یہ بتائی — "پہلے امام کا بیٹا تو پکا بدمعاش نکلا ہے۔ اسے کسی ذریعے سے پتہ چل گیا کہ میں نے اس کی رپورٹ لی ہے۔ چونکہ اس کا میل ملاقات بدمعاشوں کے ساتھ ہے اس لئے اسے پتہ چل گیا کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے اور مخبروں نے اس کی رپورٹ تھانے پہنچائی ہے۔ وہ تو جناب، سیدھا میرے پاس آگیا اور آتے ہی بولا کہ آپ لوگ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں، کیا میں آپ کو قاتل لگتا ہوں؟ .... میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی اور جھوٹی سچی تسلی دی کہ اس کے خلاف کوئی الزام نہیں اور کوئی شک بھی نہیں اور اسے کسی نے جو کچھ بھی بتایا ہے وہ بالکل جھوٹ ہے۔ اس نے یہ الفاظ کہے کہ مجھے اس مسجد کی امامت اس لئے نہیں دی گئی کہ میں بدمعاشوں کا دوست ہوں اور درپردہ برے کام کرتا ہوں لیکن جسے امامت دی گئی ہے اسے میں نے تین بار اجمیری گیٹ کے اندر اس بازار میں دیکھا ہے.... میں سمجھا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے لیکن اس نے کہا کہ وہ گواہ پیش کر دے گا"۔

میں اور انسپکٹر کلاک یہ بات سن کر حیران نہ ہوئے کیونکہ ہمیں پہلے ہی شک تھا کہ رانی عصمت فروشوں کے پاس پہنچ گئی ہے اور مقتول اسے ملا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ

مقتول اگر وہاں گیا تھا تو بدی کی خاطر نہیں گیا بلکہ رانی سے ملنے گیا ہوگا۔

انسپکٹر کلاک نے سب انسپکٹر رضا سے کہا کہ وہ ابھی پہلے امام کے بیٹے کو تھانے بلائے۔

ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد وہ آگیا۔ اُس کی داڑھی کچھ لمبی تھی اور لباس سے بھی وہ مولوی ہی لگتا تھا اور اس کے سر پر کپڑے کی ٹوپی تھی۔ میں نے اسے اپنے پاس بٹھایا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ اسے ذرا سا بھی ڈر نہیں تھا نہ گھبراہٹ تھی کہ اسے تھانے بلایا گیا ہے اور یہ بلاوا قتل کی اس واردات کے متعلق ہی ہو سکتا ہے۔ میں نے اُس میں خاص طور پر خود اعتمادی دیکھی۔ ایسی خود اعتمادی شریف لوگوں میں اس وقت ہوا ہی نہیں کرتی جب کبھی ان کا سامنا پولیس سے ہو جائے۔

"مولانا!" — میں نے اسے کہا — "سنا ہے آپ نے مقتول امام کو تین بار اجمیری گیٹ کے اندر گھومتے پھرتے دیکھا ہے"۔

"ہاں صاحب!" — اُس نے کہا — "میں نے اُسے اُس جگہ دیکھا تھا جہاں صرف طوائف باز اور تماش بین ہی جایا کرتے ہیں"۔

"مولانا! آپ وہاں کیا کرنے گئے تھے؟" — میں نے پوچھا — "آپ کا تو اس علاقے کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہونا چاہئے، آپ وہاں کیا کرنے گئے تھے جہاں صرف تماش بین اور طوائف باز ہی جایا کرتے ہیں؟"

"میں وہاں سے گزر رہا تھا" — اس نے جواب دیا لیکن اب میں نے اس میں کچھ گھبراہٹ دیکھی۔

"کیا آپ تینوں بار وہاں سے گزرے تھے؟" — میں نے پوچھا — "آپ کہاں جایا کرتے ہیں کہ آپ کو مجبوراً اُس علاقے میں سے گزرنا پڑتا ہے اور وہ بھی رات کے وقت؟"

اب اُسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ اُس کے متعلق یہ رپورٹ سو فیصد صحیح ہے کہ یہ عصمت فروشوں کے ہاں جاتا ہے۔

"کیا آپ نے مسجد کمیٹی کو نہیں بتایا؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں بتایا صاحب!" — اُس نے جواب دیا — "میں بتانا چاہتا ہوں لیکن ڈرتا

ہوں کہ کوئی بھی یقین نہیں کرے گا۔ سب کہیں گے چونکہ مجھے اس مسجد کی امامت نہیں ملی اس لئے میں اس امام کو بدنام کر رہا ہوں۔ اب تو وہ بے چارہ قتل ہی ہو گیا ہے اس لئے میں اچھا نہیں سمجھتا کہ اس پر کوئی الزام عائد کروں"۔

میں نے مزید کریدنا شروع کر دیا۔ یہ سارے سوال اور ان کے جواب اور میری جرح لکھنے کی ضرورت نہیں' میں دراصل یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ رانی کہاں ہے۔ میرے ذہن میں یہ بات اٹکی ہوئی تھی کہ مقتول اجمیری گیٹ میں جاتا ہے تو صرف رانی کے لئے ہی جاتا ہے۔ میں نے رانی کا سراغ لگانا تھا۔ میں پہلے امام مرحوم کے اس بیٹے سے یہی پوچھ رہا تھا کہ اس نے مقتول کو عصمت فروشوں کے علاقے میں کس کس جگہ دیکھا ہے۔ اس نے مقتول کو تین دفعہ وہاں دیکھا تھا۔ دو دفعہ اس نے ایک ہی جگہ دیکھا۔ وہ ایک تین منزلہ فلیٹ تھا جس میں عصمت فروش ہی آباد تھے اور اپنا کاروبار چلاتے تھے۔ میں نے یہ فلیٹ اپنے ذہن میں رکھ لیا۔

امام کے بیٹے کو فارغ کر دیا۔ اس پر ہمیں کوئی شک نہیں تھا۔ پہلے شک ہُوا تھا' وہ اس پوچھ گچھ میں ختم ہو گیا۔ اس سے تو ہمیں بڑا ہی کار آمد سراغ مل گیا تھا۔ اسے فارغ کر کے میں نے سب انسپکٹر رضا کو اپنی ضرورت بتائی اور کہا کہ وہ اپنے اُس بازار کے مخبروں کو بلا کر کہے کہ وہ معلوم کریں کہ اس فلیٹ میں رانی نام کی ایک نوجوان لڑکی چند مہینے ہی ہوئے آئی ہے یا لائی گئی ہے۔ میں نے رضا کو یہ بھی بتایا یہ لڑکی انبالہ کی رہنے والی ہے اور دِلّی کے آشرم سے بھاگی ہے یا اسے کسی طرح دھوکے میں یہاں لایا گیا ہے۔

وہاں سے ہم اُس تھانے میں چلے گئے جس کے تحت اجمیری گیٹ کا اندرونی علاقہ آتا تھا۔ اس تھانے کا ایس ایچ او ایک ہندو سب انسپکٹر امرناتھ تھا۔ اسے بھی اپنی یہ ضرورت بتائی جو رضا کو بتائی تھی اور اسے کہا کہ وہ معلوم کر کے بتائے کہ رانی نام کی لڑکی اس فلیٹ میں ہے یا نہیں یا وہ کہاں رہتی ہے۔

وہاں سے ہم اپنے ہیڈ کوارٹر میں چلے گئے اور اپنے خاص مخبر بلوائے۔ وہ بڑے تجربہ کار انفارمر تھے۔ وہ جب آئے تو انہیں بھی رانی کے متعلق تمام معلومات دے کر بھیج دیا۔

مقتول کے دل کی رانی

پولیس کے شعبہ سی آئی اے کو بڑے ہی زیادہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ تھانوں کے ایس ایچ او وغیرہ سی آئی اے کے تفتیشی افسروں کے ساتھ جان لڑا کر تعاون کیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان ہی تھانوں کے کیس سی آئی اے کے پاس جایا کرتے تھے اور متعلقہ ایس ایچ او کی عزت اور بے عزتی سی آئی اے کے ہاتھ میں چلی جاتی تھی۔ وہ تو ہر طرح کوشش کرتے تھے کہ سی آئی اے کے تفتیشی افسروں کو خوش رکھیں۔ اگلے روز ہم اپنے آفس میں گئے تو تھوڑی ہی دیر بعد سب انسپکٹر رضا کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ رانی کا سراغ مل گیا ہے اور ہم جب چاہیں وہاں جانے کے لئے سب انسپکٹر رضا سے گائیڈ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس نے رپورٹ یہ دی کہ رانی آشرم سے خود ہی آئی تھی۔ اسے زبردستی یا دھوکے سے نہیں لایا گیا بلکہ وہ خود آئی اور اب اس دنیا میں یعنی عصمت فروشوں کے بازار میں بہت ہی خوش ہے۔

اجمیری گیٹ کے علاقے کا ہندو ایس ایچ او سب انسپکٹر امرناتھ خود ہی ہمارے پاس آ گیا۔ یہ اُس کی برخورداری کا مظاہرہ تھا۔ اُس نے بھی رانی کا سراغ لگا لیا تھا اور وہی رپورٹ دی جو سب انسپکٹر رضا نے دی تھی۔ چونکہ امرناتھ خود آیا تھا اس لئے اس نے بڑی لمبی رپورٹ دی اور ساتھ ہمیں خوش کرنے کے لئے اس نے یہ بھی کہا کہ یہ تو بڑا ہی مشکل کام تھا جو اس نے کر دکھایا ہے.... اس نے یہ بھی کہا کہ ہم جس وقت بھی چھاپہ مارنا چاہیں وہ اپنا ایک ہیڈ کانسٹیبل گائیڈ کے طور پر ساتھ بھیج دے گا۔

میں نے اُسے یہ کہہ کر بھیج دیا کہ ہم آج دوپہر کھانے کے بعد اس کے تھانے میں آئیں گے اور پھر رانی کے ٹھکانے پر جائیں گے اور وہ اپنا ایک گائیڈ ہمارے لئے تیار رکھے۔

ہم اُسی وقت جا سکتے تھے لیکن اس خیال سے نہ گئے کہ طوائفوں کا کاروبار ساری رات چلتا ہے اور دن کے وقت وہ سوتی ہیں۔ میں نے انسپکٹر کلاک سے مشورہ کیا کہ ابھی تو صبح ہے اور رانی بڑی گہری نیند سوئی ہوئی ہو گی' اسے کچھ دیر آرام کر لینے دیا جائے تاکہ وہ تر و تازہ ذہن کے ساتھ ہمارے ساتھ بات چیت کر سکے۔ میں نے تو یہ

مشورہ بھی دیا تھا کہ رانی اور اس کے ایک دو آدمیوں کو سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں ہی بلا لیں لیکن انسپکٹر کلاک نے ہنس کر کہا کہ چلو وہیں چلتے ہیں' اسی بہانے اُس بازار کی سیر کر لیں گے۔

ہم دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ چل پڑے اور امرناتھ کے تھانے میں پہنچے۔ اُس نے ہمارے لئے ایک ہیڈ کانسٹیبل تیار رکھا ہُوا تھا۔ یہ ہیڈ کانسٹیبل ہمیں ہماری مطلوبہ جگہ لے گیا۔ فلیٹ کی دوسری منزل پر جا کر ہیڈ کانسٹیبل نے ایک دروازے پر دستک دی۔ دروازہ ایک ادھیڑ عمر آدمی نے کھولا۔ وہ ہیڈ کانسٹیبل کو وَردی میں دیکھ کر گھبرا گیا۔ اُس نے ایک انگریز کو دیکھا تو اور زیادہ پریشان ہُوا۔ اگر باوَردی ہیڈ کانسٹیبل ساتھ نہ ہوتا تو یہ آدمی ہمیں اپنا گاہک سمجھ کر پرتپاک استقبال کرتا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اسے بتایا کہ یہ دونوں صاحب خفیہ پولیس کے انسپکٹر ہیں اور رانی کا بیان لینا چاہتے ہیں۔

"رانی؟" — اُس آدمی نے حیرت سے کہا — "یہاں تو کوئی رانی نہیں...!"

ہیڈ کانسٹیبل کو یقین تھا کہ رانی یہاں ہے۔ مخبروں کی رپورٹیں غلط نہیں تھیں۔

ہیڈ کانسٹیبل نے اس آدمی کی اور کوئی بات نہ سنی' اس نے اس شخص کو دھکا دیا اور دروازہ پورا کھول کر ہمیں کہا' چلئے صاحب۔ ہم دونوں اندر چلے گئے۔ یہ خاصا کشادہ کمرہ تھا جس کی زیبائش دیکھنے والی تھی۔ ایک طرف فرش پر گدا بچھا ہُوا تھا اور اس پر بڑی لمبی چوڑی پھولدار چادر بچھی ہوئی تھی۔ اس پر چند ایک گول تکئے پڑے تھے۔ دوسری طرف یعنی آدھے کمرے میں صوفے بھی پڑے ہوئے تھے اور ایک خوشنما اور بیش قیمت قالین بھی بچھا ہُوا تھا۔ اس سے اندازہ ہُوا کہ یہاں پرائیویٹ طوائفیں یا کال گرلز رہائشی ہیں اور یہاں کوٹھے پر بیٹھنے والی طوائفیں نہیں ہوتیں۔

"رانی کو فوراً پیش کرو" — ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

"حضور انور!" — اس آدمی نے ہاتھ جوڑ کر کہا — "ابھی پیش کرتا ہوں لیکن ایک گذارش سن لیں' اسے یہاں زبردستی نہیں لایا گیا تھا' یہ اپنی مرضی سے آئی تھی"۔

"ہم اسے یا تمہیں گرفتار کرنے نہیں آئے" — میں نے کہا — "رانی سے تھوڑا سا بیان لینا ہے.... زیادہ بک بک نہیں کرنی' اسے فوراً لاؤ ایسا نہ ہو کہ اسے

گھسیٹ کر باہر لانا پڑے"۔

وہ ساتھ والے کمرے میں چلا گیا اور تین چار منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ ہے رانی.... انسپکٹر کلاک نے بے ساختگی سے انگریزی میں کہا — "اوہ! یہ تو میری توقع سے زیادہ خوبصورت ہے" — رانی واقعی خوبصورت لڑکی تھی۔ مجھے اس کے نقش و نگار کے علاوہ اس کا قد کاٹھ اور جسمانی ساخت زیادہ اچھی لگی۔ اُس کا حُسن یہ تھا کہ اس وقت وہ اپنے قدرتی روپ میں تھی۔ اُس نے وہ میک اَپ نہیں کیا ہُوا تھا جو طوائفیں رات کے وقت کرتی ہیں اور نہ ہی اُس نے بالوں میں کنگھی کی تھی۔ وہ قدرتی رنگ روپ میں ہمارے سامنے کھڑی تھی۔

"انسپکٹر کلاک!" — میں نے انگریزی میں کہا — "اس لڑکی کو دیکھ کر کیا تم ہندوؤں پر لعنت نہیں بھیجو گے؟ اس لڑکی کو اس بدبخت قوم نے خود عصمت فروش بنایا ہے۔ یہ بے غیرت ہندو یہ صورت قبول کر لیتے ہیں کہ ان کی ایک بیوہ لڑکی عصمت فروشوں کے پاس پہنچ جائے مگر اسے شادی کی اجازت نہیں دیتے۔ اسے منحوس سمجھ کر دھتکار دیتے ہیں۔ یہ لڑکی معمولی سے گھرانے کی ہے لیکن کوئی بھی اپر کلاس کا امیر کبیر آدمی اس کے ساتھ شادی کرنے میں خوشی محسوس کرے گا۔ ذرا دیکھو یہ اس عمر میں کس جہنّم میں آ پڑی ہے"۔

انسپکٹر کلاک رانی کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ رانی!" — میں نے کہا — "گھبراؤ مت' ہم پولیس کے افسر ہیں لیکن تمہیں گرفتار کرنے نہیں آئے' تم سے کچھ پوچھنا ہے"۔

وہ ڈرتے جھجکتے ہمارے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے آدمی سے کہا کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔ ہیڈ کانسٹیبل کو بھی میں نے کمرے سے باہر بھیج دیا۔

"آپ مجھ سے شاید یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ میں یہاں تک کس طرح پہنچی ہوں" — رانی نے پُراعتماد لہجے میں کہا — "یہ میں آپ کو پہلے ہی بتا دیتی ہوں کہ میں اپنی مرضی سے آئی ہوں اور اس جگہ کے سوا میرا کوئی اور ٹھکانہ نہیں تھا"۔

مجھے تو یہ توقع تھی کہ یہ لڑکی گھبراہٹ کی حالت میں بات کرے گی اور ہم کچھ پوچھیں گے تو جھینپ اور جھجک کر جواب دے گی لیکن اُس نے جب بات کی تو مجھے

اندازہ ہُوا کہ اس لڑکی کو اپنے آپ پر پورا اعتماد ہے اور عقل بھی رکھتی ہے اور بولنے کی جرأت بھی۔

"نہیں رانی!" — میں نے کہا — "ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم یہاں تک کس طرح پہنچی ہو یا تمہیں کوئی اغوا کر کے لایا ہے یا تم خود آئی ہو۔ ہمارے پاس تمہاری گمشدگی کی کوئی رپورٹ نہیں نہ تمہارے باپ کو اس کا کوئی افسوس ہے کہ تم لاپتہ ہو اور نہ ہی آشرم والوں کو کوئی دلچسپی ہے کہ تم کہاں چلی گئی ہو۔ آشرم والوں نے تمہارے باپ کو کبھی کی اطلاع بھجوادی تھی کہ تم آشرم سے لاپتہ ہوگئی ہو.... ہم کسی اور سلسلے میں آئے ہیں اور تم سے توقع رکھتے ہیں کہ تم جھوٹ نہیں بولو گی"۔

"جھوٹ کیوں بولوں گی؟" — اُس نے جرأت مندانہ لہجے میں کہا — "مجھے میرے اپنے باپ نے اور ہماری قوم کے رسم و رواج نے اور آشرم کے پنڈتوں نے یہاں آجانے پر مجبور کیا ہے۔ آپ پوچھیں، کیا پوچھنا ہے؟"

میں نے مقتول کا نام لے کر اس سے پوچھا کہ وہ یہاں آتا رہتا ہے؟ رانی نے جواب دیا کہ وہ پانچ چھ مرتبہ یہاں آچکا ہے۔

"لیکن میں آپ کی ایک غلط فہمی دُور کر دیتی ہوں" — رانی نے کہا — "وہ یہاں گاہک یا تماش بین بن کر نہیں آتا، وہ مجھے ملنے آیا کرتا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ وہ آتا رہے.... آپ اس کے متعلق کیوں پوچھ رہے ہیں؟ اس دنیا میں وہ ایک ہی انسان ہے جو میرے دل کو اچھا لگتا ہے"۔

"اب وہ تمہارے پاس کبھی نہیں آئے گا رانی!" — میں نے کہا — "وہ قتل ہو گیا ہے"۔

رانی صوفے کے ساتھ پیٹھ لگائے بیٹھی تھی۔ میری بات سن کر وہ بِدکی اور آگے کو ہوگئی۔ اس کی آنکھیں اور زیادہ کھُل گئیں، منہ بھی کھل گیا لیکن وہ کچھ دیر بول ہی نہ سکی۔ وہ ایسی خبر سننے کے لئے تیار نہ تھی۔

"کیا آپ جاوید کی بات کر رہے ہیں؟" — رانی نے پوچھا اور کہا — "وہ جاوید جو انبالہ سے یہاں آیا ہے اور ایک مسجد میں امام ہے؟"

مقتول کا نام جاوید تھا۔ میں نے رانی کو بتایا کہ میں اُسی جاوید کی بات کر رہا ہوں۔ اب جو وہ رُوئی ہے، میں اور انسپکٹر کلاک پریشان ہوگئے۔ پہلے تو ہم اسے سسکتے اور پھر

ہچکیاں لیتے دیکھتے رہے۔ آخر اسے بہلانے لگے اور بہت دیر بعد اس نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ اس سے ہم نے اندازہ کیا کہ رانی کو مقتول کے ساتھ کتنی شدید اور دلی محبت تھی۔ رانی تو اب دولتمندوں کی چیز تھی۔ ان کے مقابلے میں مقتول کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا تھا لیکن رانی نے اسے اپنے دل میں بسا رکھا تھا.... میں نے پہلے اپنی کسی کہانی میں لکھا تھا کہ پولیس کے تفتیشی افسروں کو اپنے من مارنے پڑتے ہیں اور اپنے جذبات کو دبا کر رکھنا پڑتا ہے۔ بڑے بڑے دردناک اور وحشت ناک کیس دیکھے ہیں اور اپنے جذبات کو قابو میں رکھا تھا لیکن کچھ کیس ایسے ہوتے ہیں جو پتھروں کو بھی رُلا دیتے ہیں۔ جاوید کا قتل اور رانی کی اس کے ساتھ محبت ایسا ہی ایک کیس تھا۔ میرے ذہن پر اور میرے مزاج پر اس کا بہت ہی بُرا اثر ہُوا۔ ایک آدمی ہمارے سامنے وہسکی اور سوڈا اور کھانے پینے کی کئی اشیاء رکھ گیا تھا۔ میں وہسکی پینے والا آدمی نہیں تھا، انسپکٹر کلاک نے تھوڑی سی وہسکی اپنے لئے ڈال لی اور میں نے دو تین تکے یہ پوچھ کر کھا لئے کہ یہ حلال گوشت کے ہیں۔ اُس روز موڈ بہت ہی بگڑا لیکن ڈیوٹی ایسی تھی کہ اپنے آپ کو نارمل حالت میں رکھنا پڑا۔ رانی کا ردِّ عمل مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

"اُسے کس نے قتل کیا ہے؟" — رانی نے سسکتے ہوئے پوچھا — "قتل کیا ہی کیوں ہے؟ وہ تو بڑا ہی پیارا آدمی تھا"۔

"ہم اُس کے قاتل کی تلاش میں آئے ہیں" — میں نے کہا — "یہ بتاؤ کہ وہ جب تمہارے پاس یہاں آیا کرتا تھا تو کیا تمہارے یہ آدمی یا مالک اعتراض کرتے تھے؟"

"بالکل نہیں!" — رانی نے جواب دیا — "میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ اسے گاہک نہ سمجھیں اور اس کے ساتھ میرا ایسا ویسا تعلق نہیں۔ اس کے ساتھ میری محبت ہے اور جب تک یہ آتا رہے گا، میں ہنسی خوشی اس کاروبار میں لگی رہوں گی.... وہ دن کے وقت آیا کرتا تھا اور میرے آدمی یہاں موجود رہتے تھے۔ یہ شک دل سے نکال دیں کہ اس کے یہاں آنے پر کسی کو اعتراض تھا"۔

"جاوید نے مرتے وقت تمہارا نام لیا تھا" — میں نے کہا — "اُس نے کہا تھا رانی کو معلوم ہے۔ اس کے بعد وہ کچھ نہ کہہ سکا اور فوت ہوگیا"۔

یہ بات سن کر رانی نے پھر پہلے کی طرح بے قابو ہو کر رونا شروع کر دیا۔ میں نے

اسے بہلا لیا اور کہا کہ وہ اپنے آپ پر قابو رکھ کر ہمارے ساتھ تعاون کرے تاکہ ہم قاتل تک پہنچ جائیں۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ ہم انبالہ تک ہو آئے ہیں اور وہاں مقتول کے دوست لیاقت علی سے بھی ملے ہیں' مقتول کے گھر بھی گئے تھے اور رانی کو یہ بھی بتایا کہ اس کے باپ کے ساتھ بھی ملاقات کر آئے ہیں اور اس کے باپ نے ہی ہمیں بتایا تھا کہ رانی کو آشرم میں داخل کرا دیا گیا ہے۔ میں نے رانی کو یہ بھی بتایا کہ اس کے باپ نے ہی ہمیں بتا دیا تھا کہ رانی آشرم سے غائب ہو گئی ہے۔

اس کے بعد رانی کے ساتھ بہت باتیں ہوئیں اور اس نے بھی بہت باتیں کیں اور اس طرح ہماری بات چیت ایک صحیح راستے پر آ گئی۔ یہ ساری کی ساری باتیں لکھنا کوئی ضروری نہیں' میں یہاں کہانی مکمل کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لئے انتہائی ضروری باتیں پیش کر رہا ہوں۔ رانی نے کچھ نئے انکشافات کئے جن سے ہمارا مسئلہ حل ہو گیا۔ اس نے سب سے پہلے اپنے متعلق بیان دیا اور کہا کہ وہ اپنے متعلق اس لئے سب کچھ بتانا چاہتی ہے کہ ہمیں یہ شک نہ رہے کہ اس کے ساتھ کسی نے زبردستی کی ہے اور عصمت فروشوں کے جال میں پھینک دیا گیا ہے۔ وہ تو میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ وہ شادی کے پہلے ایک سال بعد ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ اسے ماں باپ نے گھر میں قید کر لیا اور سہیلیوں نے بھی اس کے ساتھ بول چال اور میل ملاقات بند کر دی۔ دو اڑھائی سال تو اس نے صبر کئے رکھا لیکن ایک روز وہ یکلخت باغی ہو گئی اور اس نے ایک دوست بنا لیا۔ میں یہ بھی سنا چکا ہوں کہ اس نے کتنے دوست بنائے اور پھر مقتول جاوید کے ساتھ اس کی ملاقات ہو گئی۔

رانی نے مقتول کے مردانہ حُسن اور ورزشی جسم سے متاثر ہو کر اس کے ساتھ دوستی لگائی تھی لیکن مقتول نے پہلے روز ہی اسے یہ الفاظ کہے کہ ہر انسان حیوان اور جانور نہیں ہوتا اور ہونا بھی نہیں چاہئے۔ مقتول نے اسے یہ بھی کہا کہ انسان کی اصل ضرورت روحانی پیار اور محبت ہے۔ اس نے رانی کو یہ بھی سمجھایا کہ اس کے دوستوں کی دلچسپی اس کے جسم کے ساتھ ہے اور وہ اسے ہر جگہ بدنام کرتے پھر رہے ہیں.... مختصر بات یہ ہوئی کہ مقتول نے رانی کو سچے پیار سے روشناس کرایا۔ تب رانی نے اُسے بتایا کہ ہندوؤں میں تو یہ ایک قسم کا رواج ہے اور شاید وہ اسے مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں کہ عورت کو جانور یا غلام سمجھنا ہے اور اسے ذرا سی بھی اہمیت نہیں دینی۔

رانی کو جب مقتول نے روحانی محبت دی تو اسے پتہ چلا کہ وہ کیا تشنگی محسوس کر رہی تھی جس کی تسکین یکے بعد دیگرے اس کے تین دوست بھی نہیں کر سکے۔ رانی کے دل میں مقتول کا ایسا پیار پیدا ہُوا کہ وہ اس کے بغیر تڑپنے لگتی تھی۔ اس نے دوستیاں ترک کر دیں اور روحانی طور پر مقتول کی ہو کر رہ گئی۔

رانی نے بتایا کہ مقتول نے کہا تھا کہ وہ اسے مسلمان کر کے اس کے ساتھ شادی کرے گا۔ مقتول نے اس کے ساتھ ایسا دھوکا نہیں کیا تھا کہ اس کی ابھی شادی ہی نہیں ہوئی بلکہ اسے بتا دیا تھا کہ اس کی بیوی ہے جو اسے پسند نہیں اور وہ اسے طلاق دے دے گا۔ رانی نے مقتول کی یہ تجویز دل و جان سے قبول کر لی تھی اور اس کے ساتھ کہیں بھاگ جانے کو بھی تیار تھی لیکن مقتول کا کوئی باہر کا ٹھکانہ نہیں تھا جہاں وہ رانی کو لے کر چلا جاتا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ وہ انبالہ میں ہی رہے گا اور رانی کو مسلمان کر کے شادی کرے گا لیکن رانی نے اسے کہا تھا کہ اس نے ایسا کیا تو ہندو اسے قتل کر دیں گے اور ہندو مسلم فساد ہو جائے گا۔

مقتول اور رانی کی ملاقاتیں پہلے سے زیادہ ہونے لگیں اور ہندوؤں کو پتہ چل گیا۔ باپ نے رانی کو روکنا شروع کر دیا لیکن رانی باغی ہو چکی تھی۔ بھائیوں نے رانی کو مارا پیٹا بھی لیکن رانی باز نہ آئی۔ وہ یہاں تک دلیر ہو گئی تھی کہ مقتول نے اسے اگر کہا کہ آج رات فلاں وقت فلاں جگہ آ جانا تو رانی گھر والوں کو سوتا چھوڑ کر گھر سے نکل آئی اور مقتول کے پاس پہنچ گئی اور وہاں سے اُس وقت واپس آئی جب مقتول نے اسے کہا کہ جاؤ رانی اب چلی جاؤ۔ رانی بار بار مجھے کہتی تھی کہ وہ حیران ہے کہ آدھی رات کے وقت تنہائی میں بیٹھے ہوئے اور دونوں کے جسم ایک دوسرے کے ساتھ لگے ہوئے ہوتے لیکن مقتول نے کبھی کوئی بیہودہ حرکت نہیں کی تھی۔

جاسوسوں کا گروہ اور رانی

ایک روز رانی کے دونوں بڑے بھائیوں نے دِلّی سیر سپاٹے کے لئے جانے کا پروگرام بنایا۔ رانی کے باپ نے اپنے ان بیٹوں سے کہا کہ رانی کو بھی ساتھ لے جاؤ' یہ

بیچاری بہت پریشان ہے اور گھر میں قید رہتی ہے' اسے بھی سیر سپاٹا کرا لاؤ۔ رانی بہت حیران ہوئی اور خوش بھی کہ باپ نے ایک بات تو ایسی کی جو اس کے دل کو اچھی لگی تھی۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ اس کے ساتھ کتنا بڑا دھوکہ کیا جا رہا ہے۔ بھائی ہنسی خوشی رانی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ دلّی جا کر وہ آشرم میں گئے اور رانی کو آشرم کے اندر بھیج کر بھائی وہاں سے چلے آئے۔ ایک دو دنوں بعد رانی کے کپڑے اور بستر وغیرہ بھی انبالہ سے لا کر دلّی آشرم میں دے دیا۔ تب رانی کو پتہ چلا کہ باپ اور بھائیوں کے دلوں میں اس کا پیار کیوں جاگا تھا۔

یہ ہیں ہندو جو اپنی سگی بیٹی کو بھی دھوکہ دینے سے باز نہیں آتے۔ رانی کو مقتول جیسا مسلمان نوجوان کیوں اچھا نہ لگتا.... رانی نے یہ بھی بیان کیا کہ وہ آشرم میں کس طرح روئی اور تڑپی اور وہاں کی عورتوں اور اس کی ہم عمر لڑکیوں نے کس طرح اسے بہلایا۔ آشرم میں تین چار پرانی عمر کی عورتیں ملازم تھیں اور وہ ان بیوہ عورتوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ ان عورتوں نے بھی رانی کو بہلا پھسلا لیا لیکن رانی نے بتایا کہ ان عورتوں کی نیّت ٹھیک معلوم نہیں ہوتی تھی۔ مثلاً ایک ملازم عورت نے اُسے کہا کہ تمہیں مستقل خاوند تو نہیں مل سکتا لیکن یہاں تم خاوندوں کی کمی محسوس نہیں کرو گی۔ ایک سے ایک اچھا خاوند ملے گا اور عیش کرو گی۔

رانی کا سب سے پہلا عارضی خاوند اس آشرم کا انچارج تھا جو پنڈت تھا یعنی ہندوؤں کا مذہبی پیشوا۔ یہ تھا وہ پنڈت جو دعویٰ کرتا تھا کہ آشرم میں بیوہ عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کو مذہب کے رنگ میں اتنا زیادہ رنگ دیا جاتا ہے کہ وہ دنیا سے تعلق توڑ لیتی ہیں اور ان کے من سُکھی ہو جاتے ہیں۔ رانی نے بتایا کہ اس مذہبی پیشوا کی آشرم میں یہ پوزیشن تھی جیسے آشرم کی تمام نوجوان لڑکیاں اور جوان عورتیں اس کی بیویاں ہوں۔ اس کے بعد باقی دو پنڈتوں کی باری آئی۔ یہی پنڈت ان بیوگان کو صبح مندر میں پرارتھنا (عبادت) کرایا کرتے تھے۔ اگر میرا موضوعِ سخن صرف آشرم ہوتا تو میں آپ کو بڑی ہی شرمناک' افسوس ناک اور جذبات میں زلزلے بپا کر دینے والی باتیں سناتا۔ میں ایک واردات کی تفتیشی کہانی سنا رہا ہوں اس لئے اسی پر اپنی توجہ مرکوز رکھوں گا۔ ایک بات کہہ دیتا ہوں کہ بیوہ عورتوں کو صرف آشرموں میں ہی داخل نہیں کیا جاتا بلکہ

دریائے گنگا کے کنارے ہندوؤں کے جو مقدّس مقامات ہیں' بعض والدین اپنی بیٹیوں کو ان مقامات کے مندروں میں چھوڑ آتے ہیں۔ ان میں بنارس خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ وہاں سب سے زیادہ بیوہ عورتیں رکھی جاتی ہیں۔ ان کے لئے الگ ایک بہت کشادہ کمرہ ہے۔ یہ بیچاری' قسمت کی ماری وہاں گھونگھٹ نکالے بیٹھی رہتی ہیں اور پھر لنگر سے کھانا لے کر کھاتی اور سو جاتی ہیں لیکن وہ کم سوتی ہیں' یہ ان کی قسمت ہے جو بڑی گہری نیند سو گئی ہے۔ ان بیوگان کے ساتھ بھی وہاں کے پنڈت یہی سلوک کرتے ہیں جو میں اس آشرم کا بیان کر رہا ہوں۔ پنڈت جوان عورتوں سے عصمت فروشی بھی کراتے ہیں اور پیسے کماتے ہیں۔

رانی نے بتایا کہ چند ہی دنوں بعد اسے ایک کمرے میں بھیجا گیا جس میں پلنگ پڑا ہُوا تھا اور اس پلنگ پر ایک تماش بین گاہک بیٹھا ہُوا تھا۔ رانی کو اس کے حوالے کر دیا گیا۔ اس رات سے رانی کی حیثیت آشرم کی دوسری لڑکیوں کی طرح طوائف جیسی ہو گئی۔ اگلے چند دنوں میں اسے ایسے چار اور گاہکوں کے حوالے کیا گیا لیکن اسے ایک پیسہ بھی نہ دیا گیا۔

آشرم کی وہ ملازم عورت جس نے پہلے روز کہا تھا کہ یہاں ایک سے ایک اچھا خاوند ملے گا لیکن مستقل خاوند نہیں مل سکتا' رانی کی ہمدرد بن گئی تھی۔ اُس نے ایک روز رانی سے کہا کہ تمہیں عصمت فروش بنا دیا گیا ہے لیکن اس کی تمہیں اجرت نہیں ملتی۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں ایسی جگہ پہنچا سکتی ہوں جہاں تم شہزادیوں کی طرح رہو گی اور تمہارے قدموں میں دولت کے ڈھیر لگیں گے۔ مطلب یہ کہ یہ عورت رانی کو وہاں سے بھگا کر اجمیری گیٹ پہنچانا چاہتی تھی اور ظاہر ہے اس کا رابطہ وہاں کے عصمت فروشوں یا بردہ فروشوں کے ساتھ ہو گا اور ان سے اس عورت نے رانی کی قیمت وصول کرنی تھی۔ یہ ملازمہ کوئی بڑی ہی چالاک اور عیّار عورت تھی۔ اس نے رانی کو ایسے سبز باغ دکھائے کہ رانی تیار ہو گئی۔

"میری حالت پر غور کریں صاحب!" —— رانی نے ہمیں آشرم کی باتیں سناتے ہوئے کہا —— "ماں باپ کے گھر میں مجھے اچھوت بنا کر رکھا گیا اور یہ میرے دل سے ہی نکال دیا گیا کہ میں انسان ہوں اور جوان ہوں اور میری فطرت کے کچھ مطالبات ہیں اور میں ایک گھر آباد کر سکتی ہوں۔ میں نے اپنے جذبات کی آگ کو سرد کرنے کا خود ہی

بندوبست کر لیا۔ بیشک میرے بھائی مجھے دھوکے میں آشرم پھینک گئے تھے‘ اگر یہاں پورے خلوص اور نیک نیتی سے مجھے پرماتما کے قدموں میں ڈال دیا جاتا تو میں اپنے آپ کو اور اس دنیا کو بھول جاتی لیکن وہاں میری عصمت فروخت ہونے لگی اور مجھے طوائف بنا دیا گیا۔ میں اتنی بُدھو نہیں تھی کہ اس عورت کی باتوں میں آ جاتی‘ میں نے اس کی باتیں سن کر خود یہ سوچا کہ میری قسمت میں پاپ ہی لکھ دیئے گئے ہیں تو میں ان دیواروں میں قید ہو کر یہ پاپ کیوں کروں‘ کیوں نہ میں باہر نکل کر یہی کام کروں اور کچھ کماؤں اور آزادی سے گھوموں پھروں۔ ایک رات اس عورت نے بڑی استادی سے مجھے آشرم سے نکالا۔ آشرم سے کچھ دُور ایک تانگہ کھڑا تھا۔ مجھے اس میں بٹھایا اور میں پورے اطمینان کے ساتھ یہاں پہنچ گئی۔ افسوس ہوتا ہے اور بہت ہی دُکھ ہوتا ہے کہ میری جگہ ایک گھر میں تھی لیکن اس گھر سے مجھے محروم کیا گیا اور میں کہاں آن پہنچی لیکن میں نے دل کو تسلی دے لی کہ یہی میری قسمت ہے تو اس سے پورا لطف اٹھاؤ۔ میں پورا لطف اٹھا رہی ہوں۔ یہاں صرف وہ گاہک آتے ہیں جن کے پاس دولت ہوتی ہے۔ میں ان کے دلوں پر حکومت کرتی ہوں۔ یہ دو تین آدمی جنہوں نے مجھے خریدا تھا‘ مجھ پر اتنا اعتماد کرتے ہیں کہ میں اکیلی باہر چلی جاتی ہوں تو انہیں پورا یقین ہوتا ہے کہ میں واپس آ جاؤں گی۔ میرے کپڑے دیکھیں‘ میرے زیورات دیکھیں‘ میں ہر طرح مطمئن ہوں“۔

”کیا جاوید نے تمہیں کبھی کہا نہیں کہ اس پیشے سے نکل آؤ اور وہ تمہارے ساتھ شادی کر لے گا؟“ —— میں نے پوچھا۔

”اُس نے کہا تھا“ —— رانی نے جواب دیا —— ”میں نے اسے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اب نہیں۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں اس قدر ناپاک ہو چکی ہوں کہ تمہارے قابل نہیں رہی۔ میں نے اسے کہا تھا کہ میرے پاس آتے رہنا‘ تمہیں دیکھتی ہوں تو زندہ رہنے کی خواہش مضبوط ہو جاتی ہے“۔

اُسے ہچکی سی آئی اور وہ زار و قطار رونے لگی۔ ایک دو منٹ بعد وہ سنبھل گئی۔ میں اسے جاوید کے قتل پر لے آیا۔

”میں آپ کو جاوید کی پرائیویٹ زندگی کا ایک پوشیدہ گوشہ دکھا دیتی ہوں“ —— رانی نے کہا —— ”ہو سکتا ہے آپ کو اس سے قاتل کا سراغ مل جائے۔ جاوید اپنی کوئی

بات مجھ سے چھپاتا نہیں تھا۔ جاوید کا یہ دوست لیاقت علی بڑا ہی گہرا اور کایاں آدمی ہے۔ جاوید نے مجھے بتایا تھا کہ لیاقت علی جاپانیوں کا جاسوس ہے۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ جاسوسی کس طرح کرتا ہے اور اس کا یہ کام کیسا ہے‘ میں نے پوچھا بھی نہیں۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ کون کیا ہے اور کیا کرتا ہے۔ دنیا اور دنیا کے بندوں سے دل ہی اُچاٹ ہو گیا تھا۔ میں نے اُس وقت دلچسپی پیدا کی جب ایک روز جاوید نے مجھے بتایا کہ وہ ٹھیکیدار کی ملازمت چھوڑ کر جاپانیوں کا باقاعدہ جاسوس بن گیا ہے اور لیاقت علی نے اسے اپنے گروہ میں شامل کر لیا ہے۔ میں نے جاوید سے صرف ایک بات کہی کہ ایسا نہ ہو کہ وہ پکڑا جائے۔ اگر پکڑا گیا تو اسے بڑی لمبی قید کی سزا ملے گی اور کہیں ایسا نہ ہو کہ انگریز اسے گولی ہی مار دیں لیکن جاوید نے بتایا کہ اس کا کام ایسا ہے جس میں پکڑے جانے کا خطرہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اسے ٹھیکیدار کی نوکری سے تین چار گنا زیادہ پیسے ملتے ہیں....

”اس کے ساتھ ہی میں دیکھ رہی تھی کہ جاوید کچھ زیادہ ہی مذہبی ہوتا جا رہا تھا۔ میں تو اس کے پیار کو اور اس کی محبت کو دیکھتی تھی اور یہی میری روح کی ضرورت تھی۔ میرے ساتھ جاوید پوری وفا کر رہا تھا۔ وقت گزرتا گیا اور ایک دن جاوید نے مجھے بتایا کہ اس نے جاسوسی کا کام چھوڑ دیا ہے لیکن لیاقت علی اسے چھوڑنے نہیں دے رہا تھا۔ میں نے بھی اسے کہا یہ کام بڑا خطرناک ہے‘ بہتر ہے کہ اس گروہ سے الگ ہو جاؤ۔ وہ الگ ہو گیا تھا لیکن مجھے بتاتا تھا کہ لیاقت علی اسے دھمکیاں دے رہا ہے کہ وہ اس کے گروہ سے نکلا تو اُسے قتل کر دیا جائے گا۔ جاوید ذرا سا بھی ڈرا ہُوا نہیں تھا۔ وہ اب اسلام اور جہاد کی باتیں کرنے لگا تھا۔ پہلے تو وہ کہتا تھا کہ جاپان کی فوجیں برما تک پہنچ گئی ہیں اور اب ہندوستان پر حملہ کر کے انگریزوں کو یہاں سے بھگا دیں گی اور پھر ہندوستان کو آزاد کر دیں گی لیکن بعد میں اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ ہندوستان مسلمانوں کا ملک ہے اور مسلمان اپنے اندر جہاد کا جذبہ پیدا کریں گے تو یہ ملک پھر مسلمانوں کو مل جائے گا....

”حقیقت یہ ہے کہ اس کی یہ بات سن کر مجھے بہت خوشی ہوتی تھی۔ وجہ آپ کو بتا چکی ہوں۔ ہندو ہوتے ہوئے میرے دل میں ہندوؤں کی نفرت بھر گئی تھی اور مسلمانوں کی محبت میری روح میں اتر گئی تھی۔ یہ مقتول کی محبت کا اور خلوص کا اثر

تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ ہر مسلمان کا کردار جاوید جیسا ہی ہوتا ہے۔ میں یہاں کہوں گی کہ میری ساری دلچسپیوں کا مرکز جاوید کی ذات تھی....

"ایک رات جاوید سے ملاقات ہوئی تو وہ کچھ پریشان تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے پاس لیاقت علی کے اور اس کے گروہ کے کچھ راز ہیں اور اس نے ان سب کو یقین دلایا ہے کہ وہ ان کے گروہ سے الگ تو ہو رہا ہے لیکن انہیں ایسا دھوکہ نہیں دے گا کہ ان کے راز کسی کو بتا دے۔ لیاقت علی اس پر بھروسہ نہیں کر رہا تھا۔ وہ جاوید سے کہتا تھا کہ وہ الگ ہُوا تو زندہ نہیں رہے گا"۔

"کیا جاوید نے یہ بتایا تھا کہ وہ راز کیا ہیں؟" — انسپکٹر کلاک نے پوچھا۔

"نہیں صاحب!" — رانی نے جواب دیا — "نہ اُس نے بتایا نہ میں نے پوچھا۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ ایسا خطرہ ہے تو چلو یہاں سے کہیں بھاگ چلتے ہیں اور کسی کو پتہ ہی نہیں چلنے دیں گے کہ ہم کہاں ہیں.... اس ملاقات میں جاوید نے ایک اور بات بتائی۔ بات یہ تھی کہ لیاقت علی نے اسے کہا تھا کہ رانی کو بھی اپنے گروہ میں شامل کر لو تو پھر ہم بہت زیادہ دولت کما سکتے ہیں۔ میں جانتی تھی کہ جاسوسی میں خوبصورت لڑکیوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ لیاقت علی نے مجھے کئی بار دیکھا تھا۔ جاوید نے اسے یہ جواب دیا تھا کہ وہ رانی کو کسی قیمت پر اس لائن پر نہیں چلنے دے گا۔ اُس کے اس جواب سے لیاقت علی اس کے ساتھ بہت بگڑا تھا اور لیاقت علی نے یہ کہا تھا کہ تم رانی کو گروہ میں لانے کی بجائے خود بھی گروہ سے نکل رہے ہو تو اس کا انجام یہی ہو گا کہ تم اس دنیا میں نہیں رہو گے"۔

رانی کی یہ بات سن کر مجھے وہ خط یاد آیا جو لیاقت علی نے انبالہ سے مقتول کو دِلّی لکھا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ تمہارا انجام بہت بُرا ہو گا۔ میں نے انسپکٹر کلاک سے انگریزی میں کہا کہ ہمارا ملزم ہمیں مل گیا ہے۔

"اس کے بعد میں نے جاوید کو پریشان ہی دیکھا" — رانی نے کہا — "اور اس کے بعد قسمت نے ایسا پلٹا کھایا کہ میرے بھائی مجھے آشرم میں پھینک آئے اور کچھ پتہ نہیں کہ پیچھے جاوید کا کیا بنا۔ ایک روز میں باہر نکلی تو اجمیری گیٹ کے باہر میں نے جاوید کو دیکھا۔ تانگہ رکوا کر میں دوڑ کر اس کے پیچھے گئی اور اسے پکڑ لیا۔ میرے ساتھ یہی آدمی تھا جو ساتھ والے کمرے میں بیٹھا ہُوا ہے۔ جاوید کو میں نے تانگے میں بٹھا لیا اور

اس آدمی کو بتایا کہ جاوید کون ہے اور میرے لئے کیا حیثیت رکھتا ہے.... خیر.... ان باتوں کو جانے دیں، ہُوا یہ کہ جاوید مجھے یہاں آکر ملتا رہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایک تو وہ میری گمشدگی سے پریشان ہو گیا تھا اور انبالہ اسے اجاڑ اور بیابان لگنے لگا تھا اور دوسری وجہ یہ ہوئی کہ لیاقت علی کی دھمکیاں بڑھ گئی تھیں اور اس نے جاوید سے کہا تھا کہ ہاں یا نہ میں جواب دو اور پھر اس کا نتیجہ دیکھو۔ چند بار ملنے کے بعد جاوید کئی روز نہ آیا تو میں پریشان ہو گئی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایک مسجد میں امامت کرتا ہے لیکن صحیح جگہ نہیں بتائی تھی۔ آج آپ سے پتہ چلا ہے کہ وہ تو اس دنیا سے ہی منہ موڑ گیا ہے... یہ غور کرنا آپ کا کام ہے کہ کہیں لیاقت علی نے ہی تو جاوید کو قتل نہ کروا دیا ہو!"

مرتے ہو تو مر جاؤ

رانی کے ساتھ ہماری کتنی باتیں ہوئیں اور اُس نے کتنی باتیں کیں، اس کا اندازہ اس سے لگائیں کہ ہم ڈیڑھ پونے دو بجے اس کے ہاں پہنچے تھے اور جب وہاں سے اٹھے تھے تو اس وقت سورج غروب ہونے کو تھا۔ ہم نے اُسی وقت ریلوے سٹیشن جا کر اگلے روز کی ایک ایکسپریس گاڑی کی دو سیکنڈ کلاس کی سیٹیں انبالہ کے لئے بک کروا لیں۔

اگلی شام ہم انبالہ میں تھے۔ ریلوے سٹیشن سے ہم سیدھے لیاقت علی کے گھر پہنچے اور اتفاق سے وہ گھر ہی مل گیا۔ ہمارا استقبال اس نے بڑے تپاک سے کیا اور پوچھا کہ جاوید کے قاتل کا کوئی سراغ ملا ہے یا نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ بڑا پکّا سراغ مل گیا ہے اور اس کے ساتھ ذرا تبادلۂ خیالات کرنا ہے اس لئے وہ ہمارے ساتھ چلے۔ وہ اندر جانا چاہتا تھا لیکن ہم نے اسے اندر نہ جانے دیا اور بازو سے پکڑ کر دوستانہ بے تکلفی کا مظاہرہ کیا اور اسے سڑک پر لا کر تانگے میں بٹھا لیا۔ ہم انبالہ کے سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں جا رہے تھے۔ لیاقت علی کو بہلائے رکھنے کے لئے ہم اس کے ساتھ دوستانہ انداز میں باتیں کرتے گئے۔

سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں جا کر ہم نے اپنی آمد کی اطلاع دی اور یہ بھی بتایا کہ ایک ملزم سے تفتیش کرنی ہے.... شام گہری ہو گئی تھی۔ متعلقہ آفیسر کو اس کے گھر

اطلاع دی گئی۔ اس انگریز ڈی ایس پی نے ضروری حکم جاری کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ہمارے کھانے کا بندوبست بھی کر دیا جو ہمیں آفس میں ہی پہنچا دیا گیا۔ وہاں رات کو ڈیوٹی پر جو سٹاف تھا' اس سے ہمیں پورا پورا تعاون ملا۔ ہمیں ایک کمرہ دکھا دیا گیا جہاں ہم نے تفتیش کرنی تھی۔ ہم اُس کمرے میں جا بیٹھے۔

"لیاقت بھائی!" — میں نے کہا — "تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ بہتر ہے اپنے اوپر سے پردہ اٹھا دو۔ ہمیں گمراہ نہیں کر سکو گے۔ ہم پوری شہادت لے کر آئے ہیں۔ تمہیں ساتھ لے کر جائیں گے۔ اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو اقبالی بیان دے دو"۔

جیسا کہ ہر ملزم کرتا ہے' لیاقت علی نے بھی حیرت سے ہمیں دیکھا اور ایسی ایکٹنگ کی جیسے اسے کچھ بھی معلوم نہیں یا وہ ہماری بات ہی نہ سمجھ سکا ہو۔ میں نے اسے کہا کہ ہم اسے سوچنے کے لئے کوئی وقت نہیں دیں گے۔ وہ بولنے پر آمادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"تم جاوید کے قاتل ہو" — انسپکٹر کلاک نے اپنا منہ اس کے منہ کے قریب کر کے کہا — "تم جاپان کے جاسوس ہو..... بولو ہاں..... بولو نہیں"۔

وہ بہت ہی چالاک آدمی ہو گا لیکن پولیس کے اڈے پہلی بار چڑھا تھا۔ میں جب مختلف تھانوں میں ایس ایچ او رہا تھا تو میرا اصول تھا کہ ملزم سے تشدّد کے بغیر اقبالی بیان لے لوں اور میں لے بھی لیا کرتا تھا' میں تشدّد اور ایذا رسانی کے ہمیشہ خلاف رہا ہوں لیکن سی آئی اے میں اس کے بغیر گذارہ مشکل تھا۔ لیاقت علی الزام سے انکار کرتا رہا۔ ہم ابھی اسے یہ نہیں بتانا چاہتے تھے کہ ہمیں اس کے خلاف شہادت کہاں سے ملی ہے۔ وہ غالباً یہی سوچ رہا تھا کہ ہم لوگ اس کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں اور ہمیں کس نے اس کے گھر کا راستہ دکھایا ہے۔ وہ ابھی تک انکار پر قائم تھا۔

وہ کرسی پر بیٹھا ہُوا تھا۔ انسپکٹر کلاک اٹھ کر اس کی کرسی کے پیچھے جا کھڑا ہُوا اور کرسی کی پیٹھ پکڑ کر زور سے پیچھے اور نیچے کو دبائی تو کرسی کی پیٹھ فرش سے جا لگی۔ مجھے یہ طریقہ معلوم تھا۔ میں فوراً اٹھا اور فرش پر گری ہوئی کرسی تک پہنچا۔ لیاقت کی اب پوزیشن یہ تھی کہ اس کی پیٹھ کرسی کے ساتھ لگی ہوئی اور کرسی کی پیٹھ فرش پر تھی۔ اُس کے پاؤں فرش سے اٹھ گئے تھے۔ میں نے اس کے ٹخنوں سے ٹانگیں پکڑیں اور نیچے کو دبائیں۔ انسپکٹر کلاک کے ہاتھ میں چھڑی تھی جو اُس نے لیاقت کے منہ میں اس

طرح دے دی کہ چھڑی اس کے کندھوں سے متوازی تھی یعنی اس کے ہونٹوں اور دانتوں میں درمیان سے چھڑی دے رکھی تھی اور دونوں سرے دائیں بائیں تھے۔ انسپکٹر کلاک نے چھڑی کے دونوں سروں پر اپنے پاؤں رکھے اور چھڑی کو دبایا۔ چھڑی لیاقت کے ہونٹوں کے کونوں کو دبانے لگی۔ ادھر میں نے اس کے پاؤں نیچے کو دبا رکھے تھے۔ بکرا ذبح ہوتے وقت کیا تڑپتا ہو گا' تڑپنا تو لیاقت کا دیکھنے والا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ محسوس کر رہا ہے کہ اس کے ہونٹ کونوں سے پھٹ رہے ہیں اور میں جس طرح اس کے ٹخنوں پر دباؤ ڈال رہا تھا' اُس کی اذیت الگ تھی۔

ہم نے پورے پانچ منٹ اُسے اس اذیّت میں رکھا۔ یہ پانچ منٹ اس کے لئے پانچ گھنٹے تھے۔ وہ تڑپ رہا تھا لیکن دانتوں میں دبائی ہوئی چھڑی اُسے بولنے نہیں دے رہی تھی۔ آخر چھڑی انسپکٹر کلاک نے نکال لی اور میں نے اُس کے پاؤں چھوڑ دیئے۔ اس کی ٹانگیں اوپر کو ہو گئیں۔ انسپکٹر کلاک نے اس کی ٹانگیں اور پیچھے کیں تو لیاقت قلابازی کھا کر فرش پر جا پڑا پھر انسپکٹر کلاک نے اسے بالوں سے پکڑا اور کھڑا کر لیا۔ میں نے اس کے پیٹ میں گھونسہ مارا۔ انسپکٹر کلاک نے اس کے بال چھوڑ دیئے۔ لیاقت پیٹ پر ہاتھ رکھ کر جُھک گیا۔ اب میں نے اس کے بال مٹھی میں لئے اور جھٹکا دے کر سیدھا کیا اور پھر زور سے دیوار کی طرف جھٹکا دے کر بال چھوڑ دیئے تو وہ دیوار کے ساتھ لگا اور گر پڑا۔

"یہ بسم اللہ ہے بچّے!" — میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا — "جب تک بولو گے نہیں' یہی سلوک ہوتا رہے گا۔ مرتے ہو تو مر جاؤ' تمہاری لاش غائب کر دی جائے گی"۔

آدمی کچھ سخت جان ثابت ہُوا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اقبالی بیان دے دیا تو سزائے موت ملے گی۔ بہرحال رات بھر نہ ہم سوئے نہ اسے سونے دیا۔ ایذا رسانی کے دو چار طریقے آزمائے۔ میرا ضمیر مطمئن تھا کہ ہم محض شک پر اس کا یہ حال نہیں کر رہے تھے' ہمیں یقین تھا کہ جاوید کا قاتل یہ خود ہے اور اس کے ساتھ اس کا کوئی ساتھی تھا یا اس نے اپنے گروہ کے دو آدمیوں سے جاوید کو قتل کروایا ہے۔

دلّی میں ہمارے پاس [illegible] قاتل کی انگلیوں اور ہتھیلیوں کے نشان محفوظ تھے جو سب انسپکٹر [illegible] نے خون آلود چاقو سے لئے تھے۔

صبح طلوع ہوئی تو لیاقت علی کی برداشت جواب دے گئی اور اُس نے اقبالی بیان دے دیا۔ بات رانی کی ہی صحیح نکلی۔ جاوید اس کے گروہ میں شامل ہو گیا تھا لیکن گروہ سے نکل گیا اور اس کے ساتھ بڑے نازک راز بھی نکل گئے۔ راز نہ بھی ہوتے تو جاوید ان کے لئے صرف اس لئے خطرناک ہو سکتا تھا کہ لیاقت علی اور اس کے گروہ یعنی رِنگ کے تین چار آدمیوں سے واقف ہو چکا تھا۔ ان لوگوں نے سوچا کہ جاوید مقتول دِلّی چلا گیا ہے تو کوئی بھروسہ نہیں کس وقت کہیں پردہ فاش کر دے۔ اسے قتل کرنے کے لئے دو آدمی گئے۔ لیاقت علی نے دونوں کے ایڈریس بتا دیئے۔

میں اور انسپکٹر کلاک سی آئی اے سے پولیس کے کچھ آدمی ساتھ لے کر ان دونوں پتوں پر چھاپہ مارنے چلے گئے۔ دونوں کو گھروں میں ہی پکڑ لیا۔ پہلا جو آدمی پکڑا وہ جاوید کی عمر کا ہی تھا۔ اس کے گال پر ہلکی سی ایک لکیر تھی جو مدھم ہو گئی تھی۔ انسپکٹر کلاک نے یہ لکیر دیکھی تو وہ ہنس پڑا۔ یہ لکیر اُس سکول ماسٹر کے بید کی ڈالی ہوئی تھی جو جاوید کے قتل کا عینی شاہد تھا۔ کوئی شک نہ رہا کہ یہ قاتل ہے۔

دوسرے گھر سے جو آدمی پکڑا وہ بھی جواں سال تھا۔ اس کی پیٹھ سے قمیض ہٹائی تو وہاں دو لکیریں تھیں جو مدھم ہو گئی تھیں۔ یہ بھی سکول ماسٹر کے بید کی تھیں۔

ان دونوں کے گھروں کی اور لیاقت علی کے گھر کی بھی تلاشی لی گئی۔ تینوں کے گھروں سے ایک ایک ریوالور بلا لائسنس برآمد ہُوا۔ ان دونوں آدمیوں نے بھی اقبالی بیان دے دیئے۔ ان میں سے ایک کا چاقو مسجد میں رہ گیا تھا جو ہمارے قبضے میں تھا۔ دوسرے نے اپنا آلۂ قتل یعنی چاقو برآمد کرا دیا.... انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے رِنگ لیڈر کے حکم سے جاوید کو قتل کرنے گئے تھے۔ دِلّی کا ایڈریس جس پر جاوید رہتا تھا لیاقت علی نے انہیں دیا تھا۔ انہوں نے فجر کی اذان کا وقت واردات کے لئے موزوں سمجھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس وقت مسجد میں کوئی نمازی نہیں ہوتا اور امام اذان دینے جاتا ہے۔

انہیں ہم دِلّی لے گئے۔

اس کے بعد ہم نے جو کارروائیاں کیں وہ مقدمہ تیار کرنے اور چالان پیش کرنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان تینوں کی انگلیوں کے نشان لئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک کی انگلیوں کے نشان ماہرین کی رپورٹ کے مطابق چاقو سے لئے ہوئے نشانات سے مل گئے تھے۔

ان دونوں کو سزائے موت اور لیاقت علی کو عمر قید دی گئی۔

✿ ✿ ✿